AUGUST
2025

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

پاکستان
جشنِ آزادی
مبارک

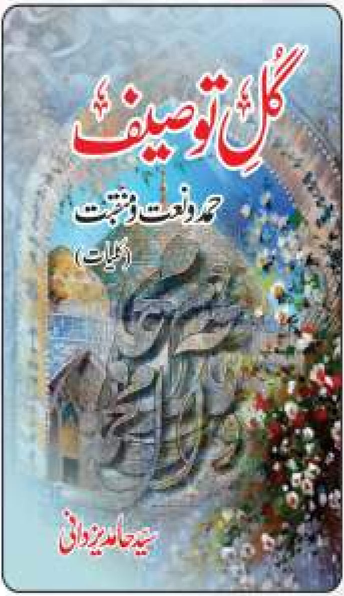
گلِ توصیف
حمد و نعت و منقبت
(کلیات)
سید حامد یزدانی

مشترکہ محبوبہ
(دو دوستوں کی ادبی تحریروں کا مجموعہ)
مشترکہ محبوبہ
خالد سہیل | حامد یزدانی

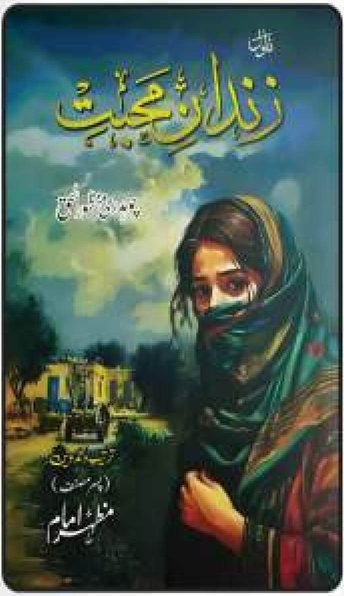
ناول
زندانِ محبت
مظہر امام

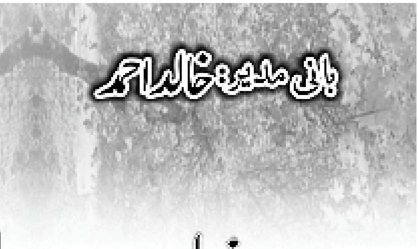

غزل

چاک داماں کیا ہوا؟ وہ حشر ساماں کیا ہوا؟
اے بیاباں! وہ غبارِ کوئے جاناں کیا ہوا؟

کیا الاؤ تھے کہ پلکوں کے کنارے جل بجھے
رات وہ مہماں کنارِ چشمِ حیراں کیا ہوا

چاندنی کے کارواں، ڈالیں پڑاؤ اب کہاں
اے شبِ ہجراں بتا! وہ ماہِ ہجراں کیا ہوا؟

رات بھر کن گیسوؤں کے طاق میں جلتا رہا؟
اے چراغِ گُل بتا! تیرا شبستاں کیا ہوا؟

راستہ کھو دیں نہ صحرائے رضا کے قافلے
اے رخِ آفاقِ جاں! وہ نجمِ حرماں کیا ہوا؟

اجنبی سا لگ رہا ہے یہ چمکتا آسماں
زورِ گریہ کیا ہوا؟ وہ ابرِ گریاں کیا ہوا؟

چاند کیا؟ دیوار و در پلکیں جھپک کر رہ گئے!
رات میرا مہرباں، مجھ سے گریزاں کیا ہوا؟

اک گڑھا سا پڑ رہا تھا خواب سے رخسار پر
نیند نگری کیا ہوئی؟ وہ شہرِ خنداں کیا ہوا؟

چار سُو تھا اک جگمگ ایک جھلمل کا سماں
شہر میں کارِ محبت، کارِ آساں کیا ہوا؟

نام یوسفؑ رکھ دیا، یعقوبؑ کے اندوہ کا
خانہ ویراں، وجہِ اندوہِ غزالاں کیا ہوا؟

بے کسوں کی طرح ہم بھی ہاتھ مل کر رہ گئے
کیا کہیں خالد، پسِ دیوارِ زنداں کیا ہوا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 37083901-9
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5252311 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 33 - اگست 2025 - شمارہ نمبر: 8

مدیر اعلیٰ: عمران منظور

مدیر: نعمان منظور

مجلس ادارت	اعجاز رضوی	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یومِ آزادی مبارک

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی لاہور
A/c Title: Monthly BAYYAZ
اکاؤنٹ نمبر: 02560070000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ www.trackntie.com BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر و پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر نزد فارمیسٹ ... سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْدًا وَأَنْتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سید ریاض حسین زیدی ، سرور حسین نقشبندی، اکرم سحر فارانی ، محمد افضال انجم	7 تا 10
2	نعت	سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز، محمد افضال انجم، نوید عاجز، افتخار الحق	11 تا 15
3	عقیدت	شاہ محمد سبطین شاہجہانی، فیض رسول فیضان، افروز رضوی، محمد طاہر شاہجہانی	16 تا 19
4	سلام	خاور اعجاز، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، محمد انیس انصاری، مرزا آصف رسول، اکرم سحر فارانی، جیا قریشی، راجہ عبدالقیوم	20 تا 27
5	رباعیات	محمد نصیر زندہ، سعید اشعر	28 تا 29
6	ماہیے	خاور اعجاز	30
7	دوہے	سعید اشعر	31
8	مضامین	جلیل عالی، خاور اعجاز، نسیم سحر، نثار ترابی، نبیل احمد نبیل، ریاض ندیم نیازی، عرفان صادق، فیصل زمان چشتی، رانا محمد شاہد	32 تا 83
9	انٹرویو	عائشہ احمد جاوید	84 تا 87

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	خالد احمد، جلیل عالی، انور شعور، اعجاز کنور راجہ، نسیم سحر، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، نثار ترابی، شریف ساجد، افتخار شاہد، مسعود احمد، سعید جمال، اقبال سروبہ، راحت سرحدی، شاہنواز زیدی، رخشندہ نوید، تصدق شعار، قیوم طاہر، عرفان صادق، شگفتہ نعیم ہاشمی، آفتاب خان، اکرم ناصر، اعجاز روشن، نبیل احمد نبیل، تسنیم کوثر، اجمل اعجاز، اصغر علی بلوچ، منظر اعجاز منظر، خالدہ انور، ریاض ندیم نیازی، شبہ طراز، اکرم جاذب، محمد نوید مرزا، ظہور چوہان، محمد اشفاق بیگ، نائلہ راٹھور، میتھیو محسن، صغیر احمد صغیر، اعجاز دانش، عابد معروف مغل، امر مہکی، ندیم ملک، نوید عاجز، عابد رضا، تراب حیدر، حسین امجد، نعمان محمود، مرزا متین الرحمٰن، حسن پرویز سید، عبدالرؤف زین، تصدق فرید	88 تا 138
11	افسانے	فیروز بخت قاضی، کلیم خارجی، وسیم جبران، فصیحہ آصف خان، عائشہ احمد جاوید، آسناتھ کنول، طوبیٰ صدیقی، صفورا پرویز، شیریں زادہ خدوخیل	139 تا 198
12	طنز و مزاح	سیدہ آمنہ ریاض	199 تا 200
13	مائکرو فکشن	فرخندہ شمیم، عمار نعیمی، سید عبداللہ انصر، خالد نذیر، کومل شہزادی	201 تا 208
14	ناولٹ	دردانہ نوشین خان	209 تا 218
15	نظمیں	خالد احمد، جلیل عالی، سید ریاض حسین زیدی، محمد انیس انصاری، شاہنواز زیدی، منظور ثاقب، فیض رسول فیضان، احمد جلیل، رخشندہ نوید، دردانہ نوشین خان، مسعود احمد، سید طاہر شیرازی، امجد بابر، نائلہ راٹھور، نبیل قیصر، شبیر نازش، بشریٰ شیریں، شبیر آکاش، عاصم بخاری، تصدق فرید، اعجاز رضوی	219 تا 241

حمد

ظلمتیں مٹتی گئیں تخلیق کے انوار سے
حرفِ کن کی رونمائی کا عجب نقشہ دیا

وسعتِ افلاک میں دل کو بنایا اک سحاب
رفعتیں اس کو ملیں، چاہا جہاں برسا دیا

میں کہ صدیوں کے سفر میں تھا کہیں ٹھہرا نہ تھا
میرے ایماں کے تحفظ کے لیے کعبہ دیا

کیوں نہ اپنی منزلت پہ ناز ہو انسان کو
احسنِ تقویم کو جو مرتبہ اونچا دیا

تو نے بخشی آگہی امکان کے در کھل گئے
نارسائی کو بھی اک امید کا رستہ دیا

عبد و عبدیت کے سارے مرحلے طے ہو گئے
حرمتِ رشتہ کو تو نے عشق کا جذبہ دیا

دل کا کعبہ صاف رکھنا ہو تو بت مسمار ہوں
نفسِ امارہ سے بچنے کا یہی نسخہ دیا

تجھ سے ملنا ہو تو پہلے خلق کی تالیف ہو
اس لیے انسان کو منشور یہ پہلا دیا

عظمتِ توحید کا محور ہے شانِ مصطفیٰ
امتی ان کا بنایا بخت کو اجلا دیا

جاں درودِ پاک سے ہر دم معطر ہے ریاض
دل جمالِ سیدِ لولاک نے مہکا دیا

سید ریاض حسین زیدی

حمد

سرور حسین نقشبندی

مرے خیال کا سبزہ بھی لہلہانے لگا
جو حمد لکھی مرا ہاتھ جگمگانے لگا

سمجھ گیا کہ یہ تیرے کرم کا مظہر ہے
جب اشک بہنے لگے تو میں مسکرانے لگا

خوشی ملی تو زباں نے ترا ہی ذکر کیا
جو دل اداس ہوا حمد گنگنانے لگا

عطا نوازی کی ایسی بھی لہر دیکھی ہے
سمندروں میں کوئی راستہ بنانے لگا

مجھے بھروسہ اگر ہے تو تیری رحمت پر
کرم سے اپنے مری معصیت ٹھکانے لگا

یہ حمد کہنا سراسر تیری عنایت ہے
مرے سخن کو یہی رنگ راس آنے لگا

ثنا کے باب میں ایسا کرم ہوا سرور
افق پہ میرا تخیل مجھے اڑانے لگا

حمد

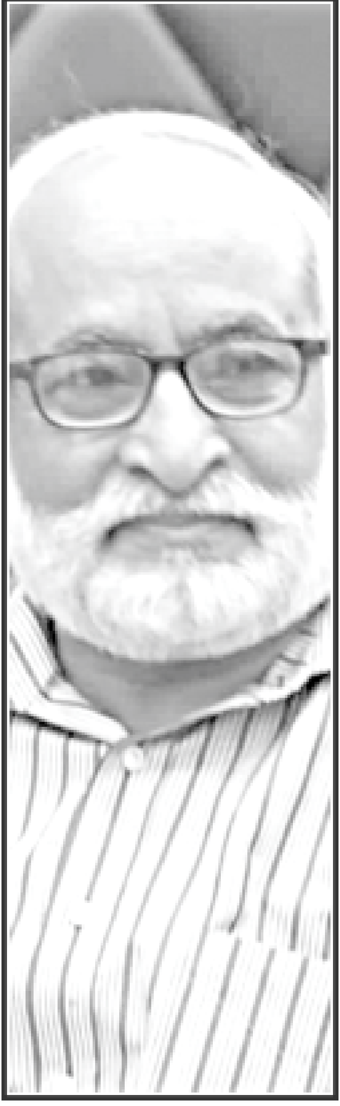

دیارِ کُن کی بقا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
اَذانِ رُشد و ہُدا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

صدائے دستِ دعا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ
متاعِ زُہد و وِلا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

خدا نے اُن کو سکھایا جو بولنے کا ہُنر
تو کنکروں نے کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

شباب اُس نے جو بخشا بہارِ ایماں کو
مہک اُٹھی یہ فضا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

شبِ سیاہ میں پھیلی کرن کرن جس کی
وہ نورِ غارِ حرا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

ہوا چھری کا اِشارہ تو مُنہ کے بل گر کر
جُنوں نے رو کے کہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

بتا گئے ہیں زمانے کو کربلا والے
پیام کرب و بلا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ

اکرم سحر فارانی

حمد

زیست کا اہتمام تجھ سے ہے
سب پہ قائم نظام تجھ سے ہے

میری صبحیں تمام ہیں تجھ سے
میری ہر ایک شام تجھ سے ہے

ہے ہر اک شے کی ابتدا تجھ سے
اور ہر اختتام تجھ سے ہے

خود سے کچھ بھی نہیں کوئی بندہ
جو بھی ہے نیک نام تجھ سے ہے

تو ہے یکتا بھی اور بے پرواہ
سب کو دنیا میں کام تجھ سے ہے

جو ہے دنیا میں سب ہی فانی ہے
مجھ کو حاصل دوام تجھ سے ہے

ہم عبادت میں بھی تیرے محتاج
یہ سجود و قیام تجھ سے ہے

تو ہی کرتا ہے ہر طلب پوری!
سب کو کرنا کلام تجھ سے ہے

میں تو ویسے بھی ہوں ہی بے قیمت
میرا جو بھی ہے دام تجھ سے ہے

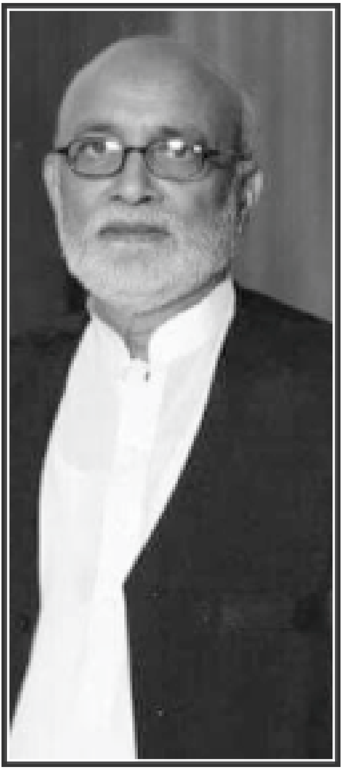

محمد افضال انجم

نعتؐ

مری پہچان اس سے ہو، نبیؐ کا جو قبیلہ ہو
کسی سے مجھ کو کیا مطلب صغیرہ ہو کبیرہ ہو

اطاعت ہو نبیؐ کی بے گماں، وہ حرفِ آخر ہیں
نہ حجت درمیاں آئے ، نہ کوئی اور حیلہ ہو

جو وارث ہیں، ضعیفوں، بے نواوں، بے وسیلوں کے
بروزِ حشر آنکھوں میں، وہی ذاتِ جلیلہ ہو

کسی کی عظمتِ فکر و نظر کا ہے یہ پیمانہ
ضروری ہے نبیؐ کا ہو، وہ بانکا ہو سجیلہ ہو

رہِ حبِ نبیؐ میں ہر سیاحت پاکبازی ہے
قدم اٹھیں جو طیبہ کو، سعی اس کی جمیلہ ہو

یہی خلقِ جدیدِ شعر ہے ، اعلیٰ تخیل ہے
ریاضِ نعت ہو ہر دم تر و تازہ نویلا ہو

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

مجھے قبول نہ جنت نہ طور والی زمیں
مرے حساب میں لکھیے کھجور والی زمیں

اُجالتی ہے مری خاک کا ہر اِک ذرّہ
جو میرے دھیان میں رہتی ہے نور والی زمیں

ترا کرم، تری رحمت، تری عطا سمجھوں
میسر آئے جو یارب حضورؐ والی زمیں

جہانِ تیرہ کو معدوم کرتی ہے ہر دم
نبیِ پاکؐ کے روشن ظہور والی زمیں

درودِ پاک کے صدقے مجھے یہ لگتا ہے
قریب ہی تو ہے میرے وہ دُور والی زمیں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو نے ہر شخص کی تقدیر میں عزّت لکھی
آخری خطبے کی صورت میں وصیّت لکھی

نعتؐ

میں عاصی اور ان کا نگر اللہ اللہ
جبیں میری اور ان کا در اللہ اللہ

نبی کا طریقہ ہے منزل ہماری
رہے سامنے وہ ڈگر اللہ اللہ

نگاہوں میں ہیں سبز گنبد کے جلوے
یہ ہٹتی نہیں ہے نظر اللہ اللہ

بلاوا ملے ہم کو پھر حاضری کا
یہاں آئیں بارِ دگر اللہ اللہ

نمازیں ادا کرنا مسجد میں ان کی
وہ سننا اذانِ سحر اللہ اللہ

دعا مانگتے تھے مدینے کو جائیں!
دعاؤں نے پایا اثر اللہ اللہ

معراجِبہ پہ وہ پیش ہونے کا منظر
گنہ گار مجھ سا بشر اللہ اللہ

وہاں ہم سے بندوں کی اوقات کیا ہے
جھکیں واں پہ شمس و قمر اللہ اللہ

تڑپ دل میں رہتی تھی پائیں حضوری
ملا اُس کا آخر ثمر اللہ اللہ

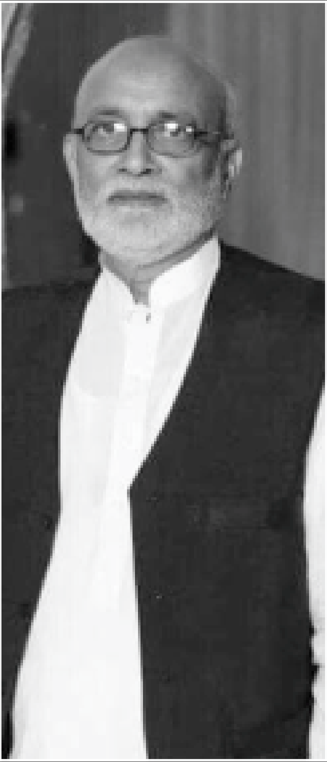

محمد افضال انجم

نعتؐ

بن مانگے وہ مائل بہ عطا ہے تو بجا ہے
یہ طرزِ سخا سب سے جدا ہے تو بجا ہے

وہ نعت کہے اُن کے جو رتبے سے ہو واقف
خود خالقِ کُل نعت سرا ہے تو بجا ہے

تقدیر بدل جائے گی، خالی نہ رہے گا
"تُو شاہِ دو عالم کا گدا ہے تو بجا ہے"

وہ قاسم انعام خداوندی ہے لاریب
یوں دستِ نبی دستِ خدا ہے تو بجا ہے

حکمت سے، محبت سے ہمیں حق سے ملایا
یہ ختمِ نبوت کی ادا ہے تو بجا ہے

صدیق یہ بوجہل سے بولے کہ سمجھ لے
وہ عرش پہ مہمان بنا ہے تو بجا ہے

صد شکر کہ مجھ بے کس و لاچار کا چارہ
محشر میں نبی کی جو دعا ہے تو بجا ہے

محبوب رہی خلقِ خدا جس کو ہمیشہ
عاجزؔ وہی محبوبِ خدا ہے تو بجا ہے

نوید عاجزؔ

نعتؐ

لکھا خدا کی ذات نے جس کا نصاب ہے
ذاتِ محمدؐ ایک مکمل کتاب ہے

رب نے زمیں پہ جو بھی اتاری کتاب ہے
اس میں ضرور ذکرِ رسالت مآب ہے

رہتا ہے عرش ورد میں مصروف ہر گھڑی
اور ارض پہ بھی ذکر ترا بے حساب ہے

عرفات یومِ حشر کو بن جائے گا گواہ
منشور اس جہان کا تیرا خطاب ہے

شرمندہ جسدِ پاک کے آگے تمام عطر
پوشاک ہے کہ طوبیٰ پہ کھلتا گلاب ہے

کس طرح سایہ آپ کا بنتا زمین پر
سارا جہان آپ کے آگے سراب ہے

جانے فلک پہ اور کسے کیا ہوا مگر
دو نیم عشق میں جو ہوا ماہتاب ہے

جس دل میں رب کے ساتھ ہو ذکرِ نبی سدا
مجبور دور رہنے پہ اس سے عذاب ہے

مجھ جیسے عاصیوں سے وہاں کیا سلوک ہو
معراج اس سوال کا پورا جواب ہے

سب انبیا پڑھاتے رہے تھے کتب مگر
اُمّی نے جس کا درس دیا الکتاب ہے

والفجر میں ہے عہدِ حلیمہ کا تذکرہ
والشمس میں بیان تمہارا شباب ہے

قوسین اک مثالِ قرابت ہے آپ کی
ہر ذی نفس سے رب کا وگرنہ حجاب ہے

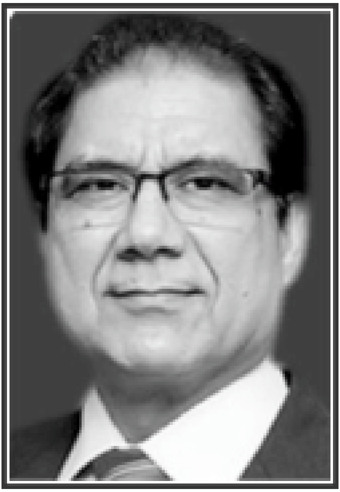

افتخار الحق

عقیدت

کائناتِ حُسن میں کیسے نہ ہوں وہ مُعتبر
آپ کے پیارے نواسے آپ کے لختِ جگر

ظلمتِ شب سے جہانِ دل ڈرے تو کیوں ڈرے
آپ کی تابانیوں سے دل ہے جب رشکِ قمر

سبز گنبد کے خُنک سائے عطا فرمائیے
شاہِ شاہاں آ گئی ہے چلچلاتی دوپہر

قریۂ تاریک پر چشمِ کرم فرمائیے
آپ کے روشن قدم جب مُرتسم ہیں چاند پر

جوشِ دریا جس قدر بھی جوش پر ہو غم نہیں
آپ کے عشاق اُبھرے ہیں ہمیشہ ڈوب کر

منسلک جو ہو گئے دربارِ گوہر بار سے
ہو نہیں سکتا کبھی ایسا کہ وہ ہوں دربدر

کون ہے جو اُنکی رحمت سے نہیں ہے فیض یاب
بے ادب ہو، بے خبر ہو، بے بصر یا بے ہنر

مونس و غم خوار اس دُنیا میں میرا کون ہے
اب کہاں جاؤں تُمھارا آستانہ چھوڑ کر

استغاثہ ہے یہ میرا اور استغفار بھی
اِس پہ رحمت کی نظر ہو کعبۂ جن و بشر

صدقۂ سبطینؓ رحمت کی نظر فرمائیے
رحم کارِ کُل جہاناں رحمتوں کے تاجور

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

عقیدت

عکس و جلوہ سر بہ خم ہیں آئنہ سجدے میں ہے
چشمِ حیراں معتکف ہے ماورا سجدے میں ہے

فکر و فن، نطق و دہن ہیں دم بہ دم سرمستِ حمد
دین و مذہب باوضو ہیں فلسفہ سجدے میں ہے

کیا زمان و کیا مکاں، کیا این و آں، کیا لامکاں
وسعتِ ارض و سما، رُوحِ خلا سجدے میں ہے

گلشنِ کونین میں ایمان تازہ کیوں نہ ہو
نغمۂ سرشاریِ آب و ہوا سجدے میں ہے

کائناتِ بحر و بر اور شش جہاتِ خشک و تر
قطرہ قطرہ، ذرّہ ذرّہ، جا بجا سجدے میں ہے

ملحدانہ کش مکش سے پوچھ لو سرِّ یقیں
درحقیقت پیچ و تابِ زندقہ سجدے میں ہے

پیر و مرشد نے مجھے نظروں سے سمجھائی یہ بات
ہمرہِ اثباتِ اِلّا، نفیِ لا سجدے میں ہے

بحرِ وحدت، قلزمِ توحید، دریائے وجود
کہہ رہے ہیں، ہر فنا، نیرِ بقا سجدے میں ہے

کم ہیں وہ فیضان جن کو ہے خبر اس راز کی
خانۂ کعبہ بھی سرتا سر سدا سجدے میں ہے

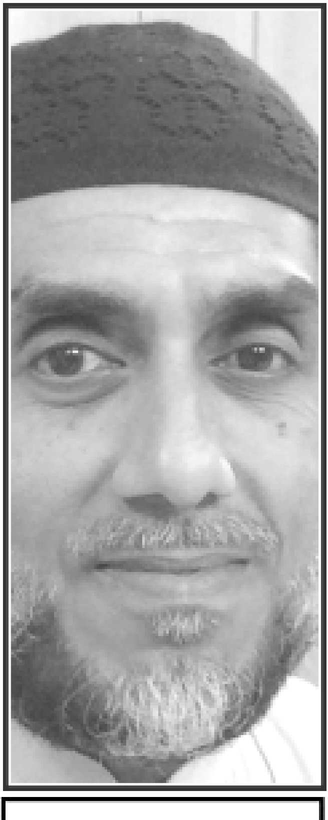

فیض رسول فیضان

عقیدت

عطا ہو رزقِ ثنا نعت کے خزانے سے
ہے میرے دل میں تمنا یہ اک زمانے سے

میں سبز جالیاں چھو کر یوں ہو گئی شاداں
ملا ہے چین نبی کے اِس آستانے سے

ابھی بھی وقت ہے امت سنبھال لے خود کو
قضا کا تیر نہیں چوکتا نشانے سے

میں خوش نصیب ہوں سادات ہے قبیلہ مرا
یہ نسبتیں بھی ملیں آپ کے گھرانے سے

بلاوا آئے گا دربارِ مصطفٰی سے مجھے
کنیز سوچ رہی ہے یہ اک زمانے سے

لکھوں میں حمد خدا کی، نبی کی نعت افروز
سرور دل کو ملے مدحتیں سنانے سے

افروز رضوی

نعتؐ

یا نبیؐ جب آپ کا جلوہ دکھایا جائے گا
قسمتِ تاریک کو پھر جگمگایا جائے گا

آرزو کے نخل کا مِل جائے گا مُجھ کو ثمر
روضۂ اطہر پہ جب مجھ کو بُلایا جائے گا

تِشنگی کے زور کو ایسے بجھایا جائے گا
آبِ کوثر کا پیالا جب پلایا جائے گا

میں کہ شہرِ زندگی کا ذرۂ بے رنگ ہوں
رحمتوں کے رنگ سے مجھ کو سجایا جائے گا

نُور کی کرنوں سے ہوں گے ضَوفشاں یہ جان و دل
نغمۂ نعتِ نبیؐ جب گنگنایا جائے گا

کیوں نہ حاوی ہوگا میرے شعر پر حُسنِ کرم
جلوۂ سبطینؓ جب مجھ کو دکھایا جائے گا

میرا یہ شوقِ طلب تب پائے گا آسودگی
مُجھ سے عاصی کو بھی جب طیبہ بُلایا جائے گا

طائرِ خستہ مری پرواز ہوگی تب بلند
نغمۂ توحید جب مجھ کو سُنایا جائے گا

صاف سچی پُر یقیں جس کی عقیدت ہوگی
اُن کے قدموں کی فضاؤں میں وہ پایا جائے گا

محمد طاہر شاہجہانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس رُخ کروں قصیدۂ شاہِ امم تمام
تشبیب ہی میں ہو گئی تابِ سخن تمام

سلام

اُجڑا ہے شہرِ جاں مگر آباد ہے حسینؑ
اِس واسطے کہ شہر کی بنیاد ہے حسینؑ

اِک نقشِ معتبر مرے اُجڑے دیار کا
میرے لہو میں تیری اِک یاد ہے حسینؑ

آغاز جس کا خوابِ براہیمؑ سے ہُوا
اُس داستانِ عشق کی رُوداد ہے حسینؑ

راضی ہے اپنے رب کی رضا پر، سو اِس لیے
غم خانۂ حیات میں بھی شاد ہے حسینؑ

برباد ہے وہ حلقۂ زنجیرِ شہرِ شام
ہر قیدِ صبح و شام سے آزاد ہے حسینؑ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

توصیف کرے اصغرؑ و اکبرؑ کی وہ کیسے؟
زینب کے لیے ایک حسینؑ، ایک حسنؑ ہے

نازشِ کربلا حُسینؓ

فخرِ فریدؒ و گنج بخشؒ نازشِ کربلا حُسینؓ
کعبۂ اتقیا حُسینؓ قبلۂ اصفیا حُسینؓ

موت کو تیری یاد نے کِتنا حَسین کر دیا
ہر کوئی مُعترف ہوا تیرے کمال کا حُسینؓ

آپ سے شِرک کا پہاڑ ریزہ بہ ریزہ ہو گیا
آپ کے خوف سے مَحل کفر کا گر گیا حُسینؓ

آپ کے عِشق کی سند دستِ علیؓ سے مِل گئی
طُغرائے حُسنِ دینِ حق آپ سے جب مِلا حُسینؓ

شہرِ شہادتِ کمال عکس ہے عرشِ عِشق کا
معنیٔ زندگی بھی ہے آپ سے آئنہ حُسینؓ

پیار کے اور پریم کے قاسمِ دِلرُبا ہو تم
جن کی طلب ہے ذاتِ حق اُنکے ہو تم پیا حُسینؓ

زینتِ سر ہے آپ کے جب سے کُلاہِ مصطفیٰؐ
غازۂ مہر و مہ بنی آپ کی خاکِ پا حُسینؓ

آپ ہی سے کہوں گا میں دُکھ کا الم کا ماجرا
آپ ہی میری آس ہیں آپ ہی آسرا حُسینؓ

ابنِ علیؓ بھی آپ ہیں، ابنِ نبیؐ بھی آپ ہیں
قبضہ ہے عرش و فرش پر آپ کا برملا حُسینؓ

شاہ جہانی آپ کے در کا گدائے بے نوا
اس پہ کرم کی اِک نظر اے مرے بادشہ حُسینؓ

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

سلام

پکارتا ہے ہمیں دشتِ کربلا کا سفر
طویل تر ہے بہت آلِ مصطفےٰ کا سفر

کسی بھی مشکل میں جب تک یزید زندہ ہے
نہ ختم ہو گا حسینؓ ابنِ مرتضیٰؓ کا سفر

مدام آتے ہیں مکتوب شہرِ کوفہ سے
کریں گے اہلِ وفا شہرِ بے وفا کا سفر

کنارِ وادیٔ دجلہ، خیام بے پُرساں
مرے خدا! تری جانب تری رضا کا سفر

ارم میں اُس کے لہو سے عجب چراغاں سا
زمیں پہ تا بہ کراں، اُس کی خاکِ پا کا سفر

نجانے کیسے مسافر تھے، اے غبارِ سفر!
کہ ابتداء میں ملا جن کو انتہا کا سفر

کمالِ مرگ، وہی خاک و خوں کا نظارہ
کمالِ زیست، وہی کرب و ابتلا کا سفر

سنو! کہ شامِ غریباں ہے انقلاب کی صبح
وہیں سے ہوتا ہے آغاز، اِرتقاء کا سفر

قیام کا کوئی امکان ہی نہیں ہے انیس
ہمارے پاؤں سے لپٹا ہے اک سدا کا سفر

محمد انیس انصاری

لبیک یا حسینؓ

ہے ذکر و فکر کہ وعظ و دُعا حسینؓ کا غم
ہے اپنی اپنی نظر اور جدا حسینؓ کا غم

یہ حرف شعر نہیں بس رقم غمِ شبیر
یہ جان و دل بھی ہیں لبیک یا حسینؓ! کا غم

حسینیت ہے جہاد و عزیمت و غیرت
حسینیت سے ہے کُھلتا ہے کیا؟ حسینؓ کا غم

حسینیت ہے عبادت فقط اِک اللہ کی
عبُودیت کا کرے تکملہ حسینؓ کا غم

حسینیت کا ہے ملجا، محمدؐ اے ملّت!
کسی کے در پہ نہیں التجا حسینؓ کا غم

حسینیت سے ہے ناموسِ حلم و زُہد و ورَع
ہے سر پہ فقر کے تاجِ غنا حسینؓ کا غم

حسینیت ہے سفیرِ سفر سوئے طیبہ
سوئے مدینہ ہے جادہ کشا حسینؓ کا غم

حسینیت ہے فراتِ مودّت و ایثار
ہے نہرِ بخششِ صبر و رضا حسینؓ کا غم

حسینیت ہے نصابِ اخوت و اِحسان
ہے درسِ مکتبِ لطف و عطا حسینؓ کا غم

حسینیت ہے جمالِ توکّل و تقویٰ
ہے اُسوۂ حسنہ کی ضیا حسینؓ کا غم

حسینیت کہ ہے انکارِ بیعتِ فاسق
ہے تیغِ شوکتِ صدق و صفا حسینؓ کا غم

حسینیت ہے مُساوات، حُریت، انصاف
کسی کا جبر نہیں مانتا حسینؓ کا غم

کہ سُنّتِ خلفاء بھی ہے مرجعِ طاعت
جو ہم نے چھوڑا اُسے تو مِلا حسینؓ کا غم

حسینیت بنے حاکم، ہے آج اِسی میں فلاح
پہ اقتدار کی خاطر نہ تھا حسینؓ کا غم

عمرؓ ہیں حیدرؓ و عثمانؓ ہیں کہ ہیں بوبکرؓ
ہے سب کے حق میں سرِ کربلا حسینؓ کا غم

کتاب و سُنّت و عترت، امامت و اُمت
ہر ایک خیر کی صَوت و صدا حسینؓ کا غم

خرد پہ پردے ہیں تاریخ کے گمانوں کے
دلِ یقیں پہ مگر خود کھُلا حسینؓ کا غم

وہ تپتی ریت وہ پیاس اُن کو زیر کیسے کرے
ہے باغِ خُلد کی آب و ہوا حسینؓ کا غم

گئے نہ اس لیے کرب و بلا سے وہ کہیں اور
بنے اِرم کی طرف راستہ حسینؓ کا غم

رکھے گا یاد اسے ہر عہدِ زیست حرف بہ حرف
کہ ہے صحیفۂ دشتِ بلا حسینؓ کا غم

گزر گئے وہ ہر اک ابتلا سے یوں بے خوف
کہ جاں لٹا کے بھی فاتح رہا حسینؓ کا غم

ہے وہ شہادتِ ایماں کہ نصرتِ اسلام
ہے کرنا آج بھی ہر حق ادا حسینؓ کا غم

ہیں جلتے آج بھی خیمے تو کیوں؟ ہیں بے حس ہم
نہیں ہے خانۂ جاں میں بسا حسینؓ کا غم

ہے آگ ظلم کی اور فی قلوبھم مرض
علاج ہے ہی آبِ شفا حسینؓ کا غم

متاعِ علم رہے الکتاب و الحکمہ
ہر ایک نفس کا ہے تزکیہ حسینؓ کا غم

کسی کے کرب سے بیگانہ رہ نہیں سکتا
وہ دل کہ جس نے ہے جاں پہ لیا حسینؓ کا غم

شکم پرست تقدس سے الاماں! اُس نے
غم اپنا ہم کو بنا کے دیا حسینؓ کا غم

حسینیت ہے سبھی موسموں میں عزم و ثبات
وہ ایک دن نہیں رسمِ عزا حسینؓ کا غم

وہ کوفیانہ مراسم نہ چھین لیں کہیں پھر
یہ رشتہ اُلفتِ شبیرؓ کا حسینؓ کا غم

ہے کربلا کہ فلسطین، حق کی ہر آواز
نہ دب سکے گی کہ ہے ہمنوا حسینؓ کا غم

لڑیں گے لشکرِ طاغوت سے نہتے بھی
ہے جنگ میں علم حوصلہ حسینؓ کا غم

پھر ایسے موڑ پہ اُمت ہے، فیصلہ کر لے
کہ یا اطاعتِ اغیار یا حسینؓ کا غم

یزیدیت ہو مقابل کہ ہو محاذِ یہود
جہاں میں جیتے گا ہر معرکہ حسینؓ کا غم

خوشا وہ جذبۂ صادق ہے جس میں غیرتِ حق
زہے وہ عشق ہے جس کی بنا حسینؓ کا غم

حسینیت ہے رخِ عفو و رحم و وضع و ادب
ہے عکس ریز بہ ہر آئینہ حسینؓ کا غم

حسینیت چمنِ جذب و شکر و صلح و اماں
خزاں رسیدہ گلوں کی بقا حسینؓ کا غم

دیارِ حسن میں جب سے نہیں وہ سبطِ رسول
اُفق اُفق میں ہے ماتم سرا حسینؓ کا غم

پڑھوں میں جب بھی محمدؐ کی بارگہ میں درود
ہو سوزِ صَلِّ علیٰ المصطفیٰ حسینؓ کا غم

رہِ حسینؓ ہے راہِ درِ مدینۂ علم
ہے بابِ روضۂ واغفرلنا حسینؓ کا غم

حسینؓ وارثِ ختم الرسل ہیں، یہ بھی سنو!
ہے اتباعِ نبیؐ ندا حسینؓ کا غم

وہی تو وقت کا ہے مردِ حُر جسے آصف
ہر ایک خون سے کر دے رہا حسینؓ کا غم

مرزا آصف رسول

سلام

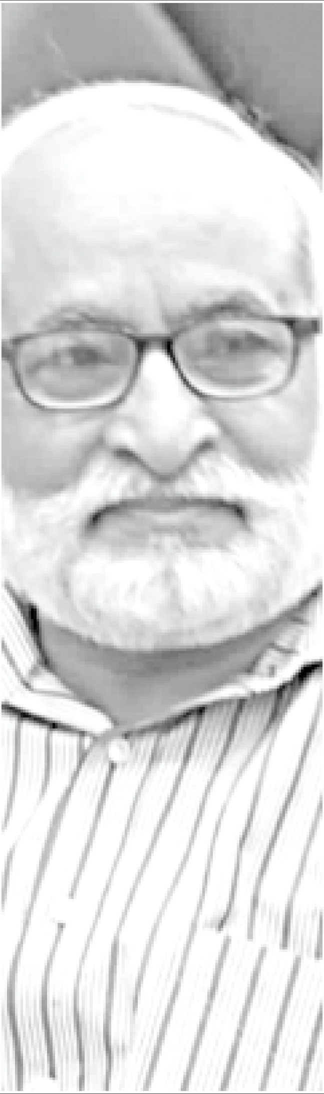

علیؑ کے لاڈلے حبیبِ مصطفیٰؐ حسینؑ ہیں
لہو سے جن کے تر ہے خاکِ کربلا حسینؑ ہیں

دہل گئے تھے دشمنوں کے دل بھی جس کو دیکھ کر
رہِ وفا میں صبر کی وہ انتہا حسینؑ ہیں

بھنور سے ناؤ دین کی جو لائے تھے نکال کر
وہ ناخدا حسینؑ ہیں وہ پیشوا حسینؑ ہیں

کٹا کے سر بتا گئے نماز کا وہ ضابطہ
جہاں میں دینِ مصطفیٰؐ کا ارتقا حسینؑ ہیں

مرے نبیؐ کا تذکرہ ہے جس طرح چہار سُو
اُسی طرح نظر نظر میں جا بجا حسینؑ ہیں

قدم قدم پہ جو لہو سے مشعلیں جلا گئے
وہ خُلد کے مسافروں کے رہنما حسینؑ ہیں

سحرؔ کرو گے کس طرح بیان اُن کی عظمتیں
ہماری سوچ کی حدوں سے ماورا حسینؑ ہیں

اکرم سحر فارانی

سلام

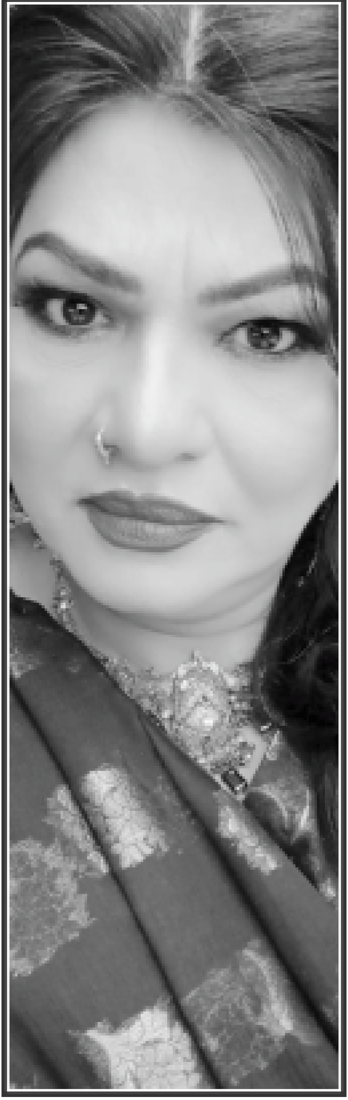

شہید ہونا ہی گر مدعا حسین کا ہے
حسینی جانیں کہ جو فلسفہ حسین کا ہے

یزیدِ وقت رعونت میں بھول بیٹھا تھا
جو حق کی راہ پہ ہے قافلہ حسین کا ہے

جسے تمیز ہی کچھ خیر اور شر میں نہیں
اسی رذیل سے ہی سامنا حسین کا ہے

مٹا ہے حرفِ غلط کی طرح سے اک فاسق
قبیلہ دہر میں سب سے بڑا حسین کا ہے

ہے کربلا کی طرح سے فرات بھی شاہد
کہ بے مثال ہے جو حوصلہ حسین کا ہے

دیا جلے کہ بجھے لوٹ کر نہ جائیں گے
جو سر کٹانے کا ہی فیصلہ حسین کا ہے

گنوا کے جان ملی سرمدی حیات جیا
کلیدِ بابِ عدن راستہ حسین کا ہے

جیا قریشی

سلام

حق کر دیا نسبت کا ادا ابنِ علی نے
کربل میں دیا کنبہ لٹا ابنِ علی نے

تا حشر مثال اس کی ملی ہے نہ ملے گی
وہ رقم کیا بابِ وفا ابنِ علی نے

مظلوم کو ظالم کے کیا مدمقابل
یوں پھیر دی ظلمت کی گھٹا ابنِ علی نے

تا روزِ ابد نعرۂ مستانۂ حق سے
باطل کو کیا حق سے جدا ابنِ علی نے

کانوں میں اذاں دی تھی کبھی ختمِ رسل نے
کربل میں کیا سجدہ ادا ابنِ علی نے

راجہ عبدالقیوم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مرے سامنے حرم تھا، مجھے یہ ہو رہی تھی
سو، وجود بھی عدم تھا، مجھے دیر ہو رہی تھی

رباعیات

شاہ عالی مقام کہتے ہیں تجھے
ماہ و انجم سلام کہتے ہیں تجھے
منزل کا نصیب لکھتے ہیں تیرے قدم
رستے اپنا امام کہتے ہیں تجھے

....

رنگ و نغمات کی صدا روتی ہے
تصویر جدا غزل جدا روتی ہے
مشکیزۂ اشک ہے مصور کی آنکھ
اندیشۂ حرف میں دعا روتی ہے

....

اک چاند پہ سورج کی انا روتی ہے
جلتا ہے جگر خلقِ خدا روتی ہے
دوش و فردا ہیں غم کے پہرے میں اسیر
شبیر کے ماتم میں قضا روتی ہے

....

شب تاب ہے زخم زخم تنویر بھی دیکھ
ہر پھول کو خوں گشتۂ تحریر بھی دیکھ
تقریر اس کے دستِ بریدہ کی سن
خاموش نہیں حلقۂ زنجیر بھی دیکھ

....

زنجیر میں درد کی صدا ہوتی ہے
آزادی بھی قید میں رہا ہوتی ہے
مے خانے میں کوزہ و سبو پیاسے ہیں
ہر دور کی اپنی کربلا ہوتی ہے

پیمانۂ کوثر کی تمنا ہے حسین
خود دیدۂ لولاک میں دریا ہے حسین
قدموں میں ہے نوعِ بشر کی تقدیر
تصویرِ زندگی کا فردا ہے حسین

....

غم روٹھ گیا رقص قضا کرتی ہے
امید نشاط آزمانا کرتی ہے
یہ زندگی جو موت سے لیتی ہے خراج
اصغر کا ابھی قرض ادا کرتی ہے

....

تقدیر پہ ناروا ستم روتا ہے
روتی ہے خوشی خوشی سے غم روتا ہے
میں جبر کی کربلا میں ہوں دجلہ کی پیاس
آنسو ہیں مرے حرف قلم روتا ہے

محمد نصیر زندہ

رباعیات

کچھ روز سے میں انا کا قیدی ہوا ہوں
ان دیکھی سی اک بلا کا قیدی ہوا ہوں
لگتا ہے کہ زندگی مرے قابو میں نہیں
پہلو سے لگی قضا کا قیدی ہوا ہوں

....

الفاظ کی دھول پھول ہو جائے گی
اس بار دعا قبول ہو جائے گی
میری جانب بھی وہ نظر ڈالے گا
دل کی قیمت وصول ہو جائے گی

....

اب ہجر ہے یا وصال، مشکل ہے بہت
الفت کا ہر اک سوال مشکل ہے بہت
ہم جیسے فقط اپنا بدن کاٹتے ہیں
دشمن کو ملے زوال، مشکل ہے بہت

....

دریا کے لیے شکر ادا کرتا ہوں
صحرا کے لیے شکر ادا کرتا ہوں
ہر سمت سے خوشبو تری آتی ہے مجھے
پُروا کے لیے شکر ادا کرتا ہوں

....

لوگوں کا یہاں فتور تھوڑا سا تھا
کہتے ہیں ترا غرور تھوڑا سا تھا
آیا نہ تجھے مجھ پہ یقیں، ٹھیک ہوا
خیر اس میں مرا قصور تھوڑا سا تھا

....

تحریر مری سطور سے باہر ہے
لیکن فسق و فجور سے باہر ہے
آنکھوں میں جو بدمستی ہے بے قابو سی
یہ دائرۂ شعور سے باہر ہے

....

اطراف کوئی چراغ ملتا ہی نہیں
جیون کا یہاں سراغ ملتا ہی نہیں
خاموش ہے ہر کھڑکی، ہر اک دروازہ
اور اپنی جگہ دماغ ملتا ہی نہیں

....

جتنی باتیں ہوتی ہیں سرگوشی میں
اس سے بہتر ہوتی ہیں خاموشی میں
چپکے سے کہیں دور نکل جاتا ہوں
اس بار ترے قرب کی مدہوشی میں

سعید اشعر

ماہیے

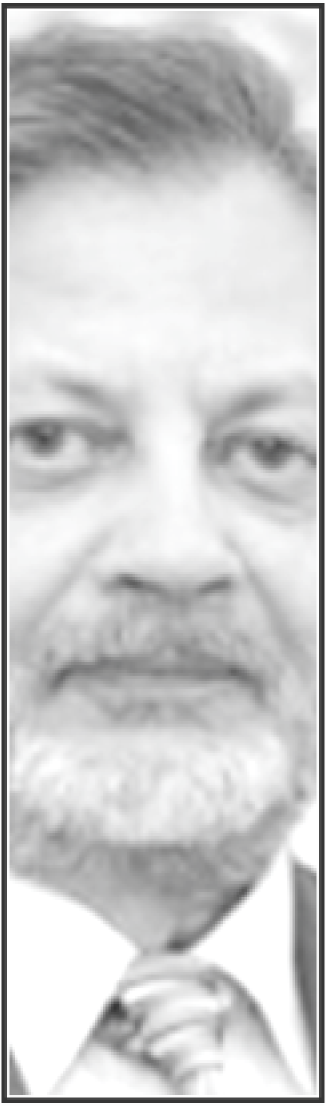

صنفوں کا ادب کرنا
ماہیا کہتے ہُوئے
کم ایک سبب کرنا

پتّہ بھی نہیں ہلتا
مولا دُنیا میں
انصاف نہیں مِلتا

موسم کی سحر خیزی
کب میرا رہتا
اس کو تھی بہت تیزی

تھی بے سر و سامانی
ہم نے ساجن کی
اِک بات نہیں مانی

ترے گال پہ تِل ماہیا
رکھتے پھرتے ہیں
ہم ہاتھ پہ دل ماہیا

خاور اعجاز

دوہے

دیکھ رہے ہیں ساتھ ہم، میلے میں گھڑ دوڑ
اس بار کئی درپیش، اسوار ہیں بے جوڑ

آنسو ٹپکا آنکھ سے، بستی ہوئی اجاڑ
جانے کیسے پڑ گئی، رشتوں میں یہ دراڑ

صبح صبح بازار میں، کیسی ہے بھیڑ بھاڑ
آڑھت کرنے واسطے، شاید ہے مار دھاڑ

دنیا والوں کے لیے دن رات جوڑ توڑ
میرے جیسے دیکھتے، دن رات بھاگ دوڑ

تیری خاطر ساجنا جاتا تھا دھتوڑ
بے خبر میں ایک دن، جا پہنچا باجوڑ

پڑھتے پڑھتے گٹھلیاں، گنتی ہوئی کروڑ
عشق اگانے واسطے، اپنا لہو نچوڑ

آج فقیری ختم کی، ساری رسمیں توڑ
کاسہ لے کے ہاتھ میں، سب کے آگے دوڑ

آنکھیں کالے ناگ کی، ناچے کوئی مور
چڑیا گھر کی سیر میں، دیکھوں کیا کیا اور

تیری صفتیں ان گنت، تو خود بھی ہے عیب
اس کے بارے میں خدا، تھوڑا دے دے غیب

لال گلابی ہو گئے، رخساروں کو سیب
جی للچاتا ہے بہت، بھر لوں اپنی جیب

سعید اشعر

ہند اسلامی تہذیبی قومیت سے پاکستانی......تک

ہند اسلامی تہذیبی قومیت سے پاکستانی اسلامی تہذیبی قومیت تک کے سفر سے آگاہی کے لیے ضروری ہے کہ یہ بات یاد رکھی جائے کہ مسلم دنیا کی تمام ریاستوں کی الگ الگ قومی شناختیں موجود ہیں مگر کسی ایک ریاست کی اجتماعی پہچان کی تفہیم بھی اسلامی تہذیبی عنصر کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسرے الفاظ میں کسی بھی آبادی یا قوم کا کلچر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جانے کے بعد اپنی کلیت میں من وعن موجود نہیں رہتا۔ روحِ اسلامیت اسے بتدریج تبدیل کر کے رکھ دیتی ہے۔ یوں اس کی پہچان میں اسلامی تہذیبی حوالہ بہت اہم ہو جاتا ہے۔ مشترکہ بھارت میں دو قومی نظریہ اس لیے سامنے آیا کہ ایک تو بہت بڑی تعداد میں مقامی آبادی مسلمان ہو گئی اور پھر بعض مخصوص علاقوں میں ان کی غالب اکثریت بھی بہت بڑی زمینی حقیقت بن گئی۔ جہاں تک مختلف تہذیبی روایتوں کے لوگوں کے اکٹھے رہنے کا سوال ہے؛ دو تہذیبوں ہی کے کیا کثیر تہذیبوں کے لوگ بھی اکٹھے رہ سکتے ہیں لیکن ہندوستان میں ایک تو دو تہذیبوں کے لوگوں کا تناسب ایسا تھا اور دوسرے دونوں کی بھاری اکثریت والی جغرافیائی تقسیم موجود تھی۔ جس نے مشرقی اور مغربی بنگال کو تشکیلِ پاکستان سے پہلے ہی تقسیم کر رکھا تھا۔ لہٰذا اگر ان حقائق کے پیشِ نظر مسلم اکثریت نے خود مختاری اختیار کر لی تو کیا قیامت آ گئی۔ پاکستان کسی لشکر کشی سے تو معرضِ وجود میں نہیں آیا۔ برصغیر میں دو تہذیبی اکائیوں کی موجود جغرافیائی تقسیم کے ٹھوس حقائق کے پیشِ نظر جمہوری عمل کا حاصل ہے۔

انگریزوں کی آمد کے بعد شاہی عہد کی مسلم اتھارٹی کے خاتمے اور ہندوؤں کی سنگھٹن اور شدھی جیسی تحریکات سے مسلمان اپنے سیاسی و تہذیبی وجود کو اکثریتی غلبے کے ابھرتے جنون سے محفوظ کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ تاریخ اپنا راستہ خود بناتی ہے۔ اکا دکا افراد کے نظریات یا خیالات کے تابع نہیں ہوتی۔ بھارت کی مدد سے

جلیل عالی

بنگلہ دیش نے علیحدگی کے باوجود نہ تو بھارت سے الگ اپنی آزادی پر کوئی نظر ثانی کی نہ مغربی بنگال کے ساتھ یکجائی اختیار کی۔ اور مشترکہ بھارتی قومیت کے خلاف اپنے فیصلے پر پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہوئے۔ تاریخ کے اس معروض میں بہتری کے حصول پر غور وفکر کرنا ہی درست راستہ ہوگا۔ اٹھہتر سال پرانے معروض میں مختلف آرا کی کشمکش کے توسط مسلم اکثریت کے فیصلے نے جو تاریخ بنائی اس پر کبھی متزلزل نہیں ہوئی۔ بل کہ مقبوضہ کشمیری مسلمانوں کی تحریکِ آزادی اسی تسلسل کا زندہ ثبوت ہے۔ کتابی نظریات ٹھوس تاریخی عمل کی پیش رفتوں کو جھٹلا نہیں سکتے۔

اسی زمین پر اتنے بیدار زمانے میں مقدس نسلیت جیسے قدیم اور فرسودہ تصور پر بھی ایک ریاست موجود ہے جسے دنیا کی بزعمِ خود مہذب ترین قوتوں کی سرپرستی حاصل ہے اور ہمارے کچھ دوست ترکی، ایران، افغانستان اور ایسے کتنے دیگر ممالک کی بقا میں متحرک سیاسی مذہبیت کے مثبت کردار کی نفی کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

کیا افغانیوں نے روسی اور امریکی دونوں سامراجوں سے اپنی قومی آزادی کی جنگ سیاسی اسلامیت کے بل پر نہیں جیتی۔ یہ ایک ٹھوس تاریخی صداقت ہے کہ جدید دنیا میں جہاں مذہب کو اجتماعی زندگی سے بے دخل کر دیا گیا، اسلام اپنے مثبت اجتماعی سروکار سے دست کش نہیں ہوا۔ کیا انقلاب ایران، جہادِ افغانستان اور جہادِ کشمیر قومی آزادی کی جدوجہد میں اجتماعی اسلامیت کے مثبت اور متحرک کردار کی زندہ گواہی نہیں۔

اقبال نے غلط نہیں کہا کہ:

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

....

کیا تاریخ دانوں کے لیے مطالعہ تاریخ کے منہاج کو مزید بہتر بنانے کے لیے کافی معروضی مواد موجود نہیں ہے؟

اکثریتی مسلمانوں کی الگ ریاست کی تجویز والے پاکستان کے حوالے سے اقبال نے تھامپسن کو لکھے گئے خط میں واضح کیا تھا کہ براہِ راست انگلینڈ کے ماتحت ہندوستانی فیڈریشن کے ایک صوبے کی حیثیت والے پاکستان کے منصوبے کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔ (وہ آزاد ہندوستانی فیڈریشن کے ایک مسلم صوبے کے حامی ہیں۔)

اس بات کی مزید وضاحت کے لیے الہ آباد کے خطبے کے ان الفاظ پر غور کرنا ہوگا جن میں اقبال نے مجوزہ ریاستی اکائی کے انگلستان کی عملداری کے اندر یا باہر قیام کی بات کی ہے۔ گویا 1930 کے خطبے میں انگلشیہ عملداری سے باہر کی گنجائش یا ایمائیت رکھی گئی تھی۔ اقبال کا مقصد اگر الگ اور مکمل آزاد وطن نہ ہوتا تو وہ اسی لیکچر میں یہ کیوں کہتے کہ جب ہم ایک آزاد وطن بنا لیں گے تو ہمیں موقع ملے گا کہ اسلام کے چہرے سے عرب کلچر کی استعماری چھاپ بھی اتار سکیں۔

چنانچہ انھوں نے بعد کو حالات کے موافق ہونے پر اسی نصب العین کے تسلسل میں جناح کے نام اپنے ایک خط میں بالکل واضح طور پر یہ لکھا کہ ''کیا وقت آ نہیں گیا کہ الگ وطن کا مطالبہ کر دیا جائے۔'' چشمِ تاریخ نے دیکھا کہ اس خط کے دو برس کے اندر اندر قرار دادِ پاکستان منظور ہو گئی اور 14 اگست 1947 کو وطنِ عزیز پاکستان معرضِ وجود میں آ گیا۔

جہاں تک خطے کی تاریخ سے اعتنا کا تعلق ہے۔ پڑھنے اور جاننے کی حد تک خطے ہی نہیں پوری انسانیت کی تاریخ سے آگاہ ہونا مستحسن ہے۔

لیکن کسی قوم کی شناخت اس کے اس تاریخی شعور سے بنتی ہے جو اس کے فکر و احساس میں زندہ و تابندہ ہو۔

ایک تاریخ حنوطی ہے عجائب گھر میں
ایک تاریخ لہو بیچ رواں رہتی ہے
(ج ع)

اس تناظر میں تصورِ پاکستان تو نام ہی تقسیم تاریخ کا ہے۔ اسلامی تہذیبی قومیت محمد بن قاسم کے مقابل راجہ داہر اور محمود غزنوی کے مقابل پرتھوی راج کو اپنا ہیرو کیسے مان سکتی ہے۔ اقبال اور قائدِ اعظم نے اسی لیے برِ صغیر کی مسلم تہذیبی تاریخ کو اپنی الگ قومی شناخت کا ٹھوس حوالہ بنایا تھا اور کہا تھا کہ ہماری زبان، ہمارا تاریخی شعور، ہمارے ہیرو، ہمارا مذہب، ہمارا نظریہ حیات اور ہمارا کلچر ہندوؤں سے الگ ہے۔ گائے کی پرستش کرنے والوں کا گائے کا گوشت کھانے والوں میں تبدیل ہو جانا محض مذہبی شعائر سے متعلق کوئی شے نہیں ہے اعصابی عادت تک تبدیل ہو جانے کی عضویاتی پیش رفت ہے۔ ذات پات کے اسیر سماج میں صوفیا کے لنگروں اور علما کی مومنوں کے بھائی بھائی ہونے کی تبلیغ سے مسلم برادری کا حصہ بن جانے والوں کے طرزِ حیات میں ٹھوس تبدیلی واقع ہو جانا کوئی معمولی تہذیبی انقلاب نہیں ہے۔

جس طرح ہم پوری دنیا کے سائنسی موجدوں اور دیگر علوم و فنون کے اکابرین کو مشترک انسانی اثاثہ سمجھتے ہیں ہمیں پاکستان کے جغرافیائی دائرے کے اندر جنم لینے والے سائنسدانوں اور علوم و فنون کے ماہرین کو اپنانے میں کیا باک ہو سکتا ہے ہاں ہم ان میں سے کسی بھی ایسی تعلیمات سے اختلاف کا حق رکھتے ہیں جو ہمارے نظریۂ حیات کی نفی یا تخفیف کرتا ہو اور ایسے مفکرین و تخلیق کاروں کو ترجیح دینے کا حق بھی غیر فطری نہیں جن کے افکار ہمارے مجموعی طرزِ فکر و احساس سے متصادم نہ ہوں۔

اب آ جائیے پاکستانی قوم کے تہذیبی شعور کے عملی مظاہر کی طرف۔ اس پر بات کرنے سے پہلے یہ ذہن میں رہے کہ کال مارکس کے مطابق ریاست ایک لحاظ سے مزعومہ مفاداتی گروہوں کا اکٹھ ہوتی ہے جسے ہم پاور کلب بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود ریاستی قومیت میں تمام طبقوں کی وابستگی بھی ایک اٹل سچ ہے۔ روس اور چین ایک ہی نظریے کی

مملکتیں ہونے کے باوجود اپنی تاریخی وتہذیبی شناختوں بارے حساس رہی ہیں۔ پاکستان کے بعد وطنِ عزیز کو یرغمال بنا لینے والی پاور کلب مرضی کا تعلیمی نصاب اور دیگر تمام شعبوں میں اپنے مفادات سے ہم آہنگ نظریات بروئے کار لانے کے باوجود پاکستانی جمہور کی اجتماعی رائے کے جوہر کو قابو میں نہیں لا سکی۔ اگر ایسا ہوتا تو چار مارشل لاؤں کی ضرورت نہ پڑتی۔ جمہوری اظہار کے ہر موقعے پر پاکستان کے تہذیبی جوہر نے اپنی شناخت کے اعلان کے ساتھ اپنے زیادہ و فعال ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ اسی جوہر نے تحریکِ پاکستان میں ملائیت، اشتراکیت، مشترک ہندوستانی قومیت، لادینیت اور مغربی سرمایہ دارانہ آزاد خیالی کو شکست دی۔

روایتی اسلام اور اسلامی سوشلزم کے تنازعے میں رجعت پسندی کو شکست دی۔

یہ قوم اپنی ترقی پسندانہ پاکستانی اسلامی تہذیبی قومیت پر کبھی مفاہمت نہیں کرتی۔

جبکہ بھارت میں مسلسل جمہوریت اور سیکولرزم کے نعرے کے باوجود گزشتہ کئی برسوں سے عوام کی غالب اکثریت کی جمہوری تائید سے ہندوتوا والی انتہا پسند بنیاد پرستی حکومت کر رہی ہے۔

پاکستان میں کسی اسکالر پر تاریخی تحقیق پر قدغن نہیں۔ یہاں ایسے متعصب نام نہاد تاریخ دانوں کی کتابیں بھی دھڑا دھڑ چھپ رہی ہیں جنھیں مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ میں کوئی بھی اچھی بات دکھائی نہیں دیتی۔

ہماری شناخت کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اختلافی بحثیں چلتی رہتی ہیں۔ مگر پاکستانی عوام نے ہر بڑی تحریک میں واضح طور پر اس کا اظہار کیا ہے کہ ان کی پہچان پاکستانی اسلامی تہذیبی تشخص ہے۔ شوکتِ اسلام کی تحریک ہو، ختمِ نبوت کی تحریک ہو معاشی و معاشرتی انصاف کے حوالے سے اسلامی سوشلزم کی تحریک ہو یا پھر ریاستِ مدینہ کی تحریک ہو؛ وسیع تر عوامی و جمہوری مشارکت، ولولے اور جذبہ وجوش نے بار بار ثابت کیا کہ پاکستان کی حقیقی شناخت پاکستانی اسلامی تہذیبی تشخص ہی سے عبارت ہے۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے 1973 کے آئین میں متفقہ طور پر قرارداد مقاصد کی شمولیت اور سوشلزم کی جگہ اسلامی مساوات کی ترکیب کا اجماع پکار پکار کر یہ اعلان کر رہا ہے کہ اس کی اساس مغربی سرمایہ دارانہ جمہوریت سے الگ اقبال کی روحانی جمہوریت کی ترجیح پر ہے۔

متحدہ ہندوستان میں بھی ہندوستانی مسلمان ہند اسلامی تہذیبی قومیت کی مشارکت میں جیتے تھے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد اس میں پاکستانی اسلامی تہذیبی قومیت کا اضافی ہو گیا۔ پھر مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے ایک تیسری قومیت ابھر آئی، جس کی تفہیم بنگلہ دیشی اسلامی تہذیبی قومیت کے طور پر کی جا سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

دربیانِ روح ولطائفِ ستہ

روح کو قرآنِ پاک میں ''امرِ ربی'' کہا گیا ہے جسے رب کا حکم' یا رب کے حکم سے' کے معنوں میں لیا جاتا ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے کہ ''تمھیں علم نہیں دیا گیا مگر تھوڑا سا''۔ علم کی اِس کمی کا اطلاق روح کے علاوہ باقی علوم کی مقدار پر بھی ہوتا ہے تاہم یہ الفاظ روح کے بارے میں بالخصوص درج ہوئے ہیں۔ ابوبصیر فرماتے ہیں کہ مَیں نے امام صادق سے اِس آیت کے بارے میں پوچھا تو اُنھوں نے فرمایا کہ ''روح جبرائیل اور میکائیل سے بڑی مخلوق ہے اور وہ آسمانی دُنیا سے ہے''۔ زرارہ بن عیان کہتے ہیں کہ مَیں نے امام باقر سے دریافت کیا، اُنھوں نے کہا کہ یہ خدا کی مخلوقات میں سے ایک ہے۔ سورۂ قدر میں آتا ہے اُس رات میں فرشتے اور روح نازل ہوتے ہیں۔ اِس آیت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ کون کون سے فرشتے نازل ہوتے ہیں البتہ ''روح'' کا ذکر خصوصاً کیا گیا ہے جس سے امام صادق کے بیان کو تقویت ملتی ہے کہ روح جلیل القدر فرشتوں سے بھی بڑی کوئی مخلوق ہے۔

علامہ سیوطیؒ ''شرح الصدور'' میں بیان کرتے ہیں کہ وفات کے بعد مومنین کی روحیں رمیائیل نامی فرشتے کے حوالے کی جاتی ہیں جبکہ کفار کی روحوں پر مقرر فرشتے کا نام دومہ ہے۔ عام انسانی ارواح مرنے کے بعد باقی رہتی ہیں تاہم انبیائے کرام یا جنھیں اللہ چاہے اُن کے اجسام مٹی پر حرام ہیں۔ اجسام سے زیادہ ارواح میں تشخص ہے۔ اجسام میں تو کبھی کبھی مشابہت پائی بھی جاتی ہے لیکن روحوں میں قطعی مشابہت نہیں۔ بدن روح کا قالب ہے اور بدن سے مِل کر روح جسی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ ہر شخص دُنیا سے اُٹھنے سے پہلے اپنا جنتی یا جہنمی ٹھکانا دیکھ لیتا ہے۔ دُنیا سے جدا ہوتے وقت روح ہر ناخن اور ہر جوڑ سے کھینچی جاتی ہے۔ جس جس حصے سے روح کھینچی جاتی ہے وہ مرتا جاتا ہے اور اُس پر آسانی ہوتی جاتی ہے اگرچہ

خاور اعجاز

ہم اُس پر تختی دیکھتے ہیں۔ جب قبض کیے جانے کے بعد روح اُوپر اُٹھتی ہے تو مرنے والے کی آنکھ اُسے دیکھتی ہے (گویا روح کی بھی کوئی شکل وصورت ہوتی ہے) حتیٰ کہ حق تعالیٰ کے سامنے کھڑی کر دی جاتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ اُس کا نام علیین یا سجین میں لکھ لیا جائے۔ پھر زمین کی طرف لوٹا دی جاتی ہے اور سوال کے لیے قبر میں بدن کے ساتھ داخل ہوتی ہے۔ امام احمد رضا بریلوی کی کتاب ''فتاویٰ رضویہ'' کے مطابق موت کے بعد انسان کی انفرادی روح میں جاننے، سننے اور دیکھنے کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ تمام ارواح اپنی قبر یا مرگھٹ پر آنے والوں کو دیکھتی، سنتی، پہچانتی اور سلاموں کا جواب دیتی ہیں۔ حضورؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ جو مسلمان کسی قبر کے پاس سے گذرتا ہے اور اُس پر سلام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی روح کو لوٹا دیتا ہے یہاں تک کہ وہ سلام کا جواب دے دیتا ہے تاہم جانوروں کی روحوں کا اپنے جسموں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مفتی محمد امجد علی اعظمی کی کتاب ''بہارِ شریعت'' (مطبوعہ: مکتبہ المدینہ، کراچی ۲۰۱۲ء: جلد اول، ص ۱۰۰) میں لکھا ہے کہ مرنے کے بعد بدن پر جو گذرے گی روح اُس سے آگاہ و متاثر ہوگی۔ حافظ ابنِ قیم بھی ''کتاب الروح'' میں رقمطراز ہیں کہ روح کو اپنے جسم کے ذرات اور قبر سے تعلق رہتا ہے: قبر کا عذاب و ثواب جسم و روح دونوں پر ہوتا ہے، روح پر براہِ راست اور جسم پر بالواسطۂ روح۔ دُنیا کے احکام اجسام پر جاری ہیں اور روحیں اُن کے تابع ہیں۔ برزخ کے احکام روحوں پر جاری ہیں اور اجسام اُن کے تابع ہوتے ہیں اور قیامت کے دن اجسام و ارواح دونوں متاثر ہوں گے۔ دُنیا کی آخری گھڑی اور برزخ کی پہلی گھڑی کے وقت مرنے والے سے پردے اُٹھا دیے جاتے ہیں۔ روح آسمان سے واپس آکر بدن کو غسل دیے جانے اور کفن پہنائے جانے اور قبرستان کی جانب لے جانے کا مشاہدہ کرتی ہے۔ تازہ مُردے اُس وقت تک سُنتے ہیں جب تک اُن کے پاس سوال و جواب کے لیے روح رہتی ہے۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ مُردے کو اپنی قبر کی زیارت کرنے والے کا علم ہو جاتا ہے۔ عثمان بن الاسود کا بیان ہے کہ میری والدہ نے خواب میں فرمایا کہ جمعہ کے دن جب تم اپنے گھر سے آتے ہو تو مجھے مژدہ سُنایا جاتا ہے کہ تمھارا بیٹا آگیا ہے۔

دُنیا سے جانے والی روحیں پہلے جانے والی روحوں کو پیام رسانی کا ذریعہ ہیں۔ روحیں مرنے والے کا استقبال کرتی ہیں اور خبروں کے انتظار میں رہتی ہیں پھر جب اُن کے پاس کوئی مردہ آتا ہے تو پوچھتی ہیں کہ فلاں فلاں کا کیا حال ہے۔ علیین والی روحوں کے باہم میل جول اور گذرے واقعات پر بات چیت کو علما نے رد نہیں کیا۔ حضورؐ نے

فرمایا کہ مومنین کی ارواح سبز پرندوں میں ہوتی ہیں، جنت میں جہاں چاہیں سیر کرتی ہیں اور کافروں کی روحیں سجین میں قید ہوتی ہیں- امام مالک کا قول ہے کہ مومن روحیں آزاد ہوتی ہیں- ہر روح اپنی رفیق اور ہم مثل عمل والی روح کے ساتھ ملتی جلتی ہے- مل جل کر رہنا دنیا میں بھی پایا جاتا ہے اور برزخ اور عالمِ آخرت میں بھی-

"بہارِ شریعت" کی رُو سے مسلمانوں کی ارواح حسبِ مرتبہ قبر، آسمان و زمین کے مابین، پہلے دُوسرے یا ساتویں آسمان تک اور بعض کی آسمانوں سے بھی بلند اور بعض کی روحیں زیرِ عرش قندیلوں میں اور بعض کی اعلیٰ علیین میں ہوتی ہیں -اسی طرح کافروں کی ارواح بھی قبر، پہلی دُوسری یا ساتویں زمین تک اور بعض کی اُس سے بھی نیچے سجین میں قید ہوتی ہیں- حافظ ابنِ قیم کے مطابق برزخ آخرت کی پہلی سیڑھی ہے جس میں ہر روح کا ٹھکانہ اُس کے مرتبے کے مطابق ہے- روح پر برزخ میں قیامت تک عذاب و ثواب ہوتا ہے- حق تعالیٰ نے قوم فرعون کی روحوں کے بارے میں فرمایا کہ اُنھیں قیامت تک صبح و شام آگ پر پیش کیا جاتا رہے گا-

جنتی عالمِ برزخ میں روحانی نعمتوں سے فیضیاب ہوں گے اور قیامت کے دن جب روحیں اپنے جسموں میں چلی جائیں گی تو روحانی نعمتوں پر جسمانی نعمتوں کا بھی اضافہ کر دیا جائے گا- خواب میں زندوں اور مُردوں کی روحوں کی ملاقات ہو جاتی ہے کیونکہ روحیں انتہائی تیز رفتار ہیں اور خواب میں ایک گونہ تجرد حاصل کر کے اُوپر کو پرواز کرتی ہیں اور مختلف ارواح سے ملاقات کر لیتی ہیں- نیند کی وجہ سے روح آزاد ہو جاتی ہے تو اپنی صلاحیت کے مطابق مشاہدات کرتی ہے لیکن جب موت کی صورت میں پوری آزادی مل جاتی ہے تو روح کے علوم و معارف بھی کمال پر پہنچ جاتے ہیں تاہم اللہ کے اُس علم پر مطلع نہیں ہو سکتی جو اُس نے اپنے پیغمبروں کو عطا فرمائے- کبھی دو روحوں میں کوئی خاص مناسبت ہوتی ہے اور دونوں کا انتہائی گہرا اور مخفی تعلق ہوتا ہے جس کی بنا پر ہر ایک کو اپنے ساتھی کے بعض واقعات کا شعور ہو جاتا ہے-

ابو ایوب کا بیان ہے کہ زندوں کے عمل مُردوں پر پیش کیے جاتے ہیں- صدقہ بن سلیمان کہتے ہیں کہ مَیں والد کی قبر پر آیا اور میری آنکھ لگ گئی تو مَیں نے دیکھا وہ فرما رہے تھے بیٹا تمھارے عمل ہم پر پیش کیے جاتے ہیں- اسی طرح ابو قلابہ ایک قبر پر سر رکھ کر سوئے تو خواب میں صاحبِ قبر نے فرمایا کہ تم عمل کرتے ہو اور حالات سے بے خبر ہو، ہم حالات سے خبردار ہیں مگر عمل سے محروم ہیں- ابوداؤد سے روایت ہے کہ ایک دفعہ حضورؐ کسی جنازے میں شریک

ہوئے۔ دفن کے بعد آپؐ نے فرمایا اپنے بھائی کی ثابت قدمی کی دعائیں مانگو کیونکہ اب اُس سے سوال ہو رہا ہے۔ معلوم ہُوا کہ جب مردے سے سوال کیا جاتا ہے تو وہ تلقین بھی سنتا ہے۔ ایک آدمی کا فوت شدہ بھائی اُس کے خواب میں آیا اور بولا کہ آنے والا میرے پاس آگ کا ایک شعلہ لے کر آیا۔ اگر دعا کرنے والے میرے لیے دعا نہ کرتے تو میں ہلاک ہو جاتا۔ شبیب بن شیبہ فرماتے ہیں کہ میری والدہ نے مجھے وصیت کی کہ مجھے دفن کرنے کے بعد میری قبر پر ٹھہر کر کہنا اے اُمِ شبیب لا الٰہ الا اللہ پڑھو۔ فرماتے ہیں رات کو انھیں خواب میں دیکھا، کہہ رہی تھیں کہ اگر لا الٰہ الا اللہ مجھے نہ سنبھالتا تو میں ہلاک ہو جاتی۔

عالمِ خلق عرش کے نیچے اور عالمِ امر عرش سے اوپر کی مخلوقات سے تعلق رکھتا ہے۔ انسان کی ساخت عالمِ خلق کے پانچ (مٹی، پانی، ہوا، آگ اور نفس) اور عالمِ امر کے بھی پانچ (قلب، روح، سر، خفی، اخفیٰ) اجزا سے ہوئی ہے۔ نفس، قلب، روح، سر، خفی اور اخفیٰ مل کر لطائفِ ستہ کہلاتے ہیں۔

لطیفۂ نفس کا تعلق عالمِ ناسوت سے ہے جب کہ بقیہ لطائف سماوی ہیں۔ اس کا مقام بعض کے نزدیک زیرِ ناف ہے۔ اس کا نور سبز اور نیلگوں ہے۔ لطیفۂ قلب سے مراد گوشت کا لوتھڑا نہیں، قلبِ حقیقی جسم کے بائیں پہلو میں واقع ہے۔ لطیفۂ روح کا مقام جسم کے دائیں پہلو میں ہے۔ لطیفۂ سر جسم کے بائیں جانب ہے اور یہ مشاہدہ اور دیدار کا مقام ہے، اس کا نور سفید ہے۔ لطیفۂ خفی سینے کے دائیں طرف مائل بوسطِ سینہ ہے۔ اس کا نور سیاہ ہے۔ لطیفۂ اخفیٰ کا مقام وسطِ سینہ ہے اور اس کا نور سبز ہے۔

لطیفۂ نفس کی تاثیر نفسانیت اور سرکشی کے خاتمے، عجز وانکسار پیدا ہونے اور ذکر میں ذوق وشوق کے بڑھنے سے ظاہر ہوتی ہے۔ لطیفۂ قلب کی تاثیر رفعِ غفلت اور دفعِ شہوت ہے؛ لطیفۂ روح اعتدال اور اصلاح وسکون کا باعث، لطیفۂ سر حرص وطمع کا خاتم نیز دینی امور میں مال خرچ کرنے اور فکرِ آخرت کی بیداری میں معاون؛ لطیفۂ خفی حسد وبخل اور کینہ وغیبت سے نجات میں مددگار اور لطیفۂ اخفیٰ کی تاثیر فخر وغرور سے رہائی اور مکمل اطمینان کا ظہور ہے۔

قلب کے اندر لطیفۂ روح، روح کے اندر لطیفۂ سری، لطیفۂ سری کے اندر لطیفۂ خفی اور خفی کے اندر لطیفۂ اخفیٰ (پوشیدہ تر) ہے۔ قلب پر شہوت، بغض، حسد اور تکبر وغیرہ کے ان گنت جالے ہیں۔ قلب کے اندر مقید لطائف کو اللہ کی جانب راغب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں قید سے آزاد کیا جائے تاکہ وہ الگ ہو کر پورے سینے میں اپنے اپنے مقام پر جاگزیں ہوں اور انسان بتدریج مومن ہوتا چلا جائے۔

☆☆☆☆☆

مظہر علی کھرڑ کے نعتیہ مجموعے ’’ثنائے محمدؐ‘‘ پر ایک نظر

نسیم سحر

شہرت پسندی سے یکسر گریزاں نعت گو مظہر علی کھرڑ ایک ایسے منجھے ہوئے اور حبِ رسولؐ میں ڈوبے ہوئے شاعر ہیں جن کا ایک سو چھہتر صفحات پر مشتمل نعتیہ اور تقدیسی مجموعہ میری چشمِ منتظر کے سامنے آنے سے پہلے بل کہ شائع ہونے سے قبل ہی چھ مستند اور معروف نقادانِ فن کی نظروں سے گزر چکا ہے اور سب نے اُن کے فنِ نعت گوئی کے بارے میں جو محبت بھری تحاریر اس مجموعے کی زینت بنائی ہیں، ان کے بعد اس مجموعے کی بالاستیعاب خواندگی مجھ پر لازم ہو گئی تھی، اور ایسا کرنے کے بعد میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ ان نقادانِ فن اور نعت سے آشنا شخصیات نے مظہر علی کھرڑ کے بارے میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں کی۔ ان شخصیات کے اسمائے گرامی ملاحظہ کرنے سے قارئین بھی مجھ سے متفق ہوں گے۔ پروفیسر محمد طاہر صدیقی، جناب اعجاز خان ساحر، پروفیسر حافظ محبوب احمد، حافظ محمد عبدالجلیل، سید خبدار قائم اور کتاب کے ناشر جناب اشفاق احمد غوری، جو خود ایک انتہائی تخلیقی انداز کے نعت گو اور نقاد ہیں اور جن کے ادارے سے کوئی نعتیہ مجموعہ تبھی شائع ہوتا ہے جب وہ تقدیسی اور تخلیقی معیارات پر پورا اترے۔

’’ثنائے محمدؐ‘‘ میں شامل تقریباً اٹھتّر نعتیں اور سترہ مناقب مظہر علی کھرڑ کی تقدیسی و عقیدتی شاعری کی ایک ایسی کہکشاں روشن کرتی ہیں جن میں شامل ہر تخلیق اپنی جگہ ایک کہکشانی بارہ دری ہے۔ راقم السطور کی شاعرِ مذکور سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی البتہ سوشل میڈیا پر ان کی تخلیقات کبھی کبھار دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا، اور ان کی لکھی ہوئی نعتیں کئی معروف نعت خوانوں کے عمدہ لحن میں سماعت کا موقع بھی ملا۔ اب یہ کتاب سامنے آئی تو ان سے اور ان کے کمالِ فن سے بھرپور تعارف بھی ہوا۔

ان کی کچھ طویل ردیفوں نے میری توجہ اپنی جانب کھینچی کہ ان میں لکھے گئے اشعار محض ردیف کے ساتھ قافیہ برتنے کے لیے نہیں، بل کہ اپنی عقیدت و محبت کے اظہار کی غرض سے لکھے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ ردیفیں ملاحظہ ہوں: کہ آمدِ مصطفیؐ کی ہے، جو مدینے چلے ہم، ان کے مدینے میں، ان کی ہے کیا کہنے، عرب کی زمیں پر، درود اُنؐ پر سلام اُنؐ پر، اسی طرح نسبتاً مختصر ردیفوں میں انھوں نے جو اشعار کہے ہیں وہ سہلِ ممتنع کا

کمال بھی ہیں اور جامعیت میں بلاغت کا نمونہ بھی۔ ان ردیفوں میں سے قابلِ ذکر کچھ ردیفیں ملاحظہ ہوں: درود پڑھتے ہیں، پیارے آقاؐ، تیرے گھرانے میں، دیکھنا ہے، یاد آ گئے، مدینے چلیں گے۔ مناسب ہو اگر ان طویل ردیفوں کے ساتھ ساتھ متوسط اور مختصر ردیفوں میں ان کے کہے گئے کچھ اشعار اپنے دعوے کی دلیل کے طور پر یہاں پیش کروں:

بلاؤ سارے لوگوں کو کہ ہیں میلاد کی خوشیاں
عدو سارے بھی اپنے کر کہ آمد مصطفیٰؐ کی ہے

....

سفر ہے نرالا ، مزا آ رہا ہے
قدم در قدم جو مدینے چلے ہم

....

امیروں کو فقیروں کو وہاں کاسہ بکف دیکھا
سدا مقبول ہوتی ہے دعا اُنؐ کے مدینے میں

....

کڑی دھوپ سے جو بشر کو بچائے
فلک سے وہؐ لے کر ردا آ گئے ہیں

....

نبیؐ کی رضا میں خدا کی رضا ہے
محمدؐ کو راضی کیے جا ، کیے جا

....

لگا نقشِ پا اُن کا عرشِ بریں پر
کوئی اُنؐ سا مسند نشیں بھی کہاں ہے

....

عرب کی زمیں پر ہے کعبہ بھی لوگو
ہے کعبے کا کعبہ عرب کی زمیں پر

....

ہم زمیں زاد ہی نہیں ، اُنؐ پر
چاند تارے درود پڑھتے ہیں

میں درِ غیر پر نہیں جاتا
بس درِ مصطفیٰؐ ہی کافی ہے

....

جمی ہے سیاہی گناہوں کی دل پر
اسے اب مٹانے مدینے چلیں گے

....

اسی تناظر میں مناقب کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

نبیؐ پر فدا ہے کیا سب کچھ اپنا
رفیقِ پیمبر ہیں صدیقِ اکبرؓ

....

کنواں خرید کے ہے وقف کر دیا لیکن
ستم ، کہ پیاس میں دی جان، وہ مرا عثمان

....

اسم میٹھا علی ولی کا ہے
جامِ حیدر پیا کرو ہر دم

....

جو نانا سے کیا وعدہ نبھایا ہے وہ کربل میں
کہ سر نیزے پہ ہے تیرا مگر قرآں سنایا ہے

....

یہ دینِ محمدؐ بچا کربلا میں
یزیدی ہوئے ہیں فنا کربلا میں

....

تخلیقی زرخیزی اور تقدیسی وفور کے مظہر درج بالا اشعار کے بعد راقم السطور ضروری سمجھتا ہے کہ اس اظہاریے کے آغاز میں جن مشاہیر نقادانِ فن کے اسمائے گرامی درج کیے گئے تھے، مظہر علی کھوکھر کی نعت گوئی کی توفیقات اور فنی دسترس کے اعتراف کے طور پر ان کی تحاریر سے مختصر اقتباسات پیش کر کے اس اظہاریے کو تمام کروں:

☆ مظہر علی کھوکھر کے ہاں جمالیاتی اقدار مذہبی قدروں کو نکھارتی، سائنسی قدروں کو فروغ دیتی

اور تاریخی قدروں کی تصدیق کرتی نظر آتی ہیں۔ ان کے ہاں جمالیاتی اقدار نہ صرف اخلاقی قدروں کے تحفظ و ترویج کا باعث ہیں، بل کہ ان کی حِسِ جمال اخلاقیات کی تعمیر کرتی دکھائی دیتی ہے۔ (پروفیسر محمد طاہر صدیقی)

☆ مظہر علی کھٹڑ نے بادِ بہاری، خوشبو اور روشنی کو کیفیات میں گوندھ کر لفظوں میں ڈھال کر کتاب کے صفحات پر سجا دیا ہے۔ مظہر کی شاعری تصنع، فن اور فنکاری سے ماورا ایک سچے جذبوں کی صاف شفاف اور سادہ ترقیم اور تصویر ہے۔ (اشفاق احمد غوری)

☆ صاحبِ کتاب کے ہاں عشقِ رسولؐ کا وفور، مدینے سے دوری کا دکھ اور درِ رسولؐ پر حاضری کے جذبات، اشعار کی صورت میں ڈھلتے نظر آتے ہیں--- مترنم اور کامل بحور کر استعمال اس کتاب کی دوسری بڑی خوبی ہے۔ ایک جیسی بحور میں مختلف قافیہ و ردیف اور مضامین کے اعادہ سے پرہیز ایک مشکل کام ہے، مگر مظہر علی کھٹڑ کے ہاں ایسا جا بجا ملتا ہے جو اُن کی شاعری کے رموز پر گرفت پردال ہے۔ (اعجاز خان ساحر)

☆ کسی بھی نعتیہ مجموعے پر گفتگو اس وقت تک نامکمل ہی رہتی ہے جب تک اسے فنی اعتبار سے جانچ پرکھ نہ لیا جائے۔ تو میں نے جب اس حوالے سے 'ثنائے آقا' پر ایک نظر دوڑائی تو مجھے جا بجا مظہر علی کھٹڑ کی شاعرانہ عظمت اور فنی پختگی کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا-- آپ اس کتاب کو جہاں سے بھی دیکھیں گے، ہر شعر عقیدت کا ایک شہکار اور عشقِ رسولؐ کا ایک پیکر نظر آئے گا۔ (پروفیسر حافظ محبوب احمد)

☆ شعر گوئی کا ملکہ تو اللہ تعالیٰ نے بے شمار لوگوں کو ودیعت کیا ہے لیکن کچھ دنیا کے حسینوں کے زلف و رخسار میں گم ہو کر رہ گئے اور اپنا سارا زورِ قلم اسی میں صرف کر دیا اور کچھ خوش نصیب وہ ہوئے جنھوں نے زلف و رخسار کی بات کی مگر والضحیٰ سے آغاز کیا تو رخِ مصطفیٰ کی بات کی، واللیل کہہ کر سرکارؐ کی زلفِ عنبریں کی بات کی-- مظہر علی کھٹڑ کو اللہ نے شعر گوئی کا سلیقہ عطا فرمایا تو انھوں نے اپنے فن کو بارگاہِ مصطفیٰؐ میں عقیدت کے سوا کہیں اور استعمال نہ کیا۔ (حافظ محمد عبد الجلیل)

☆ ان کی نعتیہ شاعری سلاست و فصاحت کی منہ بولتی تصویر ہے اور یہ سب ان کے وجدان اور عشقِ رسول کی بدولت ہے۔ آپ کتاب پڑھ کر محسوس کریں گے کہ مظہر کھٹڑ کے خیالات معراج، مدینے کی گلیاں، روضۂ انور، غارِ حرا، اہلِ بیتِ رسولؐ، صحابہ کرام اور خانۂ خدا کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔ مظہر نے بہت ساری نعتوں میں صنعتِ تلمیح کا استعمال کیا ہے جو ان کی شاعری کا وصف ہے۔ (سید محمد ارقام)

اٹک کی تحصیل فتح جنگ کے ایک مضافاتی گاؤں میرہ سے تعلق رکھنے والے مظہر علی کھٹڑ کی یہ عقیدتی و تقدیسی شاعری پاکستان کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی ان کا جس طرح تعارف کرا رہی ہے، وہ قابلِ ذکر ہے اور دعا ہے کہ ان کا یہ روحانی و تخلیقی سفر جاری رہے اور کائناتِ نعت میں ان کا نام نمایاں طور پر نقش ہو جائے۔ آمین۔

☆☆☆☆☆

دیکھ میرا کشمیر

کشمیر کے ایک دُور افتادہ گاؤں ''سلواہ'' سے تعلق رکھنے والے نامور سفرنامہ نگار یعقوب نظامی برطانیہ میں مستقل سکونت اختیار کرنے سے قبل بھی انھیں ہجرت در ہجرت کے مراحل درپیش رہے، مگر ایک عزم، ایک یقین سدا اُن کی مسافرانہ زندگی کا حاصل رہا۔ تخلیقی فعالیت کی مرحلہ وار فکری وفنی استقامت ان کے ادبی سفر کا فخر ہے۔

''پیغمبروں کی سرزمین'' ان کا اوّلین سفرنامہ ہے جو 2001 میں شائع ہوا۔ ازاں بعد ''مصر کا بازار'' اندلس منظر بہ منظر، یورپ یورپ'' ہے - مغرب کی وادیوں میں، برطانیہ سے جاپان، دیکھ میرا کشمیر اور ''رومی کے دیس میں، اشاعت پزیر ہوئے۔ علاوہ ازیں برطانیہ میں آباد ایشیائی تارکینِ وطن کی ہجرت آسا داستان کو ''پاکستان سے انگلستان'' اور انگلستان میرا انگلستان'' کے ناموں سے قلم بند کیا۔ ''جمالِ ہم نشیں'' کے عنوان سے ان کی ایک کتاب منتخب شعرا اور ادبا کے فکر وفن کا تنقیدی مطالعہ ہے۔ پانچ سوانح عمریاں تحریر کیں۔ شخصی مضامین اور انشائیے بھی لکھے۔ یعقوب نظامی کے خاندان کی برطانیہ میں ہجرت اب نصف صدی کے قصے میں ڈھل چکی ہے۔

نظامی صاحب برطانیہ اور پاکستانی ہر دو مقامات پر یکساں محبت اور احترام سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔ ان سے میری نیازمندی کا زمانہ اب تیس برس کی مہکتی دوستانہ بہاروں کی یاد میں لپٹا ہوا ہے۔ مجھے یہ ادبی اعزاز بھی حاصل ہے کہ ان کے ایک سفرنامے ''اندلس۔ منظر بہ منظر'' کا

نثار ترابی

نام میرا تجویز کردہ ہے۔ ان کی محبت بھری یادوں کی یہ بہار اُس وقت اور تر و تازہ ہو جاتی ہے جب اُن سے برطانیہ کے ادبی ماحول میں ملاقات ہوتی ہے یا پھر وہ پاکستان تشریف لاتے ہیں تو مل بیٹھنے کی فضا بنتی ہے۔

ان کے جملہ نثری کام کی تکمیل میں ان کی اہلیہ کا پُر خلوص تعاون انھیں قدم قدم پر میسر رہا، جس کا اعتراف وہ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

میرے بہت سے سفرناموں میں اُن کا ذکر موجود ہے جہاں وہ میرے سنگ سنگ ہوتی ہیں۔ میرے بچے بھی سفر و سفر کے شیدائی ہیں۔ میری بیگم گھر کی حقیقی ملکہ ہیں...... میں نے تو زندگی میں سیر و سیاحت کے مشغلے پال رکھے ہیں...... ایسے میں گھر کے ماحول کو خوشگوار بنانے والی یہی خاتون ہیں...... بیگم نے گھر کے تمام امور نبھائے اور بچوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں بہت ہی بڑا کردار کیا۔ مجھے یہ کہنے میں بالکل ہچکچاہٹ نہیں کہ اگر میری بیگم اپنا کردار ادا نہ کرتیں تو میرے بچے زندگی میں اس قدر کامیاب نہ ہوتے جیسے وہ اب ہیں۔ میری اہلیہ برطانیہ میں پیدا ہوئیں اسی ملک سے تعلیم حاصل کی لیکن سادگی کا یہ عالم ہے کہ اگر میں نہ بتاؤں تو کسی کو علم نہیں ہونے دیتی کہ یہ برطانیہ کے کالج میں پڑھاتی ہے۔ کچھ یہی سبب ہے کہ میں نے اپنے سفرنامہ...... پیغمبروں کی سرزمین...... میں لکھا تھا کہ:

"خوشبوؤں سے مہکتے گھر کی ملکہ شمیم
جس کی مہک کوئی پندرہ سال پہلے
مجھے پاکستان سے انگلستان کھینچ لائی
تھی۔ جب سے میں انگلستان آیا،
شمیم کے گھر میں رہتا ہوں اد وہ
میرے دل میں رہتی ہے۔
مساوات کے انہی اصولوں کے
سبب گھر میں خوشیاں ہی
خوشیاں ہیں۔"

گزشتہ برس وہ اپنے نئے سفرنامے "دیکھ میرا کشمیر" کے ساتھ اسلام آباد تشریف لائے تو اپنے مذکورہ سفرنامے کی ایک جلد کشمیر سے بذریعہ ڈاک عنایت فرمائی۔ زیر نظر اظہار محبت ان کے اسی سفرنامے کی تقریب پزیرائی میں حاصل مطالعہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

برادرم یعقوب نظامی کے تحریر کردہ تازہ سفرنامے کے سرورق کی پیشانی پر سرخ رنگ سے سجے عنوان "دیکھ میرا کشمیر" کے الفاظ پیام اور دعوت کی نیت سے لکھے گئے ہیں۔ دراصل ایک احساسِ تفاخر کا اظہار بھی ہیں۔ گویا مصنف نہ خود منظر پکار رہا ہے کہ "مجھے نظر انداز کر کے تو دکھاؤ!" یہی وجہ

ہے کہ میرے جی میں آیا کہ اس کثیر المعنوی ترکیب میں ایک ''حرفِ ندا'' یا ''فعلِ امر'' شامل ہو جاتا اور عنوان '' آ دیکھ میرا کشمیر'' ہو جاتا تو اس کے مجموعی معنوی تاثر کے حسن کو چار چاند لگ جاتے۔ بہر حال اس اضافے کے بغیر بھی کتاب کا سرورق ہنوز جاذبِ نظر اور دل میں اُتر جانے والا ہے۔ پس ورق پر نظامی صاحب کی دیگر کتب کے عکس ضوریز ہیں۔ میں تو اُن سے اور ان کے کام سے گزشتہ چار دہائیوں سے واقف ہوں، تاہم ایک عام قاری بھی ان کے کثیر المطالعہ، کثیر المشاہدہ اور مستقل تالیف میں شامل رہنے کے وصف سے آگاہ ہو جاتا ہے۔

کتاب کے آغاز میں سورۃ النساء کی آیت نمبر 74 کو اردو ترجمے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے جس میں مظلوموں کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ کشمیر کا نام آئے اور پاکستانیوں اور آزاد ریاست وحکومت جموں وکشمیر کے باسیوں کے دلوں میں مقبوضہ کشمیر کے رہنے والوں کی حالتِ زار کا غم نہ جاگے، یہ بعید از قیاس ہے۔ یعقوب نظامی نے بھی اسی دردِ مشترک کا اظہار کیا ہے۔

ازاں بعد علامہ اقبال کے فارسی کلام سے کاشمیر کا ذکر بطور اقتباس پیش کیا گیا ہے، جو کشمیر کے حسن، اقبال کی فطرت شناسی اور یعقوب نظامی کے حسنِ انتخاب کا مظہر ہے۔

علی الترتیب ابواب سامنے آتے ہیں۔ یہ سفرنامہ 335 صفحات پر مبنی اور 32 ابواب پر مشتمل ہے۔ یعقوب نظامی نے انھیں اپنی سفری یادیں بتایا ہے۔ میری نظر میں سفرنامہ نگاری روز بروز مشکل ہوتی جا رہی ہے۔ نظامی صاحب کے اس سفرنامے کو شائع ہوئے ابھی ایک برس کا عرصہ بھی نہیں ہوا، لہٰذا یہ بھی اس مشکل کا شکار رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ مشکل ہے کیا؟ اس مشکل کو اگر ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو ہم اسے ''امرِ واقعہ'' کہہ سکتے ہیں۔

ازمنہ قدیم سے دنیا بھر میں سفرنامے لکھے جاتے رہے ہیں۔ اردو میں بھی یہ روایت اٹھارھویں صدی سے لمحۂ موجود تک جاری و ساری ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اگلے وقتوں میں زیبِ داستاں کے لیے مبالغہ کرنا، داستانوی انداز اختیار کرنا اور تخیلاتی وارداتوں سے کلام کو مزین کرنا قدرے آسان ہُوا کرتا تھا، لیکن جدیدیت نے جہاں معلومات تک رسائی آسان کی ہے، وہیں قارئین کو کسی بات کی پڑتال کرنے اور مصنف کے بیان کو پرکھ لینے کے قابل بنانے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب بات اپنے وطن کی ہو تو ایسی گنجائش کا ملنا تو ''خیال است ومحال است وجنوں'' ہوتا ہے۔ مزید یہ کہ معلومات کے دیگر ذرائع

کے باعث عوام الناس کو اب دنیا کے ہر حصے کے بارے میں تحریری اور آڈیو ویڈیو پر مشتمل مواد بھی دستیاب ہے۔ جس کے باعث آج کا سفرنامہ نگار زیادہ کٹھن سفر کا راہی ہے۔

زیرِ نظر سفرنامے کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ اس میں مصنف یعنی یعقوب نظامی صاحب ایسے سفرنامہ نگار کی حیثیت سے سامنے آئے ہیں، جو اپنے ہی خطے میں مسافر کی حیثیت سے وارد ہوئے ہیں۔ لہٰذا اس میں نظامی صاحب کا اسلوب اور اس کی تکنیکی ہیئت فقط سفرنامے کی نہیں رہتی، بل کہ یہ معاشرتی علوم کے ایک تحقیقی کام کی اور تذکرہ نویسی کی ایک عمدہ شکل و صورت بھی اختیار کر لیتی ہے۔

سفرنامے کو جو شے دیگر معلوماتی مواد پر ترجیح دیتی ہے وہ مصنف کی علمیت، طرزِ بیاں، اس کی اپنی شخصیت، معاشرے، علاقے اور ماحول کے بارے میں اُس کا اپنا تصور اور بیانیے کا شخصی پہلو ہے۔ مصنف نے ہر ہر باب میں اس سب کا اظہار کچھ اس طرح کیا ہے کہ اب کتاب کا عنوان پھر سے تبدیل کرنے کا خیال آتا ہے۔ میں نے ذاتی طور پر اس کتاب سے جو اخذ کیا ہے وہ یہ ہے کہ گویا یعقوب نظامی بزبانِ حال یہ کہہ رہے ہیں کہ ...... "آ دیکھ میرا کشمیر ......(میری نظر سے)

کشمیر کے جملہ نظر نواز نظاروں کو اسیرِ دید کرنے کے ہر مرحلۂ شوق کے لمحے میں ان کی نظر، طائرانہ نہیں بل کہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر، جذب و احساس کی کیفیات سے ہم آہنگ و ہم صدا ہو کر گزری ہے۔ ان کی نسبی نسبت ایک ایسے قابلِ صد احترام خانوادہ سے ہے، جسے قسّامِ ازل نے علمی و تہذیبی امتیازات سے نوازا ہے، ان کا سارا گھرانا ہی علمی و تہذیبی اعتبار سے صاحبانِ توفیق افراد پر مشتمل گھرانا ہے۔ گویا ان کا اسلوبِ بیان ظاہری آن بان سے زیادہ ادیبانہ شان کا حامل ہے۔ ان کی شخصیت کے دھیمے پن اور شائستہ مزاجی نے انھیں ذاتی رویے کی جو متانت و عاجزی عطا کی ہے وہی ان کی تحریروں کے آئینے میں عکس ریز ہوتی ہے جو قارئین کے لیے لائقِ توجہ ہونے کا اختصاص رکھتی ہے۔ ایک من موہنا، بولتا ہوا، سوچتا ہوا اور دردِ دل کی توفیق سمیٹتا ہوا لب و لہجہ روحِ عصر سے ہم کلام ہوتا ہوا دلوں میں اُترتا چلا جاتا ہے۔

وادیٔ نظیر کاغان سے ہوتے ہوئے جب سفرنامہ نگار، "رتی گلی" کے مقام پر آتا ہے تو اپنے قاری کو پہلے "رتی گلی"، رتی کی سڑک اور رتی گلی کی خیمہ بستی، کے مخصوص ماحول اور آبادیوں سے آگاہ کرنے کے فوراً بعد

ایک ''مظلوم خاندان'' کے ذیلی عنوان سے سجے تذکرے میں، کشمیر کی سیاست کے لیے آئے ہوئے دو میاں بیوی کی، ''تُو تکار'' کی منظر کشی ایسے دل آفریں اسلوب میں کرتا ہے کہ کئی مقامات پر لفظ کے محاوراتی و معنوی استعمال سے بھی پیرایۂ اظہار کو فکری جہت مل جاتی ہے۔

''مثلاً میاں جی کی اپنی عزت جو
بھرے بازار میں داغ دار ہو رہی تھی
اُس کے مقابلے میں سگریٹ کا
دھواں زیادہ خطرناک نہیں تھا، بیچارہ
پہلے یہ دبلا پتلا اور سیاہ رنگت کا تھا
لیکن بیوی کی تبرہ بازی سے اُس کا
چہرہ مزید سیاہ ہو گیا تھا۔ اونچی آواز
سن کر سیاح بھی اُس طرف متوجہ
ہوئے تو دیکھتے ہی دیکھتے کافی ہجوم
جمع ہو گیا۔ کچھ شریف سیاح بیگم
صاحبہ کو سمجھاتے کہ سر بازار لڑائی
جھگڑا اچھا نہیں۔ لیکن۔ محترمہ کا
پارہ۔ رتی گلی کی پہاڑی سے بھی
اونچا تھا۔''

فطرت کے ملکوتی فن وجمال کے دل افروز و روح پرور مناظر سے خود بھی لطف و سرور حاصل کرتے ہیں اور رنگینیٔ نظارہ جاں بخش کی حامل یہ تمنائے بے تاب اپنے قارئین کے دلوں میں بھی جگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''رتی گلی کی ڈھوک'' کے بیان میں ان کے فطرت پسندانہ مزاج کی ایک یہ کیفیت بھی ملاحظہ ہو:

''سنگم کا منظر بہت ہی دلفریب تھا۔
میں چٹان پر بیٹھ گیا۔ ماحول پر مکمل
سکوت طاری تھا۔ ندی کی جھنکار،
بھیڑ بکریوں کے ممیانے کی آوازیں
تھیں یا پھر اللہ میاں کی ہستی تھی کہ
اللہ میاں نے ہر جگہ اپنے ہاتھوں
سے بنائی ہوئی ہے۔ مجھے انسانی عمل
دخل بالکل نظر نہیں آیا۔ ہر چیز فطرت
کے عین مطابق بڑے سلیقے سے اپنی
جگہ پر تھی۔ یہاں بیٹھ کر میں اقبال
کے اس شعر پر غور کرتا رہا''

میری مشاطگی کی کیا ضرورت، حسنِ معنی کو
کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی

....

گویا ''نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی'' یا پھر وہ جو عدیم ہاشمی نے کہا تھا:

تجھے تشبیہ کا دوں میں آسرا کیا
تو خود اک چاند ہے پھر چاند سا کیا

....

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''میں بہت عرصہ بیٹھا فطرت سے
ہم کلام رہا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی
اُٹھا اور ندی کو عبور کر کے خیمہ بستی

جا پہنچا۔"

حب الوطنی کے لازوال فطرتی تقاضوں سے مالا مال یہاں جو "نہ چاہتے ہوئے" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان میں جذبات و احساسات کی وہ شدت و حدت نمایاں ہے جو انھیں اقبال کے اُس فطرت پسند شاعرانہ ذوق سے ہم آہنگ و ہم رشتہ کر رہی ہے جس کی طلبِ صادق نے اقبال سے یہ شعر کہلوایا تھا:

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو
سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر

....

ایک سچے اور حقیقی فن کار کی طرح ان کے ہاں بھی اعترافاتِ عجز و نیاز کے کئی حوالے وقفے وقفے سے قارئین کے دامن میں احترام و حیرت کے پھول کھلاتے چلے جاتے ہیں۔ "حسن کی شہزادیاں" کا عنوان ان سطور سے آغاز ہوتا ہے۔

"میں سیاح ہوں۔ اور سفرنامے لکھتا ہوں۔ میں نے سفرناموں میں حقیقت نگاری کو اپنایا ہے۔ اگر میں افسانوی سفرنامہ نگار ہوتا تو اپنے گھر کے آرام دہ دیوان خانہ میں بیٹھ کر کہانی تخلیق کرتا"

یہاں اس فقرے میں۔ لفظ کہانی اور۔ پھر تخلیق کرتا۔ کے درمیانی الفاظ ہیں، "کچھ اس طرح"۔ یعنی کچھ اس طرح تخلیق کرتا، یہ کہہ کر نظامی صاحب نے افسانہ نگار و سفرنامہ نگار کے طرز اسلوب کے فنی برتاو اور التزام روا رکھتے ہوئے کہانی کی ابتدائی سطور کو بالکل اس طرح رقم کیا ہے جیسے کوئی مشاق اور صاحبِ اسلوب کہانی کار، کسی اساطیری ماحول میں رچی بسی کہانی کا آغاز کرتا ہے۔

"بڑی پرانی بات ہے۔ کشمیر اور شمالی علاقہ جات میں ایک ملکہ نے دو شہزادیوں کو جنم دیا، وغیرہ وغیرہ۔

اربابِ فکر و نظر! آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے نظامی صاحب نے اگر خود کو حقیقت نگار کہا ہے تو سو فیصد نہیں بل کہ دو سو فیصد بجا کہا ہے۔ ان کے حقیقت نگار ادیب و سفرنامہ نگار ہونے کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

"دیکھ میرا کشمیر" کا آخری عنوان: "چلو اب گھر چلیں" جس میں ہماری قومی سیاسی المیے کی طویل، اعصاب شکن اور مرحلہ در مرحلہ پھیلتی بل کہ اپنی ہی طرز کی اولاد پیدا کرتی داستانِ خوں چکاں کو، انھوں نے چند سطری انسان دوستانہ قومی سوچ میں سمیٹ دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"ایشیا میں اہلِ سیاست نے کسی نہ کسی طریقہ سے لاٹھی، گولی اور دولت کو

متعارف کروایا جس سے عام آدمی کا منتخب ہونا ناممکن ہے۔ شخصی حکمرانی کی طرح نسل در نسل حکمران جمہوریت کے نام پر قابض ہوئے جو عرف عام میں ''الیکٹ ایبل'' کہلاتے ہیں۔ یہ وبا کشمیر میں بھی ہے، بل کہ یہاں زیادہ مضبوط ہے۔

ان کے اندازِ تحریر اور اسلوبِ بیان کا مجموعی فنی برتاو انھیں ایک ایسا مرقع نگار بنا کر ہمارے روبرو لاتا ہے جس میں بیانیے کے اوصاف خارجی مظاہر سے گلے ملتے ہوئے داخلی کیفیات کے آئینہ داری کا فرض نبھاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کیفیات میں ایک صوفیانہ دردمندی کی پکار شامل ہے۔ تہذیبی و جغرافیائی آگہی کا وجدان، سیاسی و تاریخی شعور کا ایقان اور علمی و ادبی فیضان، غرض سبھی کچھ زیبِ داستان بن کر، صداقت کی صدا بن کر ہم سب سے داد طلب کرتا ہے۔ ایک جیتی جاگتی متحرک روداد جسے ڈاکٹر سید عبداللہ کے الفاظ میں 'تصویرِ دوراں'' کا نام دیا جانا چاہیے۔

مشاہدات کے حسی امتیازات نے کشمیر اور احوالِ کشمیر کی اس رودادِ حسیں کو تخلیقی تجربے میں ڈھال دیا ہے۔ ایک ایسا تخلیقی تجربہ جس کے ہر رنگ، ہر کیفیت اور ہر مرحلے پر حب الوطنی کے ابد آشنا چراغ اپنی سرمدی روشنیاں بکھیر رہے ہیں۔

سفرنامے کے ص 87 پر ابوالاثر حفیظ جالندھری کی تخلیق کردہ ایک نظم ''تصویرِ کشمیر'' سے اشعار درج کیے گئے ہیں:

معرکہ درپیش ہے جذبات کی تصویر کا
ہو رہا ہے تذکرہ کشمیر میں کشمیر کا

کھینچنا تصویر کا، لانا ہے ہے جوئے شیر کا
رنگ بھر دے اے قلم الفاظ میں تاثیر کا

لُطف جب ہے کہ اٹھے ہر نقش اس تحریر کا
ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا

اگر اربابِ ادب، میری اس رائے کو نری دوست نوازی کا تقاضا خیال نہ فرمائیں تو سچ یہ ہے کہ باقاعدہ شاعر نہ ہوتے بھی، سفرنامہ نگار نے خود کو ایک باقاعدہ شاعرانہ ذوقِ نظر کا حامل سفرنامہ نگار ثابت کیا ہے۔ ان کے قبل ازیں اشاعت پذیر ہونے والے سفری احوال کی طرح اپنے وسیب اپنی مٹی اور اپنے یاروں کی دل ربائیوں اور عقیدتوں سے سجی ان کی سفری یادداشتوں میں بسا ہر نقش، اپنی تحریر کی منہ زبانی بقول حفیظ جالندھری یہ کہہ رہا ہے کہ
''ایک پہلو یہ بھی ہے کشمیر کی تصویر کا''

☆☆☆☆☆

ن-م-راشد کی نظم ''ابولہب کی شادی'' اور عرب معاشرے کی چند ایک تاریخی اور کلچرل جہات

Abstract:

N. M. Rashid is a seminal name in Urdu literature. His pen created marvel after marvel, it should be said. His contribution towards embellishment of Urdu language is absolutely amazing. Rashid's firm grip on the Persian idiom led him to experiment with different forms of artistic expression which still continues to be wonder and delight of literary connoisseur. Not only that, he introduced such a varied and unique panorama of subjects in his literary creation, that it still makes possible to explore new and innovative meanings in his poetic compositions. 'Abu - Lahab ki Shadi'(Marriage of Abu Lahab) is one of the most important and beautifully rendered poems of Rashid Sahib. Abu Lahab is easily one of the most potent and oft quoted metaphors of intransigence, duplicity, craftiness and simple ignorance towards higher climes of intellectual endeavors. Rashid apparently used this poem in its traditional meanings, but the poem has layer upon layer of meaning. In this article, this poem and its essential, integral interpretation has been welded with more persuasive connotations which have been made possible as the world has moved from colonization to a more sophisticated control of Subaltern territories, resources, culture and civilization. The author has gelled tradition with twenty-first century sensibilities, giving the poem a more wholesome treatment which should make readers explore at their end the poem, afresh.

Keywords:

N.M.Rashid, Poem, Abulahab ki Shadi, Ancient Arab Society, Economic Conditions of the Arabs, Cultural Relations, Poetic Style of N.M.Rashid, Pre.Islamic Religious beliefs of the Arabs.

کلیدی الفاظ:

ن-م-راشد، نظم، ابولہب کی شادی، قدیم عرب سماج، عربوں کی اقتصادی صورت حال، تمدنی تعلقات، ثقافتی تعلقات، ن-م-راشد کا شعری اُسلوب، عربوں کے مذہبی عقائد قبل از اسلام۔

ن۔م۔راشد کی نظمیہ شاعری کے تحلیل و تجزیہ سے قبل یہ دیکھنا اور جاننا بھی ضروری ہے کہ آخر قبل از اسلام اور بعثت کے بعد عربوں کا کلچر کیسا تھا۔ قبل از اسلام عربوں کے دوسری اقوام کے ساتھ تمدنی، ثقافتی، اقتصادی اور سماجی تعلقات کس نوعیت کے حامل تھے؟ اور پھر یہ کہ "ابولہب" اور اُس کے خاندان کی روایات کی کیا نوعیت تھی؟ اور قبل از اسلام ابولہب اور اُس کے خاندان کی معاشی اور سماجی حالت کس نوعیت کی حامل تھی؟ یہ بھی دیکھنا اور جاننا ضروری ہے کہ "ابولہب" کا نبیؐ کریم کے ساتھ رویہ کیسا تھا؟ اور "ابولہب کی بیوی اُمّ جمیل کی سوچ کیسی تھی؟ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ ابولہب اور اُس کی بیوی کو اپنے اقتصادی معاملات پر ضرب پڑتی محسوس ہو رہی تھی، جس کی وجہ سے وہ شدید نوعیت کی مخالفت پر اُتر آئے تھے اور اُنھوں نے نبیِؐ کریم کے ساتھ مخاصمانہ رویہ اختیار کرلیا تھا۔ نبیِؐ کریم تو عام لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا رہے تھے۔ اب دیگر سوالات کے جوابات کی جستجو، دو ذرائع سے کی جاسکتی ہے۔ ایک تو زمانۂ جاہلیت کے ادبی سرمایے کو بروئے کار لاکر مذکورہ سوالات کے جوابات تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ دوسرے قرآنِ عظیم کی تعلیمات کی روشنی میں مذکورہ سوالات کے جوابات تلاش کرنے کی سعی کی جاسکتی ہے اور پھر یہ کہ ن۔م۔راشد کی نظمیہ شاعری میں عرب معاشرت، عرب رویے، عرب روایات کو بھی زمانۂ جاہلیت کی شاعری اور اُس شاعری کی روایت کے توسط سے سمجھا جاسکتا ہے اور خاص طور سے "ابولہب کی شادی" کی توضیح و تصریح قرآنِ عظیم کی روشنی میں کرنے کی سعی کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری اپنی کتاب "عربی زبان کا قدیم ادب (ادب الجاہلی) میں لکھتے ہیں:

"جو لوگ جاہلی ادب پر محنت اور وقت صرف کیا کرتے ہیں، جن کا عقیدہ ہے کہ واقعی جاہلی ادب کا ایسا سرمایہ ہمارے پاس موجود ہے جو زمانۂ جاہلیت کی، اُس دور کی جس کا اختتام ظہورِ اسلام پر ہوتا ہے، عربوں کی زندگی کی ترجمانی کرتا ہے۔۔۔ بالفاظِ دیگر یوں کہہ لیجیے کہ جس کی یہ دولت اُس عربوں کی زندگی تک جواب تک لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ تھی۔ یہ لوگ آسانی سے پہنچ سکیں گے۔ وہ عربوں کی زندگی جو زیادہ بیش قیمت، زیادہ واضح تر، زیادہ مفید خلائق اور اُس عربوں کی معاشرتی زندگی کے قطعی متضاد ہوگی جو شعرائے جاہلیت کے اشعار سے ماخوذ ہے۔" (۱)

ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری کی تحقیق و تدقیق اور عمیق مطالعہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت کی شاعری عربوں کی معاشرتی زندگی، رویوں، اقدار، روایات، ذہنی و فکری عمل، علمی ذہنیت اور اعمال و

افعال کی نہ تو نمائندگی کرتا ہے اور نہ ہی عربوں کی زندگی کے متنوع اور مختلف پہلوؤں کی صراحت کرتا ہے بل کہ عربوں کی سماجی، اقتصادی، تمدنی اور ثقافتی زندگی پر اگر روشنی پڑتی ہے تو وہ فقط قرآنِ عظیم ہی واحد اور مستند ذریعہ ہے۔ ایامِ جاہلیت کی تصویر اگر نظر آتی ہے تو وہ فقط قرآنِ عظیم کے ذریعے نظر آتی ہے۔ وہ تصویر اور تصور موجودہ جاہلی ادب میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری ایامِ جاہلیت کی انفرادی یا اجتماعی زندگی سے انکاری نہیں ہیں، لیکن وہ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ جاہلی ادب کو قبل از اسلام کی اجتماعی زندگی کا ترجمان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اُنھوں نے عربوں کی تمدنی، اقتصادی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا تفحص قرآنِ عظیم کی تعلیمات کے وسیلے سے کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری لکھتے ہیں:

> ”میں نے کہا ہے 'قرآن ہی عہدِ جاہلیت کا سچا نقشہ پیش کر سکتا ہے۔' یہ دعویٰ جتنا سُننے میں عجیب و غریب معلوم ہوگا، اسی قدر جلد اس کی بداہت تسلیم کرنا پڑے گی، اگر معمولی تفکر ہی کو کام میں لایا گیا۔ اس لیے کہ یہ مان لینا کہ اہلِ عرب قرآن کی آیتوں کو سُن سُن کر مبہوت اور ازخود رفتہ ہو جاتے تھے، بغیر اس بات کو تسلیم کیے ہوئے، مشکل ہے کہ اہلِ عرب اور قرآن کے درمیان کوئی رشتہ ہوگا اور یہ وہی ربط اور رشتہ ہے جو فنی کمال اور ان لوگوں کے درمیان پایا جاتا ہے جو اسے سُن کر یا دیکھ کر ازخود رفتہ ہو جاتے تھے یا یہ مان لینا کہ اہلِ عرب قرآن کا مقابلہ کرتے، اس پر چوٹیں کرتے اور اس بارے میں پیغمبرِ اسلام سے جھگڑتے تھے، آسان نہیں ہے جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ عربوں کی نظروں سے وہ حقائق اور رموز پوشیدہ نہ تھے جو قرآن پیش کر رہا تھا۔“ (۲)

اب یہاں ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری نے زمانۂ جاہلیت کی عرب زندگی کو موضوع بنایا ہے اور عربوں کی علمی مفلوک الحالی کو واضح کیا ہے اور اُن کے رویوں کو بھی مترشح کیا ہے کہ وہ کس طرح کی ذہنیت کے حامل تھے۔ ظاہر ہے کہ ابولہب بھی اُسی سماج کا ایک فرد اور سردار تھا، وہ بھی اپنے ذاتی مفادات کو عزیز جانتا تھا اور اُس نے بھی نبیِ کریم کے ساتھ مخاصمانہ رویہ اور انداز اپنائے رکھا، جس کی شہادت قرآنِ عظیم کی ایک سورۃ سے عیاں ہے۔ ابولہب کی بیوی کی بھی ذہنی حالت اس سے چنداں مختلف نہ تھی۔ وہ بھی اُسی سماج کی ہی پیداوار تھی۔ ابولہب اور اُس کی بیوی بُت پرستی کے عقائد کے پیروکار تھے۔ قرآنِ عظیم نے بُت پرستی کے عقائد کی نہ صرف تردید کی بلکہ اُن پر کاری ضرب بھی لگائی۔ ایسے سماجی پس منظر میں ابولہب اپنے عقائد پر قائم رہتے ہوئے نبیِ کریم کی مخالفت پر نہ صرف ڈٹا رہا

بلکہ ابولہب اور خاص طور سے اُس کی بیوی ایذا رسانیوں پر اُتر آئی۔ ابولہب کی بیوی نے نبیؐ کریم کو طرح طرح سے اذیت پہنچانے میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی، جن ایذا رسانی کی جانب ن۔م۔ راشد کی نظم ''ابولہب کی شادی'' میں بھی کنایتاً روشنی پڑتی ہے، ظاہر ہے کہ ایک شاعر اشارے کنایے کا استعمال ایک ادبی صنعت کے طور پر ہی کرتا ہے، ن۔م۔راشد نے بھی ادبی صنعتوں کو بروئے کار لا کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ قبل از بعثتِ نبویؐ کے عرب معاشرے کے ضمن میں ڈاکٹر طہٰ حسین المصری لکھتے ہیں:

''قرآن میں بُت پرستی کے اُن عقائد کی تردید ہے جو جزیرۃ العرب میں رائج تھے، اس میں یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں اور دہریوں کے عقیدوں کی بھی تردید ہے، جن سے ملکِ عرب کو سابقہ رہتا تھا۔ قرآن صرف فلسطین کے یہودیوں، روم کے عیسایوں اور ایران کے آتش پرستوں نیز جزیرے کے بے دینوں کی تردید نہیں کرتا ہے، وہ اُن عرب کے فرقوں کی تردید کرتا ہے جو بلادِ عرب میں اپنے وجود کا وزن رکھتے تھے اور اگر یہ نہ ہوتا تو قرآن کی یہ قیمت اور یہ اہمیت نہ پیدا ہو پاتی اور اس کی تائید کرنے والوں یا اس کا مقابلہ کرنے والوں میں سے ایک بھی اتنی توجہ نہ کرتا اور اس کی تائید اور تردید کوئی بھی جان اور مال کی ایسی ایسی قربانیاں پیش نہ کرتا۔''(۳)

اب یہاں ایک نتیجہ تو یہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ قبل از اسلام اور بعثتِ نبویؐ کے بعد وہ تمام قبیلے مقابلے پر اُتر آئے، جنھیں راہِ ہدایت کی جانب لانے کے لیے نبیؐ کریم نے اللہ کا پیغام پہنچایا، جس کو بھی اُس کی بے راہ روی جتلائی گئی، وہ قبیلہ مقابلے کی ٹھان پر مقابلے پر اُتر آیا۔ وہ مقابلے و مجادلے معمولی نوعیت کے نہیں ہوتے تھے، جس کا جہاں تک زور اور بس چلا، اُس نے اپنے سیاسی اور اجتماعی اقتدار کی پوری پوری قوت اور طاقت کا شدّت کے ساتھ استعمال بھی کیا اور مقابلہ بھی۔ اسی طرح ابولہب اور اُس کی بیوی اور اُس کے قبیلے نے بھی نبیؐ کریم کے ساتھ مقابلے کی ٹھان لی اور وہ ایذا رسانیوں پر اُتر آئے۔ ابولہب کو اپنی سرداری چلی جانے کا خوف دامن گیر تھا اور وہ مقابلے پر اُتر آیا۔ یہی وہ پس منظر ہے، جو ن۔م۔ راشد کی نظم ''ابولہب کی شادی'' کے بین السطور محسوس ہوتا ہے۔ باقی تو شاعر کا کرشمہ ہے اور دیگر شاعری کے حربے ہیں، جن کا استعمال ن۔م۔ راشد نے اپنی نظم ''ابولہب کی شادی'' میں کیا ہے اور ہر دور کے 'سٹیٹس کو' یعنی جاریہ صورتِ حال کو بیچ چوراہے بھانڈا پھوڑا ہے۔ نظم کے عنوان میں قولِ محال کی صنعت کا استعمال کیا گیا ہے، بظاہر تو خوشی اور مسرت کا موقع ہے مگر بباطن اندوہناکی و کرب والم کی کیفیت ہے جو مذکورہ نظم کے

استعاروں کو ڈیسائفر کرنے سے مترشح ہوتی ہے۔ اب اِک نظر ظہورِ اسلام کے وقت اور اس کے بعد کی صورتِ حال پر ڈال لیتے ہیں۔ وہ اس لیے کہ ابولہب بھی قریش کے سرداروں میں شامل ایک سردار تھا۔ قریش کے بُت پرستوں نے نبیِ کریم کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ قریش کے بُت پرستوں نے رسولؐ اللہ کو مکّہ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا اور اُنؐ کے خلاف ایک لمبے عرصے تک مصروفِ پیکار رہے اور نبی کریم کے صحابہ کو بھی ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہودیوں نے اپنی جگہ فساد برپا کیے اور نبیِ کریم کے ساتھ یہودیوں نے عقلی جنگ شروع کر دی، جس کی اختتام بھی جنگ پر ہوا۔ مکّہ میں بُت پرستی کا ماحول تھا اور مدینہ میں یہودیوں کی ریشہ دوانیاں تھیں ۔ عیسائی نجران وغیرہ تھے، لہٰذا عیسائیوں نے مقابلہ کی اس طرح سے نہیں ٹھانی، جس طرح سے بُت پرستوں اور یہودیوں نے ٹھانی تھی۔ ایسی صورت حال میں ابولہب بھی نبیؐ کریم کے ساتھ مقابلے پہ اُتر آیا تھا اور اُس کی بیوی نے بھی ایذا رسانیوں میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ ایسی عرب زندگی اور تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھ کر ن۔ م۔ راشد کی نظم ”ابولہب کی شادی“ کا تحلیل و تجزیہ ایک الگ نوعیت کا حامل ہو سکتا ہے اور تاریخ عرب کے ایک باب کو ادب کے ساتھ منسلک کر کے نئے معانی و مفاہیم منظرِ عام پر لائے جا سکتے ہیں اور زیرِ نظر آرٹیکل میں ایسی ہی ایک کاوش کی گئی ہے۔ عربوں کی زندگی کا ایک پہلو جسے زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک نظر اُس عرب زندگی پر بھی ڈالی جا سکتی ہے، جہاں عربوں کی سماجی زندگی کو بے بنیاد، کھوکھلی اور مذہبی احساس سے عاری دکھایا ہے اور یہ جاننے کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ کیا حقیقت میں بھی ایسا ہی ہے؟ یا پھر عربوں کی اس زندگی کی حقیقی تصویر زمانۂ جاہلیت کی شاعری میں جس طرح پیش کی گئی ہے۔ کہیں اُس سے ہٹ کر تو نہیں ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین المصری لکھتے ہیں:

”ہمارے پاس جاہلیت کے اشعار کا جو ذخیرہ موجود ہے، اُس سے عربوں کی ایک ایسی زندگی کا پتا چلتا ہے جو خاموش، سماجی احساس سے عاری، اقدار سے بے نام، مذہب سے بے گانہ اور مذہبی احساس سے مکمل طور پر یا تقریباً نابلد اور بے تعلق اور دینی جذبات سے پرے جو انسانی نفوس اور اُن کی عملی زندگی پر حاوی ہوا کرتے ہیں۔ یکسر خالی ہے۔ ورنہ امراء القیس، طرفہ اور عنترہ کی شاعری میں یہ جذبہ کیوں نظر نہیں آتا؟ کیا یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ جاہلیت کے اشعار اپنے زمانے کی مذہبی زندگی کی عکاسی عاجز ہیں؟۔“ (۴)

محولہ بالا اقتباس سے پتا چلتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کی شاعری سطحی نوعیت کی حامل ہونے کے ساتھ ساتھ حقائق سے زیادہ متخیلہ پر مبنی ہے۔ اپنے عہد کی معاصر زندگی کی ترجمان بھی ہے اور روحِ عصر سے بھی عاری ہے۔ اب اس کا پتا کیسے لگایا جا سکتا ہے کہ زمانہ جاہلیت کا سماج کیسا تھا۔ اس عہد کے لوگوں کے مذہبی احساسات اور جذبات کس نوعیت کے تھے؟ اس سوال کا جواب قرآنِ عظیم سے ہی ملتا ہے، جہاں قرآنِ عظیم عربوں کی اُس طاقت ور مذہبی زندگی کو منصہ شہود پر لاتا ہے جو اپنے قبیلے کے لوگوں سے چیخ چیخ کر کہتی ہے کہ آؤ! ہمارے ساتھ مل کر اسلام کے خلاف صف آرائی کرو! اور جب یہ صف آرائی بے اثر ثابت ہوتی ہے تو عربوں کی مذہبی زندگی مکروفریب پر انھیں مجبور کرتی ہے، پھر وہ عرب ظلم کی جانب پیش قدمی کرتے ہیں اور آخر میں ایسی جنگ کا اعلان کر دیتے ہیں جو نہ کچھ باقی رکھے نہ کچھ چھوڑے۔ ابولہب جو قریش کے سرداروں میں سے ایک سردار تھا۔ وہ بھی اپنے قبیلے کے اُن لوگوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑتے نظر آیا، وہ لوگ جو توحید کی جانب متوجہ ہوئے۔ قریشِ مکہ قطعی طور پر پکے مذہبی تھے، ظاہر ہے کہ اُن کا عقیدہ بُت پرستی تھا۔ اسی لیے ابولہب نے اسلام کی مخالفت کی اور اُس کی بیوی نے نبیِ کریم کے ساتھ مخاصمت اور ایذا رسانی کے حربے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور پھر ابولہب کی بیوی پر اللہ کی پھٹکار پڑی۔ ایسے تاریخی اور سماجی پس منظر میں ن۔ م۔ راشد کی نظم ''ابولہب کی شادی'' اور بھی معنی آفریں ہو جاتی ہے۔

ن۔ م۔ راشد کی نظمیہ شاعری میں قدیم عرب معاشرت، انسانی معاملات، عرب روایات، عربوں کے رویوں اور دیگر ممالک کے ساتھ تمدنی، تجارتی اور ثقافتی تعلقات کو تو براہ راست یا علامتی و استعاراتی طور پر موضوع نہیں بنایا گیا، لیکن اس کے باوجود عرب معاشرہ دیگر دُنیا کے معاشروں سے لاتعلق بھی نہیں تھا۔ قدیم زمانے میں عربوں کے موجودہ ہندوستان کے قدیم علاقہ ملیبار کے دراوڑوں کے ساتھ تجارتی اور تمدنی تعلقات کا بھی پتا چلتا ہے۔ ایامِ قدیم میں عرب ملیبار کے ساحلی علاقوں میں تجارتی اغراض و مقاصد سے آتے جاتے رہے ہیں، جس سے بات صاف ہو جاتی ہے کہ عرب معاشرے بُت پرستی کی وجہ سے کُفر پر قائم تھے مگر اُن کے دُنیا کی دیگر اقوام کے ساتھ تجارتی و تمدنی مراسم قائم تھے۔ اس جہت یعنی عربوں کے دیگر دُنیا کے ساتھ تجارتی اور تمدنی مراسم اور لین دین پر حکیم سید شمس اللہ قادری کی کتاب ''ملیبار سے عربوں کے تعلقات'' کے ذریعے روشنی پڑتی ہے۔ اگرچہ عرب اپنے عقائد کے اعتبار سے بُت پرست تھے مگر قدیم عربوں کے دُنیا کے مختلف خطوں اور علاقوں کے لوگوں کے ساتھ

تجارتی و تمدنی تعلقات تو تھے۔ اس ضمن میں حکیم شمس اللہ قادری کی کتاب سے رجوع کرنے سے بعض حقائق کا پتا چلتا ہے:

''سکندر کبیر کے خروج سے صدیوں پہلے ملیبار میں عربوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی تھی۔ ملیبار کی پیداوار خلیج فارس کی راہ سے سب سے پہلے عرب کے جنوبی ساحل پر پہنچتی تھی، پھر یہاں سے عربوں کے کارواں یمن و حجاز سے گزرتے ہوئے اُن اجناس کو شام میں تدمور اور مصر میں اسکندریہ تک پہنچاتے تھے۔ یورپ کے تجار ان مقامات سے اس سامان کو حاصل کر کے اپنی تجارت گاہوں میں داخل کیا کرتے تھے۔ غرضے کہ قدیم زمانہ میں ہندوستان اور یونان و روم کے مابین جو تجارت ہوا کرتی تھی۔ اُس کا توسط عرب اور اُن کے بعد مصر و شام کے باشندے تھے۔ عرب میں ملیبار کی تجارت کا مرکز مدینہ ظفار تھا جو حضر موت کے ساحل پر واقع ہے اور یہاں کے تُجّار بلا واسطہ ملیبار سے تجارت کیا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر میں اور اس کے اطراف ملیبار کے اکثر درخت اب بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً نارجیل، فلفل اور تنبول وغیرہ۔ عہدِ عتیق کے مقدس صحیفوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے زمانہ میں بنی اسرائیل نے بھی ملیبار سے تجارتی تعلقات پیدا کیے تھے۔ چناں چہ ملوک اور ایام کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ اپنے عہدِ حکومت میں دو بحری مہمیں اوفیر اور ترسیس کو روانہ کیا کرتے تھے۔ مقصد اُن کا یہ تھا کہ وہاں سے سونا، چاندی، صندل کی لکڑی، ہاتھی دانت، مور اور بندر لائیں۔ ترسیس کی مہم تین برس کے عرصے میں واپس ہوا کرتی تھی۔ یہ طریقہ بنی اسرائیل میں حضرت سلیمانؑ کے بعد بھی یہوسفط کے زمانہ تک جاری تھا اور خود یہوسفط نے بھی ایک مہم دس جہازوں کی ترسیس اور افیر کی جانب روانہ کرنے کے لیے تیار کی تھی، لیکن قبل اس کے کہ بندرگاہ سے روانہ ہوتی، ایک طوفان کے باعث تباہ و برباد ہو گئی۔'' (۵)

محولہ بالا طویل اقتباس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قدیم عربوں کے ہندوستان کے قدیم علاقہ ملیبار کے ساتھ تجارتی اور اقتصادی تعلقات قائم تھے اور عرب ملیبار کے لوگوں سے لین دین کیا کرتے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ عرب اپنے مذہبی عقائد میں پسماندہ ضرور تھے مگر اپنے اقتصادی معاملات میں پسماندہ بالکل نہیں کہے جا سکتے۔ وہ اپنے مالی مفادات کے حصول کو نہ صرف یقینی بناتے تھے بل کہ اپنے اقتصادی مفادات کو محفوظ بھی بناتے تھے۔ بنی اسرائیل بھی قدیم دور میں عرب علاقوں میں ہی آباد تھے اور اُن کے بھی ملیبار کے لوگوں کے ساتھ اقتصادی

تعلقات قائم تھے۔ اب اس طرح کے شواہد کی روشنی میں جب ہم "ابولہب" اور اُس کی موروثی و خاندانی صورتِ حال پر ایک لمحے کے لیے تدبر و تفکر سے کام لیتے ہیں تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ "ابولہب" بھی اپنی سرداری و حکمرانی کے ساتھ ساتھ اپنے اقتصادی مفادات اور معاملات کے متعلق بہت حساس تھا اور یہی وجہ ہے کہ اُس نے نبیِ کریم کے ساتھ مخاصمت اور آویزش کی راہ اختیار کی اور اُس کی بیوی اُمِ جمیل نے بھی ابولہب کی اندھی تقلید کی اور نہ صرف وہ اپنے کُفر کے عقیدے پر ڈٹ کر کھڑے رہے بلکہ اُنھوں نے نبیِ کریم کو اپنی ایذا رسانیوں کا بھی نشانہ بنایا۔ اس طرح کے تاریخی پس منظر سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے جب بعثتِ نبوی کے بعد قدیم بُت پرستی کی جاریہ صورت حال پر ضرب پڑی تو ابولہب کو اپنی سرداری کے چھن جانے اور اقتصادی اور مالی مفادات پر کاری ضرب پڑتی ہوئی محسوس ہوئی تو اُس نے اپنے ذاتی خوف و خطر کی بنا پر نبیِ کریم کے ساتھ مقابلے کی ٹھان لی۔ ابولہب صراطِ مستقیم اور رشد و ہدایت کا راستہ اختیار کرنے کے بجائے کُفر کے عقیدے پر قائم و دائم رہا، وہ اِس لیے بھی کہ اُس کے دل پر گمراہی کی مہر لگی ہوئی تھی، مگر وہ اپنے اقتصادی اور مالی فائدے سے ذرہ برابر بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ابولہب اور اُس کی بیوی عذابِ الٰہی سے بچ نہ سکے۔ اس طرح کے اقتصادی، ثقافتی اور تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اور مذہبی عقائد کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ن۔ م۔ راشد کی نظم "ابولہب کی شادی" کا گہرائی و گیرائی کے ساتھ تحلیل و تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور تعبیرِ نَو سے کام لیا جا سکتا ہے۔

ہم مسلمانوں کی جو مذہبی روایت ہے اس میں "ابولہب" ایک "وِلن" (Antagonist) ٹھہرتا ہے اور ابولہب کی بیوی بھی ایذا رسانی میں کم نہیں تھی چناں چہ شدت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ابولہب کے بے نسب ہونے اور بے جڑ ہونے کی شہادت قرآنِ عظیم نے ایک سورۃ کے ذریعے دی۔ "تبت یدا" اور آنحضرتؐ ان کے ہاں حضرت فاطمہ کی شکل میں بیٹی تو تھیں جو حضرت خدیجہ کے بطن سے تھیں، لیکن آپ کے بیٹے اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، تو کفارِ مکہ جن میں ابولہب، ابو جہل، اطبا اور دوسرے وہ آنحضرتؐ کو طعنہ دیتے تھے کہ آپؐ (نعوذ باللہ) بے نشاں اور بے جڑ ہیں کہ آپؐ کی اولادِ نرینہ نہیں ہے۔ یہ آنحضرت محمدؐ سے جو منسوب کیا جاتا ہے کہ ابولہب کی ایذا رسانی کے باعث آنحضرت محمدؐ نے اسے بد دعا دی تھی اور پھر اس کا بیٹا مر گیا تھا۔ یہ ایک نہایت ضعیف روایت ہے اور اس کا ابطال ہو چکا ہے۔ آنحضرت محمدؐ

آپ کی سیرت اور کردار کا بہت بڑا وصف یہ ہے کہ آپؐ رحمتہ اللعالمین ہیں جو لوگ آپؐ کو ایذا پہنچاتے تھے، جن لوگوں نے آپ کو شعب ابی طالب میں محصور رکھا تھا۔ انھوں نے ان لوگوں کو بھی بد دعا نہیں دی۔ طائف کے لوگوں نے جب آپؐ پر پتھر برسائے اور آپؐ کو زخمی کیا۔ ایک فرشتہ نازل ہوا کہ اگر آپؐ کہیں تو ان کی زمین کو پلٹا دیا جائے تو آپؐ نے فرمایا کہ نہیں عین ممکن ہے کہ ان کی آنے والی نسلوں میں کوئی راہِ راست پر آ جائے۔ جن کا لقب ہی رحمتہ اللعالمین اور جنھوں نے ساری زندگی ہی خیر و برکت کے لیے اعمال و افعال سرانجام دیے ہوں تو یہ روایت انتہائی ضعیف ہے کہ انھوں نے ابوجہل کو بد دعا دی تھی۔ ابولہب کے بیٹے کا مرجانا خدائی فیصلہ تھا۔ ابولہب کی ایک اکلوتی نرینہ اولاد یعنی اس کا بیٹے کا مارا جانا اور پھر ابولہب عمر کے اس حصے میں تھا، جہاں مزید اولاد پیدا کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں تھی۔ وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا۔ کہولت کی عمر کی پہنچ چکا تھا۔

ن۔ م۔ راشد کی نظم "ابولہب کی شادی" کے سیاق و تناظر میں مغنی تبسم اور شہریار کچھ اس انداز سے رقم طراز ہیں:

> "ن۔ م۔ راشد کی نظم "ابولہب کی شادی" میں قدیم عربوں کے مذہبی عقائد کا عمل دخل تو ہے ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کا تعلق اُس تاریخی پس منظر سے بھی ہے جس میں عرب قبائل اپنی قبائلی طاقت اور سرداری میں بھی جکڑے ہوئے تھے اور نئے نظام سے وہ اپنے لیے خطرہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ کہیں اُن کی سرداری نہ چلی جائے۔" (۹)

لہٰذا وہ لاولد دنیا سے چلا گیا۔ اب یہاں دو چیزیں پیشِ نظر ہیں۔ وہ کہ یہ ن م راشد کو بہ حیثیت شاعر ابولہب کی شادی میں دل چسپی کیوں ہے؟ یہاں پر ابولہب کا وہ جو ولن والا کردار ہے، وہ کردار ن م راشد کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ پھر ایک یہ بات بھی پیشِ نظر ہے کہ عربوں کے ہاں شادی جو ہے، وہ اس نوعیت کا ایک واقعہ نہیں ہوتا تھا جیسے ہمارے ہاں ہوتا ہے کہ ایک شادی کی اور ساری زندگی اسی شادی کے حصار یا جلو میں گزار دی۔ عربوں کے ہاں تو شادی کپڑے بدلنے والا معاملہ تھا کہ ایک شادی، دو شادی، چار شادیاں، دس شادیاں اور پھر جی چاہا تو اور شادی کر لی۔ یہ اسلام نے آکر چار کی تحدید کی۔ لیکن پھر اس کا بھی انھوں نے توڑ نکالا کہ ایک کو طلاق دے کر ایک اور کر لی۔ عربوں کے ہاں کثرتِ ازدواج (Polygamy) ایک معمول کا معاملہ تھا اور عربوں کے ہاں شادی کی Celebration کوئی ایسا انوکھا واقعہ نہیں تھا۔ Celebrate وہ ضرور کرتے تھے، لیکن چوں کہ پے در پے وہ شادیاں کرتے تھے، ظاہر ہے کہ عورتوں کے لیے بھی تحدید نہیں تھی، عورتیں بھی زیادہ شادیاں

کرتی تھیں، سو، شادی عربوں کی زندگی میں کوئی ایسا بڑا اور انوکھا واقعہ نہیں ہوتا تھا۔ پھر ابولہب کی شادی اور ابولہب کی اس دُلھن کی شادی، جس سے منسوب کیا گیا ہے کہ وہ گلے میں سانپ حمائل کر کے لائی اور سر پر ایندھن اٹھا کر لائی۔ اس طرح کے واقعہ میں کیا خاص بات ہے کہ راشد جیسے ایک بڑی سطح کے شاعر کو اس طرح کے واقعہ نے نظم لکھنے پر مجبور کیا۔ کیا یہ وہی ابولہب ہے۔ غالباً مرادی معنوں میں تو ابولہب ایک ہی ہے، کوئی دوسرا ابولہب نہیں ہے اور ابولہب کی دلھن بھی وہی ہے جو آنحضرتؐ اور صحابہ اکرام کو ایذا پہنچانے میں پیش پیش رہتی تھی۔ ن م راشد جس طرح پرانے زمانوں، اور گئے وقتوں سے اپنے تہذیبی آثار اٹھاتے ہیں۔ راشد نے ابولہب اور اس کی دُلھن کو اپنی مذکورہ نظم کے لیے منتخب کیا ہے، یہ نظم بنیادی طور پر نہ اس ابولہب کی مذمت میں ہے، نہ اس کی حمایت میں ہے۔ یہ ایک کردار اس (شاعر) نے اٹھایا ہے اور یہ کردار عرب تہذیب کا ایک نمائندہ کردار ہے اور ابولہب کی بیوی بھی عرب تہذیب کی نمائندگی کرنے والا ایک کردار ہے۔ یہ وہ ایک Particular مخصوص ابولہب نہیں ہے۔ جس ابولہب کی مذمت بھی آئی ہے اور وہ ابولہب جو آنحضرت محمدؐ کا چچا واقع ہوا تھا۔ یہ ابولہب ایک استعارے کے طور پر آیا ہے اور اس کی بیوی بھی ایک استعارے کے طور پر آئی ہے۔ وہ استعارہ کیا ہے؟

استعارہ یہ ہے کہ ابولہب کی شادی جو ابو سفیان کی بہن کے ساتھ ہوئی تھی۔ ابوسفیان بھی سردار مکہ میں سے ایک تھا اور عربوں کے ہاں لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کا کرنا اور انسانی اعضا کی بے حرمتی کرنا، یہ ایک طرزِ حیات یعنی ایک Way of life تھا۔ بعد میں ایسا کربلا بھی کیا گیا کہ شہدائے کربلا کے زخمی اور لہولہو جسم تھے۔ ان کے اوپر سے گھوڑے دوڑا کر ان کی جسدِ پاک کی بے حُرمتی کی گئی۔ عربوں کے ہاں یہ ایذا پسندی اور ایذا رسانی کی روایت بہت پرانی ہے۔ حتیٰ کہ حضرت حمزہؓ جب جنگ احد میں شہید ہوئے، چوں کہ حضرت حمزہؓ نے ابوسفیان کی بیوی ہندہ کے بھائی اور اس کے باپ کو جنگِ بدر میں قتل کیا تھا اور ہندہ نے قسم اٹھائی تھی، چناں چہ اس نے ایک حبشی غلام کی ڈیوٹی لگائی تھی۔

جس نے بے خبری میں آ کر حضرت امیر حمزہ کو نیزا گھونپا اور اس کے بعد ہندہ نے جنگ ختم ہونے کے بعد حضرت امیر حمزہؓ کی لاش تلاش کر کے ان کا سینہ چاک کر کے، ان کا کلیجہ نکال کر چبایا تھا۔ یہ ان کے ہاں اذیت پسندی کی ایک پرانی روایت تھی اور بھی، وہ بہت قسم اٹھاتے تھے کہ ''میں قسم اٹھاتا ہوں فلاں بت کی'' اگر میری یہ منت پوری ہو گئی تو میں اپنے دشمن کی آنکھیں نکال کر چبا جاؤں گا۔ اس طرح کی اذیت پسندی، ان

کے ہاں Way of life تھا- یہاں ’’ابولہب‘‘ وہ خاص ’’ابولہب‘‘ نہیں ہے- جیسے ہم عام زندگی میں کسی آدمی کی حرکتوں کی وجہ سے کہتے ہیں تو بڑا شیطان ہے- تو اس سے مراد ابلیس فی الذات نہیں ہوتا، اس کا کرداری اور صفاتی پہلو سامنے ہوتا ہے- جس کو ہم منسوب کر دیتے ہیں یا یہ ہے کہ کسی کی بہت زیادہ ستائش مقصود ہو تو کہتے ہیں کہ تم تو بھئی بہت بڑے استاد ہو! یہاں ’’ابولہب‘‘ ایک استعاراتی انداز میں آیا ہے- اس کی بیوی Metaphoric انداز میں آئی ہے- ایک یہ ہے کہ ابولہب کی وہ شادی جو ابوسفیان کی بہن سے ہوئی تھی، وہ اس قدر یا اتنی اذیت ناک عورت تھی کہ اس نے شادی کی شرط یہ رکھی تھی کہ میں اپنی شادی میں کوئی بناؤ سنگھار نہیں کروں گی- کوئی عروسی جوڑا نہیں پہنوں گی بلکہ میں سانپوں کی مالا گلے میں حمائل کر کے حجلۂ عروسی میں جاؤں گی اور سر پر دوشالا وغیرہ کے بجائے میں سر پر لکڑیوں کا ایک گٹھا لے کر جاؤں گی، وہ لکڑیاں جن کے سروں پر آگ سلگ رہی ہوگی-

اس نے یہ اہتمام کیا تھا کہ پہلے ہی روز اپنے شوہر کے اوپر اس کا رعب، دہشت پڑ جائے اور شوہر اس کو دلھن کے بجائے کسی بلا کے طور پر قبول کرلے اور شوہر ہمیشہ اس کا اطاعت گزار رہے اور آیندہ کی زندگی میں اس کے راستے میں مزاحم نہ ہو- وہی روایت آگے یہ بتاتی ہے کہ ابولہب جب حجلۂ عروسی میں داخل ہوا اور اس نے اپنی دلھن کا یہ روپ دیکھا اور ابولہب ننگے پاؤں حجلۂ عروسی سے بھاگ گیا تھا کیوں کہ وہ بھاگ گیا تھا لہٰذا شرمساری کے سبب اس نے اپنے قبیلے کو اور اپنی بستی والوں کو کیا منہ دکھانا تھا کہ تم اپنی دُلھن (Manage) نہیں کر پائے- عرب دنیا میں تو ایک بہت بڑی شرمندگی کی بات تھی کہ عورت اپنے شوہر کو پہلی رات ہی بھگا دے یا اس کو خوف زدہ کر دے تو اپنی شرمندگی کے مارے وہ گھوڑے کو ایڑ لگا کر روپوش ہو گیا اور جب روپوش ہو گیا تو پھر وہ کہیں شام میں، ایک روایت کے مطابق وہ کہیں یمن میں چلا گیا- وہاں بھیس بدل کر اور اپنی عرفیت اور اپنی شناخت چھپا کر وہاں وہ تجارت کرنے لگا- اس طرح اس نے وہاں خوب مال کمایا- جب خوب مال کمایا تو پھر وہ مال کمانے کے بعد نو، دس برس کے بعد اس نے سوچا کہ اب لوگ اس واقعہ کو بھول بھال گئے ہوں گے- تو وہ اپنے مال و دولت کے ساتھ کنیزوں اور غلاموں کے ساتھ جب واپس لوٹا تو اس کی پہچان یا شناخت میں کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا- لوگوں نے اس کے رنگ روپ، حلیے اور ناک نقشے سے پہچان لیا جب وہ ایک پورے جلوس کی شکل میں آ رہا تھا کہا جاتا ہے کہ وہ تیس اونٹوں پر اپنا مال اسباب لایا تھا- کچھ اس میں لوٹ

کھسوٹ کا سامان تھا اور کچھ اس میں مالِ تجارت تھا۔ تیس اونٹوں پر اس کا سامان لدھا ہوا تھا۔ تو وہ ایک بڑی شان و شوکت کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایسے میں مجمع میں سے کوئی ایک آواز ابھری کہ تم وہی ابولہب ہو جو حجلۂ عروسی میں سے بھاگ گئے تھے جس کی دُلھن اپنے ساتھ سامانِ مشاطگی کے بجائے، اپنے گلے میں سانپ حمائل کر کے اور سر پر جلتی ہوئی لکڑیوں کی آگ سجا کر لائی تھی۔ تم وہی ابولہب ہو۔ اب ابولہب نے جو وہ سارا جتن کیا تھا، اپنی شناخت چھپانے کا اور اس وقت تو وہ مکے میں ایک تاجر کے طور پر واپس آیا تھا۔ وہ بنو ہاشم کی عرفیت کے حوالے سے نہیں آیا تھا۔ اس نے تو اپنا نام بھی بدل لیا تھا، لیکن پہچانا گیا، جب پہچانا گیا تو اس طرح نظم کی جو Punch لائن ہے کہ جیسے ہی مجمعے سے یہ پکار بلند ہوئی کہ تم وہی ابولہب ہو، جس کی دُلھن شب زفاف میں اپنے گلے میں سانپ حمائل کر کے اور اپنے سر پر سلگتی، جلتی ہوئی لکڑیاں باندھ کر لائی تھی۔ تم وہی ہو، تو ابولہب نے یہ سنتے ہی اپنے گھوڑے کو ایڑ ھ لگا دی اور الٹے قدموں واپس بھاگ گیا۔ اپنا سارا ساز و سامان چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گیا۔

یہ تو اس نظم کا واقعاتی معاملہ ہے۔ اس نظم کا Massage کیا ہے؟ اب یہاں تبلیغ کے معنوں میں بالکل بھی مراد نہیں ہے بلکہ شاعر اپنی شاعری کے ذریعے اپنے قاری تک ترسیل کیا کرنا چاہتا ہے؟ اب ''ابولہب'' کو اس سیاق و سباق سے نکال کر دیکھنا پڑے گا جو ہم مسلمانوں کے ذہن و فکر میں ابولہب کا ایک مخصوص کردار ہے۔ آنحضرتؐ کے چچا ہونے کا اور آنحضرت محمدؐ کو ایذا پہنچانے والے شخص اور ایک متشدد شخص کا۔

اس سیاق و تناظر میں سلیم احمد لکھتے ہیں:

''ابولہب قدیم عرب سماج اور زمانۂ جاہلیت کا ایک علامتی اور استعاراتی کردار ہے اور ابولہب کی بیوی بھی قدیم عرب سماج کی نمائندہ کردار ہے، جب ابولہب سال ہا سال کے بعد واپس آتا ہے تو وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اب لوگ اُس کے بھاگ جانے والے واقعہ کو بھول بھال گئے ہوں گے مگر جیسے ہی سال ہا سال کے بعد ابولہب پلٹ کر واپس آتا ہے تو لوگ اُسے فوراً پہچان لیتے ہیں۔ عربوں کا حافظہ غیر معمولی اور اُن کی یادداشت بے مثال اس لیے بھی ہے کہ وہ صحرائی علاقوں میں بود و باش کی وجہ سے اشیا اور لوگوں کو بھولتے نہیں تھے، یہی وجہ ہے کہ ابولہب جب اپنی بیوی کی بدہیئتی کی وجہ سے گھر سے بھاگ گیا تھا تو واپسی پر عرب لوگوں نے آناً فاناً پہچان لیا تھا۔ ابولہب نے بہروپ تو نیا تبدیل کیا مگر پھر بھی اپنی پہچان نہ چھپا سکا۔ گویا بہروپ بدلنے سے ایک کردار کی اصلیت نہیں بدلتی۔''(۷)

یہ ابولہب عرب کے اس جاہلیہ معاشرے کا

ایک نمائندہ کردار ہے۔ ابولہب کی جو دلھن ہے، وہ بھی اس عرب جاہلیہ معاشرے کا ایک نمائندہ کردار ہے اور وہاں پر جو واقعات کا سلسلہ ہے۔ وہ سامنے کی بات ہے جو روایات ابولہب کے متعلق منسوب یا معروف ہیں تو اب یہاں ابولہب وہ ابولہب نہیں ہے جو آنحضرت محمدؐ کے چچا کی عرفیت سے مخصوص ہے۔ یہ ابولہب ایک سیکولر کردار ہے اور یہ ابولہب ایک واقعہ کی وجہ سے جو کہ اس کے شبِ عروسی کا واقعہ ہے اور جہاں سے وہ ننگے پاؤں فرار ہوا، اپنی دلھن کی ہیئت کذائی یا دہشت کو دیکھ کر، اور پھر اس کی مراجعت ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اب نئے حلیے میں جا کر وہاں شہر میں اپنی بود و باش اختیار کر لے گا۔ تو اس نئے حلیے میں بھی اس پہچان یا شناخت ہوگئی اور اس کو ننگے پاؤں پھر واپس بھاگنا پڑا اور اس طرح اس کی ساری کمائی دھری کی دھری رہ گئی۔ اس کا سارا ڈراما دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اب اس صورت حال کو ذرا انسانوں پر منطبق کر کے دیکھا جائے کہ خود انسان کی Inning کیا ہے؟ انسان کتنے بہروپ بدلتا ہے۔ اس کا روپ کوئی ہوتا ہے۔ وہ بہروپ کوئی اور بدلتا ہے یا بدلے ہوتا ہے اور جب اس کے بہروپ کا پردہ چاک ہوتا ہے تو پھر انسان اسی مقامِ آغاز پر آ کھڑا ہوتا ہے، جہاں سے اس نے اپنا سلسلہ شروع کیا ہوتا ہے۔ اس دنیا میں انسان کا آنا اور یہاں سے چلے جانا۔ یہ بھی اس کردار کی مماثلت ہے

اور اس کو ذرا اور بڑے پیمانے پر لے لیا جائے تو ابولہب جو ہے، وہ معاشرے یا زندگی کا بھی ایک استعارہ ہے۔ سلطنت کا بھی ایک استعارہ ہے وہ جو قرآن مجید میں اللہ کا فرمان ہے کہ **کل من علیھا فان**۔ کہ دنیا میں ہر چیز فنا ہونے والی ہے۔ تو پھر ابولہب کو منطبق کر لیا جائے، بڑی بڑی عالی شان سلطنتوں پر، بڑے بڑے عالی شان حکمرانوں پر اور اس کی دلھن کو منطبق کر لیا جائے، وہ جو دربار کے اندر سازشیں ہوتی ہیں۔ اب یہاں دربار کی اصطلاح محدود مفاہیم میں استعمال نہیں کی گئی۔ یہاں دربار کی اصطلاح کو وسیع مفاہیم میں لیا جائے گا۔ بقول شاعر:

میں سازشوں میں گھرا اک یتیم شہزادہ
یہیں کہیں کوئی خنجر مری تلاش میں ہے

....

تو یہ تو محلاتی دروبست ہے۔ یہ جو زندگی کی ناپائیداری ہے کہ زندگی کی للک میں، زندگی کی ہوس میں ہم اپنا اصل روپ اور اصل کردار فراموش کر دیتے ہیں اور ہم روپ بدل کر، روپوشی اختیار کر کے ایک نئے روپ اور مال و منال کے ساتھ جس میں ہمارے گناہ و ثواب کا ملبہ بھی شامل ہے۔ جب آتے ہیں تو کوئی ایک صاحبِ کردار، کوئی ایک صاحب عرفان بھرے مجمعے میں انگلی اٹھا کے ہماری اصلیت ہمیں یاد دلا دیتا ہے۔ ہماری پہچان ہمیں کروا دیتا ہے اور ہم پھر وہ مال و منال، وہ شان و شوکت جو ہم

نے حالتِ روپوشی میں اکٹھی کی ہوتی ہے اور اپنی اصل شناخت کو گم کرنے کے لیے جو بہروپ بدلے ہوتے ہیں۔ ان کا جب پردہ چاک ہوتا ہے تو ہم پھر وہی اس زیرو اسکائر پر آن کھڑے ہوتے ہیں۔ تو ''ابولہب کی شادی''، تنہا دو افراد کی شادی کا معاملہ نہیں ہے، تنہا دو کرداروں کی شادی کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کو ذرا زندگی کے پہیے کے اوپر، زندگی کے سائیکل کے اوپر، ادلتے بدلتے انقلابوں کے اوپر، نقشہ پلٹتی ہوئی صورت حال کے اوپر کہ جہاں تخت سے تختہ ہوتے اور جہاں بالادست کو زیردست ہوتے، دیر نہیں لگتی۔ ''ابولہب کی شادی'' کے ذریعے شاعر ایک بڑے موضوع کو Rediscover کر کے ہمیں شاعری کی زبان میں سمجھاتا ہے کہ بھیس بدلنے والا، جہاں موجود ہوتا ہے، وہاں اس کے بھید کا پردہ چاک کرنے والی انگلی بھی موجود ہوتی ہے اور پھر جب انسان کا بھرم کھل جائے، پردہ فاش ہو جائے تو پھر انسان کو گھوڑے کو ایڑھ لگا کر دوبارہ وہیں جانا پڑتا ہے، جہاں سے بہروپ بدلا ہوتا ہے۔

ن-م- راشد کے اُسلوب کے ضمن میں صفدر میر لکھتے ہیں:

''ن-م-راشد ایک لمبے عرصے تک ایران میں مقیم رہے۔ وہاں اُنھوں نے اُس دور کے جدید فارسی گو شعرا کا نہایت عمق کے ساتھ مطالعہ بھی کیا اور ایران میں قیام پذیر ہونے کے باعث بھی اُن کی زبان پر فارسی تراکیب، فارسی زبان کے محاورہ اور روزمرہ کا اثر نہایت گہرا ہے۔ وہ ایک پختہ کار نظم نگار ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ فارسی کے الفاظ وتراکیب کو اس ہنرمندی اور تخلیقی سلیقے سے بروئے کار لاتے ہیں کہ اُن کے اُسلوب بیان پر فارسی کے نہایت گہرے اثرات بھی قاری کو بوجھل پن کا احساس نہیں ہونے دیتے۔''(۸)

ن-م- راشد کی زبان فارسی آمیز ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ تخلیقی، دلکش اور جاذبیت کی حامل ہے۔ ادبی اظہار پر اُن کی قدرت تو نہایت اعلیٰ ہے ہی، لیکن نظم کے آغاز میں ہی حیرت و استعجاب اپنی جگہ موجود محسوس ہوتی ہے بلکہ نظر آتی ہے۔ اس نظم میں راشد کا طرزِ بیان بہت خوب صورت اور فارسی آمیز ہے مگر مقامی الفاظ کا استعمال بھی نہایت خلاقانہ انداز سے کیا ہے۔ راشد کو وہ فن آتا ہے، جسے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا فن کہتے ہیں۔ ساری نظم کی بُنت اور دروبست استعاراتی و علاماتی ہے۔ شاعر کہیں بھی کمنٹ نہیں کرتا، یہ شاعر کا بنیادی وظیفہ یا منصب یا وصف یا کام ہے بھی نہیں۔ مسرت کے موقع پر ماتم کا عالم۔ بظاہر اس طرح کی فضا قائم کی گئی ہے مگر نہایت گہرے معنی پیدا کیے گئے ہیں جو راشد ہی کے شعری ہنر کی معجز بیانی کہا جائے تو بہتر ہوگا۔ اس نظم کی تکنیک بھی

راشد کی دیگر نظموں سے جداگانہ نوعیت کی حامل ہے اور اس نظم کے مصرعوں میں دریا کی سی روانی اپنی جگہ لائقِ داد و تحسین ہے اور نظم کا علامتی و استعاراتی انداز بھی تخلیق کار کی عمیق نظری اور تہ داری کا غماز ہے۔ نظم ''ابولہب کی شادی'' میں جس بحر کا انتخاب کیا گیا ہے، اُس کے ارکان اپنے بطون میں بے پناہ روانی رکھتے ہیں۔ شاعر کہیں بھی عجزِ بیان کا شکار نظر نہیں آتا۔ مصرعوں کی در و بست نہایت عمدہ ہے اور خیال کو نہایت سہولت کے ساتھ تخلیق کے قالب میں ڈھالا گیا ہے۔ کہیں کہیں ابہام کو بھی تکنیک کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔ اب اِس نظم میں بحر کے ارکان 'مفاعلاتن مفاعلاتن' خیال کی روانی کے مطابق زیادہ یا کم کیے گئے ہیں۔ ''ابولہب کی شادی'' ایک مختلف نوعیت کا حامل موضوع ہے، جس میں شاعر کے متخیلہ کا کمال تو ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ استعارات و علامات کے ذریعے پرت در پرت معانی، اور گہرائی اور گیرائی بھی پیدا کی گئی ہے۔ اس نظم کی علامات اور استعارات ایک طرف تو تاریخ میں بہا لے جاتے ہیں تو دوسری جانب عرب کلچر اور عرب تہذیب، رسوم و رواج، معتقدات اور عرب روایات کے مفاہیم کو بھی واضح کرتے ہیں یا کم از کم اُن کی ایک جھلک ضرور دکھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ شاعر کوئی مورخ تو ہے نہیں اور نہ ہی وہ کوئی سماجی تاریخ لکھ رہا ہے۔ وہ تو اپنے مشاہدہ، تخلیقی جوہر، مطالعہ اور متخیلہ کے ذریعے اندھی طاقت کے نشے میں دُھت ایک کردار کے ظاہر اور باطن کی کشمکش کو موضوع بنا رہا ہے۔ راشد نے اس نظم میں موضوع تو الگ تھلگ منتخب کیا ہی ہے مگر تکنیک بھی اپنی دیگر نظموں سے ہٹ کر استعمال کی ہے۔ 'ابولہب' کے ضمن میں جو روایات ہیں، لہب کے معنی ایک Handsome man کے ہیں اور اُس کے والد حضرت مطلب بھی بہت زیادہ Handsome and beautiful ہونے کا استعارہ تھے۔ اسی طرح اُمِ جمیل جو اس کی بیوی تھی، وہ بھی اپنی جگہ پر ایک بہت خوب صورت عورت تھی، لیکن روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے ہی ہوا تھا اور ابولہب کی بیوی اسی طرح So-called آراستہ پیراستہ ہو کر آئی تھی، جس کی جانب راشد نے اپنی نظم میں واضح تلازمات اور کنایوں کے ذریعے بیان کر دیا ہے۔ نظم پڑھنے کے بعد ایک سوال اُبھرتا ہے کہ جو ہوا سو ہوا۔ وہ ایک تاریخی حقیقت ہے، اس میں ایک تلمیح پیش کی گئی ہے، یہ تو اپنی جگہ ہے، لیکن اِس بات کے کیا معنی ہوئے کہ ابولہب سال ہا سال کی ریاضت کے بعد مال و دولت کما کر، سال ہا سال کی تجارت اور جو بھی

معاملات ہیں، اُس کے بعد بھیس بدل کر دوبارہ مراجعت کرتا ہے، مگر پھر بھی پہچان لیا جاتا ہے کہ یہ وہی 'ابولہب' ہے۔ اس کی ایک توجیح تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ن۔ م۔ راشد کے مذہبی نظریات کچھ اور ہیں۔ وہ مذہبی آدمی تو نہیں تھے۔ بہر حال ابولہب قدیم عرب روایات پر فخر کا استعارہ ہے، ابولہب، اسلام دشمنی کا استعارہ ہے۔ ابولہب، استعارہ ہے لوبھ کا، ابولہب استعارہ ہے مال ومنال کا، ابولہب استعارہ ہے، طاقت کا۔ تاریخ کے اوراق اُلٹیے تو کیا خلافتِ راشدہ کے فوراً بعد خاص طور سے بنواُمیہ کے دور میں کیا ہمیں وہی نظام As a matter of State policy نظر نہیں آتا!۔ کس طریقے سے حضرت عثمان غنی کی شہادت کے بعد انتشار اور افراتفری کی صورتِ حال پیدا ہوئی یا پیدا کی گئی اور پھر اس کے بعد جو کچھ شام میں ہوا، اور کیا گیا، پھر عمر بن العاص نے جو کچھ مصر میں کیا اور جس طریقے سے وہ قدیم عرب سائیکی کے ساتھ کھیلا اور اُس سے سیاسی فائدہ اُٹھایا، اور پھر بنو اُمیہ نے جو کچھ کیا۔ کس طریقے سے خلافت کو ملوکیت میں، بادشاہت میں چینج کیا۔ بادشاہت اپنی اصل میں یہی سب کچھ تو ہے کہ کوئی بھی بادشاہت کی مخالفت نہ کرے اور بادشاہ جو چاہے، کرے اور جو آگ کی بات ہے اور جو سانپوں کا ہار ہے، اور سر پر جو ایندھن، آگ ہے، استعاراتی طور پر یوں لگتا ہے، وہ جو ریاست کی ذمے داری ہے، جس میں ذمے داری پرسنل (ذاتی) بنیادوں پر ہے، اُس میں مذہب کا کچھ لینا دینا نہیں ہے۔ اس میں مذہب آپ کی پولیسی کو گائیڈ نہیں کر رہا بلکہ باوصف آپ کے، آپ کا ذہن، آپ کا ادراک، آپ کے مفادات، آپ کی منصوبہ بندی، (planning)، آپ کی کرافٹ، وہ آپ کو گائیڈ کر رہی ہے اور جو گلے میں سانپ ہیں، وہ تو سیدھی سی بات ہے کہ وہ تو مال و دولت ہے جو قیامت کے دن بھی انسان کے سامنے لائی جائے گی کہ اس مال کے لیے تم لوگوں پر ظلم کیا کرتے تھے اور بھاگے پھرتے تھے اور دین کو چھوڑ کر ان چیزوں کے پیچھے بھاگتے پھرتے تھے۔ راشد کی اس نظم کے اس کردار یعنی 'ابولہب' کو بنو اُمیہ سے بھی جوڑا جا سکتا ہے کیوں کہ ابولہب دولت، طاقت اور عقل و دانش کا استعارہ ہے۔ نبیؐ پاک کی مخالفت بھی وہ اس وجہ سے کیا کرتا تھا کہ میں عربوں میں بہت زیادہ عقل مند اور حکمت رکھنے والا ہوں۔ وہ کہا کرتا تھا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ میں دوبارہ اُٹھایا جاؤں؟ وہ اپنی عقل و خرد کو اپنا بینچ مارک بناتا تھا۔ بنو اُمیہ نے بھی اسلامک فلاسفی اور اسلامی اخلاقیاتی سسٹم کے بجائے، اپنی عقل و خرد، اپنے مفادات اور اپنی دلچسپیوں کو بینچ مارک بنایا تھا۔ سانپ تو اس دُنیا کے مال و دولت

کی علامت ہیں جو انسان کو ڈسے گا۔ وہ ایک الگ استعارہ ہے، سانپ کسی نہ کسی طریقے سے زندگی میں بھی ڈسے گا اور بروز قیامت بھی ڈسے گا، اولاد کے حوالے سے ڈسے گا، مال کی صورت میں ڈسے گا، بیماری کے حوالے سے ڈسے گا۔ یہ دیکھیے کہ 'ابولہب' کی موت کیسے اور کس طرح سے ہوئی تھی؟ 'ابولہب' کو مارا جاتا ہے۔ اُس کے سر پر چوٹ لگتی ہے۔ وہ زخمی ہو جاتا ہے۔ اُس کا زخم اُس کے پورے جسم میں ناسور بن کر پھیل جاتا ہے۔ اُس کے پورے جسم سے بدبُو آتی ہے۔ سامنے کی بات ہے، اسی طرح وہ انتہائی بھیانک موت مارا گیا تھا، سانپ اسی دُنیا میں ڈستے ہیں اور قیامت میں تو ڈسیں گے ہی ۔ 'ابولہب' ایک جان دار اور Relevant موضوع ہے۔ فلسفیانہ حوالے سے انسان کی جو Urge ہے کہ میں I should be master of my whole اور میری جو تصنع اور بناوٹ ہے، مصنوعی پن ہے، اور میری جو خود غرضی ہے، بس وہ قائم دائم رہے، مجھ پر کسی قسم کی اخلاقی یا فلسفیانہ یا کوئی پولیٹیکل، سوشل، کلچرل، پابندی نہ ہو۔ اس کی مخالفت کی جا سکتی ہے۔ اسے غلط کہا جا سکتا ہے، لیکن ہم سب کسی نہ کسی سطح پر یہی خواہشیں یا نظریات رکھتے ہیں۔ معروضی صورت حال تو یہی ہے۔ اب موجودہ تناظر میں ''سر پہ ایندھن'' کی ایک نئی تعبیر A.I کے حوالے سے بھی کی جا سکتی ہے۔ وہ اس لیے کہ A.I خالصتاً انسانی چیز ہے۔ اے۔ آئی سراسر انسانی ایجاد ہے اور وہ نا معلوم کو یا Unimaginable کو ایک حقیقت (Reality) بنا کر پیش کرنے پر قادر ہے ۔ 'ابولہب' کو عرب شاعری میں کس طرح دیکھا گیا ہے یا عرب شاعری میں کس انداز سے موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ بھی ایک استفہام اور استفسار اپنی جگہ موجود ہے۔ ابولہب پر کسی نہ کسی حوالے سے عرب شاعری میں بات تو ضرور ہوئی ہوگی۔ ابولہب پر کہیں نہ کہیں کوئی تو بات ہوئی ہوگی، کسی نہ کسی دور میں کسی نہ کسی پیمانے سے کچھ نہ کچھ تو لکھا گیا ہوگا کیوں کہ 'ابولہب' بہت بڑا استعارہ ہے، جس کا انجام بہت ہی بُرا ہوا۔ ایک مخصوص وقت اور تناظر میں وہ بہت بڑی شخصیت تو تھی ہی، لیکن استعاراتی طور پر وہ آج بھی Relevant ہے۔ اسے 'اوپریسر' کی کسی نہ کسی شکل میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ 'اوپریسر' کی بھی متعدد شکلیں ہیں۔ ایک تو ٹریڈیشنل اوپریسر ہے۔ اپنی اصل میں تو 'اوپریسر' طاقت کے حصول کا ہی آرزو مند ہے۔ پیسہ، دولت یا مال تو اُس کے حصول کا لازمی حصہ ہے ہی، مگر وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟ وہ اپنے مال و دولت اور طاقت کی قوت سے لوگوں کی Memory کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ کیا

یہی چیز آج کی دُنیا میں بھی قابلِ عمل نہیں ہے؟ ہمیں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ صرف ہمارے جیسے ملک میں ہی نہیں، اسلامی دُنیا میں ہی نہیں، پوری دُنیا میں ایسا ہی ہے۔ مثلاً سوویت یونین کے انہدام اور ٹوٹنے کے بعد یورپین ممالک میں جو ایسٹ جرمنی تھا، وہاں پر یہی ٹیلی ویژن اور جرمنی کی جو ایجادات تھیں اور کمفرٹس تھے، اور وہاں کا جو لائف اسٹائل (طرزِ حیات)، تھا۔ وہ کئی ایک لحاظ سے ایسٹ جرمنی کے لوگوں کے لیے بہت بڑی انسپائرز تھے کہ وہ They should join with the best. تبھی تو اکتوبر 1990 میں مغربی جرمنی اور مشرقی جرمنی کا اتحاد ممکن ہوا تھا۔ ایسٹرن جرمنی پر روس نے قبضہ کر لیا تھا، ہٹلر کے بعد ویسٹ جرمنی پہ امریکہ اور یوروپین قوتوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اس طرح انھوں نے علاقے بانٹ لیے تھے۔ متحارب قوتوں نے اپنے اپنے حصے میں آنے والے علاقوں پر قبضے کر لیے تھے اور وہاں کے لوگوں کی کوئی خاص حیثیت نہ رہی تھی، ایسٹ جرمنی کی تو حیثیت بالکل بھی کچھ نہ رہی تھی۔ ویسٹ جرمنی کی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں رہی تھی۔ یہ الگ نوعیت کا موضوع ہے۔ راشد کی نظم 'ابولہب کی شادی' ایک بھرپور اور الگ نوعیت کے مضمون کی متقاضی ہے۔ اس نظم کی زبان فارسی آمیز اس لیے بھی ہے کہ اس نسل کی ذہنی ولسانی ساخت پرداخت جس عہد اور ماحول میں ہوئی تھی۔ اس عہد میں علمی روایت بہت مضبوط و مستحکم تھی۔ راشد کی ذہنی پرداخت Upbringing جس ماحول میں ہوئی تھی، وہاں فارسی اور عربی زبانیں بہت زیادہ اہمیت کی حامل تھیں اور مذکورہ زبانیں سکولوں، مدرسوں میں پڑھائی جاتی تھیں۔ سکولوں میں عربی، فارسی زبانیں سکھائی اور پڑھائی جاتی تھیں۔ مسلم گھرانوں میں عربی اور فارسی کتابیں سکھائی جاتی تھیں اور ہر پڑھا لکھا بندہ فارسی کے اشعار 'کوٹ' کرنے پہ قادر تھا۔ راشد کی نظم 'ابولہب کی شادی' کے ذریعے عرب تاریخ، عرب کلچر کا تو پتا چلتا ہی ہے کہ بظاہر اپنے وقت کے ایک بڑے کردار کا کس قدر خوف ناک، اذیت ناک اور بھیانک انجام ہوا۔ یہاں اس نظم کے عمیق مطالعہ کے ذریعے تاریخ سے عبرت پکڑنے کی بھی ایک بات سمجھ میں بہرحال ضرور آتی ہے۔

☆☆☆☆☆

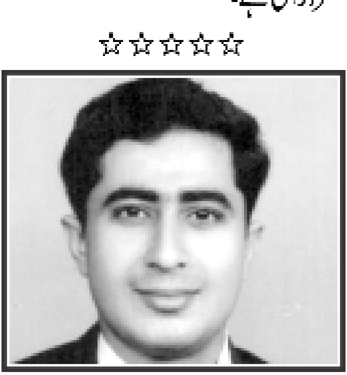

نبیل احمد نبیل

تاجدار عادل اور نیلام گھر

ریاض ندیم نیازی

کچھ لوگوں کی صلاحیت اُن کی پہچان بن جاتی ہے، کچھ لوگوں کا فن اور ہنر اُن کے کام آتا ہے، یہ بات سو فی صد درست ہے، کیوں کہ جب ہم کسی شعر کو پسند کرتے ہیں پھر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شعر کس شاعر کا ہے تو اُس شاعر کی قدر ہماری نظر میں بڑھ جاتی ہے۔ ہم پہلے کسی فن کو بہ غور دیکھتے ہیں اور جب ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ فن فلاں فن کار کا ہے تو ہمارے دل میں اُس فن کار کی محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اِسی تناظر میں اگر ہم مشہور زمانہ ٹیلی ویژن پروگرام سٹیج شو ''نیلام گھر'' کو دیکھیں تو ہمارے ذہن میں فوراً طارق عزیز کا نام اُبھرتا ہے جو اِس پروگرام کے میزبان تھے، مگر پی ٹی وی کراچی سینٹر سے 15 سال تک مسلسل چلنے اور پاکستان سطح پر ایک نیا ریکارڈ قائم کرنے والے اِس پروگرام کو پروڈیوس کرنے والا کون تھا؟ جس کی فن کاری اور ہنر مندی سے اِس پروگرام نے جہاں طارق عزیز کو عالمی شہرت بخشی اور ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ جی ہاں! اِس ہنر مندی کے پیچھے پاکستان کے مایہ ناز پروڈیوسر جناب تاجدار عادل تھے جن کی اَن تھک محنت، کوشش و جستجو اور تدابیر و افکار نے عملی جامہ اختیار کیا اور پاکستان ٹیلی ویژن سینٹر کراچی کے پلیٹ فارم کے کریڈٹ میں یہ پروگرام آیا۔ اِس کے علاوہ متعدد ڈرامہ سیریل بھی جناب تاجدار عادل کے کریڈٹ میں ہیں جن کو آج تک ٹیلی ویژن کے سامعین اپنے ذہنوں پر نقش اور آنکھوں میں سمائے ہوئے ہیں۔ جناب تاجدار عادل نے پاکستان ٹیلی ویژن سینٹر کراچی کا جہاں وقار بلند کیا وہاں اپنے کارہائے نمایاں سے اُس کی عزت و عظمت میں چار چاند لگا دیے، یہی وجہ ہے کہ وہ پروڈیوسر کے عہدے سے ترقی پا کر جنرل منیجر کے اعلیٰ منصب پر فائز ہوئے اور باعزت طور پر اِسی اعلیٰ عہدے سے سبک دوش ہوئے۔ راقم الحروف (ریاض ندیم نیازی) اُن دنوں بھی (جب نیلام گھر اپنے عروج پر تھا اور طارق عزیز نے بہ حیثیت شاعر اپنے پنجابی مجموعہ کلام ''ہمزاد دا دکھ'' کی اشاعت کا اعلان اپنے اِسی معروف پروگرام نیلام گھر میں کیا تھا)، جناب تاجدار عادل کے والد محترم جناب صبا اکبر آبادی سے ملاقات کرنے اُن کے دولت کدے پر حاضر ہوتا تھا اور صبا صاحب سے جہاں شرفِ ملاقات حاصل ہوتا اور اُن کی شفقت اور دعائیں ملتی تھیں وہاں وہ مجھے پروگرام نیلام گھر میں شمولیت کے لیے ''پاس'' بھی عطا کرتے تھے اور پروگرام میں شرکت کرنے کی ہدایت بھی۔ جناب صبا اکبر آبادی جہاں ایک عظیم شاعر تھے وہاں ایک عظیم انسان

کے روپ میں بھی ہمارے سامنے ہیں۔ جناب تاجدار عادل بھی راقم سے نہایت محبت سے پیش آتے تھے اور اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے ہوئے شفقت فرماتے تھے اور وہ تعلق آج بھی برقرار ہے۔ صبا صاحب نے بھی راقم الحروف کو ہمیشہ اپنے بیٹوں کی طرح سمجھا اور پیار دیا۔ میں مرتے دم تک جناب صبا اکبرآبادی اور جناب تاجدار عادل کی محبتوں اور عنایتوں کو مقروض رہوں گا۔

جناب تاجدار عادل کی شہرت کا ایک پہلو تو پاکستان ٹیلی ویژن کراچی سینٹر کی ملازمت اور پروگرام منیجر کے اعلیٰ عہدے پر کام کرنا ہے، مگر اُن کی ادبی حیثیت قائم کرنے میں اُن کی شاعرانہ ہنرمندی کا بڑا دخل ہے۔ تاجدار عادل غزل کے شاعر ہیں اور قدرت نے اُنھیں فنِ شاعری ودیعت کیا ہے اور اُن میں یہ خوبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ میں اُن کی شاعرانہ عظمت کو سلام پیش کرتا ہوں کیوں کہ اُن کی شاعری میں جہاں خیال کی ندرت، فکر کی گہرائی اور سوچ کی گیرائی ملتی ہے وہاں تخیل کی بلند پروازی اور مضمون و فکر آفرینی بھی مکمل توانائی کے ساتھ نظر آتی ہے۔ میں نے جناب تاجدار عادل کو مشاعروں میں بھی سنا ہے اور بھرپور داد پاتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ اُن کا ایک شعری مجموعہ ''مات ہونے تک'' منظرِ عام پر آیا ہے۔ غزل کے انتخاب اُن کی غزلیات کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔

تاج دار عادل غزل گوئی کی کلاسیکی روایت کے امین ہیں۔ اپنے والدِ گرامی کی طرح اُنھوں نے بھی نام نہاد جدت پسندی کا راستہ اختیار نہیں کیا۔ ساری زندگی میڈیا سے وابستگی کے باوجود شعری حلقوں میں مقام بنانے کے لیے وہ راستے نہیں چنے جو آج کے بعض لکھاری چُن لیتے ہیں۔ اُنھیں اپنے لفظوں، اپنے تصورات و خیالات اور اپنے پختہ اسلوب پر اعتبار و اعتماد ہے۔ کیوں نہ ہو آخر اُنھیں برصغیر کے ایک ممتاز علمی و ادبی گھرانے سے تعلق کی سند حاصل ہے۔

تاجدار عادل کی ایک اور بڑائی جس کا ذکر عام طور پر نہیں ہُوا یہ ہے کہ اُن کے زیرِ سایہ اُردو دُنیا کے سیکڑوں اہلِ قلم نے اپنی کاوشوں کا صلہ پایا۔ وہ ہمیشہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرتے رہے اور اُنھیں آگے بڑھانے کی فکر میں رہے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ بلاشبہ عصرِ موجود میں مُحسنِ ادب ہیں۔

میں یہ بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر جناب تاجدار عادل اپنی شاعری کی طرف زیادہ توجہ دیتے اور ملازمت سے سبک دوشی کے بعد کل وقتی شاعری کرتے تو وہ بڑے بڑے غزل گو شعرا کے لیے خطرہ ثابت ہوتے اور آج اُن کا نام پاکستان کے نمائندہ غزل گو شعرا میں سرِفہرست نظر آتا۔ تاج دار عادل وہ شاعر ہیں کہ جنھوں نے اپنے شعری مجموعے ''مات ہونے تک'' کے پیش لفظ میں یہ جملہ واضح طور پر لکھا کہ ''مجھے فخر ہے کہ اُس (صبا اکبر آبادی) کا بیٹا ہوں کہ جن کو ایک لاکھ سے زائد اشعار کہنے کا اعزاز حاصل ہے۔

☆☆☆☆☆

آفاق میں گونجی ہے مری شعلہ نوائی

شاعری نعمتِ خداوندی میں ایسی خداداد صلاحیت ہے جس کے لیے جتنا بھی اللہ کا شکر ادا کیا جائے کم ہے۔ شاعر جب شعر کہنے کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے تو اس کا تخیل زمین کی پہنائیوں سے لے کے آسمان کی بلندیوں تک محوِ پرواز ہوتا ہے وہ اپنی ذات سے لے کر آسمان کی وسعتوں کو اپنی سوچ کے پیمانے سے ناپ رہا ہوتا ہے۔ اسی لیے شاعری کو معلوم سے نامعلوم اور نامعلوم سے معلوم کے درمیانی سفر سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اپنی ذات کو پہچاننے کی کوشش اصل میں ان انسانی اوصاف کی کھوج ہے جو انسان کے زمین پر آنے کی وجہ ہے۔ کوئی بھی انسان جب اس نہج پر جا کر غور و غوض کے دریاؤں میں اترتا ہے تو وہ اپنے آپ پر منکشف ہونا شروع ہو جاتا ہے اسی انکشاف کا دوسرا نام درویشی ہے۔ مرے خیال میں یہ ساری باتیں جو اوپر میں نے کی ہیں وہ ساغر صدیقی کی شخصیت اور ان کی شاعری پر سو فی صد درست آتی ہیں۔ ساغر صدیقی کی شاعری کا یہ پہلو ان کی شاعری کا بنیادی عنصر ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ پہلے ان کی زندگی کے حوالے سے چند باتیں کر لی جائیں۔

ساغر صدیقی 1928 کو بھارت کے شہر انبالہ میں پیدا ہوئے۔ جب انھوں نے شعور کی آنکھ کھولی تو اپنے آپ کو غربت و افلاس کی آتش میں جلتے دیکھا۔ ان کی تقریباً ساری زندگی اسی غریبی اور تنگ دستی میں گزر گئی۔ بچپن میں اپنے محلے کے ایک بزرگ حسن حبیب سے کچھ لکھنا پڑھنا سیکھا لیکن اپنے گھریلو حالات کی وجہ سے یہ سلسلہ جاری نہ رکھ سکے اور بہتر مستقبل کے لیے انبالہ کو چھوڑ کر امرتسر آ گئے اور ایک دکان پر ملازمت کر لی۔ ساغر صدیقی جس دکان پر کام کرتے تھے اس کا مالک لکڑیوں کے کنگھے بنا

عرفان صادق

کر فروخت کرتا تھا ساغر نے بھی یہ کام سیکھ لیا وہ سارا دن لکڑیوں کے کنگھے بناتے اور رات کو اسی دکان کے ایک کونے میں سو جاتے۔

شاعروں کے بارے ایک بات کہی جاتی ہے کہ شاعر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ساغر صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے شاعر پیدا کیا تھا اسی لیے وہ چودہ سال کی عمر ہی میں شعر کہنے لگے۔ ابتدا میں ناصر مجازی کے نام سے شعر کہے لیکن جلد ہی ساغر صدیقی کے قلمی نام سے شعر کہنے لگے اور اسی نام سے ان کی شہرت ہونے لگی۔ انھیں دنوں امرتسر میں ایک بہت بڑے مشاعرے کا انعقاد ہوا جس میں لاہور سے بھی کافی شعرا نے شرکت کی۔ مشاعرے کے منتظمین میں سے کسی نے ساغر صدیقی کا نام شاعروں کی لسٹ میں شامل کر دیا۔ مشاعرے میں ساغر صدیقی نے اپنا کلام ترنم سے پیش کیا۔ جب ان کے اشعار ان کی آواز کے سوز و گداز میں ڈھل کر سامعین کے سماعتوں تک پہنچے تو ہر جانب سے واہ واہ کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ جتنی داد اس مشاعرے میں ساغر کے حصے میں آئی اتنی کسی اور شاعر کو نہیں ملی۔ یوں کہہ لیں کہ وہ مشاعرہ ساغر صدیقی نے لوٹ لیا۔ اس مشاعرے کے بعد وہ باقاعدہ طور پر لاہور اور دیگر شہروں میں برپا ہونے والے مشاعروں کا حصہ بننے لگے۔ شاعری میں ساغر صدیقی کے استاد انور گورداسپوری تھے۔ ابھی بطور شاعر ان کی اٹھان شروع ہی ہوئی تھی کہ ہندوستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا قیام پاکستان کے بعد ساغر صدیقی لاہور آ گئے یہاں ان کی ملاقات انور کمال پاشا سے ہوئی جن کا شمار فلم انڈسٹری کے بانیوں میں ہوتا ہے۔ ان کی سربراہی میں ساغر نے کئی فلموں کے گیت لکھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ کئی رسالوں میں بھی لکھنے لگے۔ نوائے وقت کے مستقل لکھنے والوں میں ساغر صدیقی کا نام بھی شامل تھا۔

ساغر صدیقی جب امرتسر سے لاہور ہجرت کر کے آئے تو وہ ایک خوب صورت نوجوان تھے زندگی سے بھرے ہوئے لیکن جلد ہی ان کی زندگی میں لاابالی پن آ گیا اپنے آپ سے گریز کا پہلو ان کی شخصیت پر غالب آتا گیا۔ اس کی بے شمار وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن مرے خیال میں وہی بچپن کی محرومیاں غریبی اور مفلسی کے دکھ ہیں۔۔ جوانی کے عالم میں انھوں نے بھی کئی خواب آنکھوں میں سجائے ہوں گے نئے ملک میں بہتر مستقبل کے خواب۔ لیکن انھوں نے آسوں امیدوں میں گندھے سنہرے خواب جب اپنی آنکھوں کے سامنے ٹوٹتے دیکھے تو ان کی حساس طبیعت یہ سب کچھ

برداشت نہ کر سکی۔ طبیعت پہلے ہی درویشی اور فقیری کی طرف مائل تھی اوپر سے ان حالات نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا تو میلا کچیلا لباس ان کی پہچان بننے لگا غمِ روزگار سے فرار حاصل کرنے کے لیے وہ نشہ بھی کرنے لگے۔

اس ساری صورت کے باوجود شاعری سے ان کا رابطہ بدستور قائم رہا۔ شاعر فطرتاً حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے یہی حساسیت ان کو درویشی اور فقیری کی طرف لے گئی۔ ان کی شاعری کا بنیادی رنگ میرے خیال میں بھی اپنے آپ سے بے نیازی ہے۔ جس کا اظہار ان کے بے شمار اشعار سے ہوتا ہے مثال کے طور پر:

موجزن وقت کے دریا میں نوائے درویش
ہدیہ چاک صدف دستِ دعائے درویش
جب کبھی راستہ حالات کا دھندلایا ہے
کام آئی ہے زمانے میں ضیائے درویش

امید کے موتی ارزاں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے
پھولوں سے مہکتے داماں ہیں درویش کی جھولی خالی ہے
چمن پہ دام پہ درویش مسکراتا ہے
ہر اک شام پہ درویش مسکراتا ہے
صراحی بزم میں جب قہقہے لگاتی ہے
سکوت جام پہ درویش مسکراتا ہے

مدعا کچھ نہیں فقیروں کا
درد ہے لا دوا فقیروں کا
منزلوں کی خبر خدا جانے
عشق ہے راہنما فقیروں کا

آؤ اک سجدہ کریں عالمِ مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں
میں نے پلکوں سے درِ یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں

ساغر صدیقی کی شاعری میں جو دوسرا اہم موضوع ہے وہ شراب، مے خانہ، جام، سبو جیسے استعارات کو بندش میں لے کر اپنے آپ سے اور زمانے سے گفتگو ہے۔ جس کا ماحصل وہی درد اور آہ و زاری ہے جس کے بغیر ساغر صدیقی کی شخصیت کا ادراک تقریباً ناممکن ہے۔ انھوں نے ان استعارات کو اپنے وژن کا حصہ بناتے ہوئے کمال اشعار کہے ہیں انھیں استعارات کی بندش سے حافظ شیرازی نے جو اشعار کہے ہیں ان کو پڑھ کر بندہ ہواؤں میں اڑنے لگتا ہے ہر طرف پھول ہی پھول نظر ہیں موسمِ بہار اپنے جوبن پر نظر آتا ہے۔ چاند اور ستارے زمین پر بچھے نظر آتے ہیں۔ اور شاعر اپنے محبوب کی زلفوں سے کھیلتا ہوا جذب و مستی کی اتھاہ گہرائیوں میں اترتا ہوا محسوس ہوتا

ہے۔ لیکن ساغر صدیقی بالکل اس کے برعکس نظر آتے ہے۔ کیونکہ دکھ سکھ کے سارے موسم انسان کے اندر ہوتے ہیں:

ان پر نثار محفل ہستی کی رونقیں
اے دوست میکدے میں جو تنہائیاں ملیں

رنگِ شفق سے آگ شگوفوں کو لگ گئی
ساغر ہمارے ہاتھ سے چھلکا تو رو دیئے

میں تلخیء حیات سے گھبرا کے پی گیا
غم کی سیاہ رات سے گھبرا کے پی گیا

میں آدمی ہوں کوئی فرشتہ نہیں حضور
میں آج اپنی ذات سے گھبرا کے پی گیا

ایک نغمہ ایک تارا ایک غنچہ ایک جام
اے غم دوراں غم دوراں تجھے مرا سلام

جام ٹکراؤ وقت نازک ہے
رنگ چھلکاؤ وقت نازک ہے

مدتوں سے ہے بند مے خانہ
دیر سے مے گسار جلتے ہیں

ہندوستان کی تقسیم اہل ہندوستان کے لیے بہت بڑا تجربہ تھا تجربہ کیا بہت بڑا انسانی المیہ تھا جس سے پورا ہندوستان متاثر ہوا۔ لیکن جو دکھ اور تکالیف پنجاب کے حصے میں آئیں اس کا اظہار لفظوں میں تقریباً ناممکن ہے۔ ساغر صدیقی جیسا شاعر کیسے اتنے بڑے انسانی المیے سے غافل رہ سکتا تھا۔ بل کہ وہ تو خود اس سارے المیے کا چشم دید گواہ اور اس المیے سے پیدا ہونے والے حالات اور اثرات کے متاثرین میں سے تھا۔ انھوں نے کئی اشعار میں ہجرت کے اس دکھ کو بیان کیا ہے:

کل جنھیں چھو نہیں سکتی تھیں زمانے کی نظر
آج وہ رونق بازار نظر آتے ہیں

یہ سماں بھی ہم نے دیکھا سر خاک رل رہے ہیں
گل و انگبیں کے مالک مہ و کہکشاں کے پالے

یہ حیات کی کہانی ہے فنا کا ایک ساغر
تو لبوں سے مسکرا کے اسی جام کو لگا لے

یہ کیا قیامت ہے باغبانوں کہ جن کی خاطر بہار آئی
وہی شگوفے کھٹک رہے ہیں تمھاری آنکھوں میں خار بن کر

لوگ اب موت سے نہیں ڈرتے
لوگ اب زندگی سے ڈرتے ہیں

اس منزل حیات سے گزرے ہیں اس طرح
جیسے کوئی غبار کسی کارواں کے ساتھ

قیام پاکستان کے بعد جس جنت ارضی کے خواب لیے ساغر بھی دوسرے کروڑوں لوگوں کے ساتھ پاکستان میں داخل ہوئے تو ان کی خوشی چند دنوں ہی میں کافور ہو گئی پاکستان بننے کے ساتھ ہی مارشل کے سائے اس نوزائیدہ مملکت پر لہرانے لگے اور آج پچھتر سال گزرنے کے بعد بھی ہماری نسلیں آمریت کے ان اندھیروں سے چھٹکارا نہیں پا سکیں۔ ساغر جیسے حساس لوگ آج بھی اس ساری صورت حال کو دکھی دل کے ساتھ سوچتے اور دیکھتے ہیں۔

ساغر صدیقی کی شاعری کا ایک اور پہلو جس نے میری توجہ اپنی جانب مبذول کروائی وہ یہ کہ جب ہم ان کی شاعری پڑھیں تو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ عشق مجازی کی منزلوں سے باقاعدہ گزرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے وصل اور ہجر کی کیفیات کو بڑی باریک بینی سے اپنی شاعری کا حصہ بنایا ہے۔ ان کے اشعار میں انتظار کی اضطراری کیفیتیں بڑے اچھوتے انداز سے بیان ہوئی ہیں۔ مثال کے طور پر:

ایک وعدہ ہے کسی سے جو وفا ہوتا نہیں
ورنہ ان تاروں بھری راتوں میں کیا ہوتا نہیں
جی میں آتا ہے الٹ دوں ان کے چہرے سے نقاب
حوصلہ کرتے ہیں لیکن حوصلہ ہوتا نہیں

آنے والے تیرے رستوں پہ بچھاؤں آنکھیں
جانے والے تیرے پاؤں سے لپٹ کر رولوں

اٹھا کر چوم لی ہیں چند مرجھائی ہوئی کلیاں
نہ تم آئے تو یوں جشن بہاراں کر لیا ہم نے

چکرا کے گر نہ جاؤں میں اس تیز دھوپ میں
مجھ کو ذرا سنبھال بڑی تیز دھوپ ہے

ساغر صدیقی کی شاعری بڑی سیدھی سادھی رواں دواں مترنم بحروں میں ہمارے سامنے لاتی ہے انھوں نے مشکل اور سنگلاخ زمینوں کا انتخاب کر کے نہ اپنے آپ کو مشکل میں ڈالا ہے اور قاری کو ان کی شاعری بہتے ہوئے جھرنوں کی طرح پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو سیراب کرتی جاتی ہے۔ ان کا انداز بیان اتنا دلکش ہے کہ شعر پڑھتے ہی لہو میں گھلنے لگتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساغر صدیقی کے مداحین میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں ان کے کلام سے محبت بڑھتی جا رہی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو بقول ساغر صدیقی:

آفاق میں گونجی ہے مری شعلہ نوائی
نالے مرے افلاک کا پیوند رہے ہیں

☆☆☆☆☆

عماد اظہر باطنی احساسات و کیفیات کا حامل شاعر

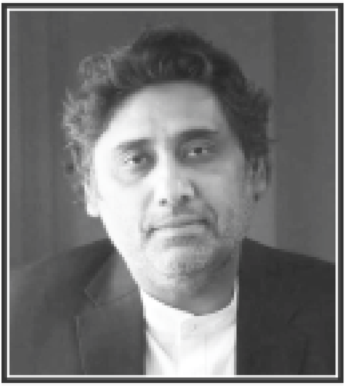

حلقۂ آب سے تصویر اُٹھائی میں نے
دوسری شکل بھی اپنی ہی بنائی میں نے

اسم اور جسم کی تعلیم مکمل دے کر
ساتویں دن مجھے آواز لگائی میں نے

....

جب ہم کسی تخلیق کار کی فنی عظمت اور شعری خوبیوں کا جائزہ لیتے ہیں تو سب سے پہلے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کا خیال وفکر اس کا انداز بیاں اور لہجہ واسلوب کیسا ہے اور عہد موجود میں باقی تخلیق کاروں سے کیسے منفرد ہے۔ کیا وہ اسی سیلاب میں تو نہیں بہہ گیا جس میں ہزاروں شعرا پہلے سے ہی بہہ رہے ہیں۔ باقی لوگوں سے ہر طرح سے جدا ہو کر اپنا خیال اپنی سوچ اور اپنا لہجہ منفرد بنانا ہی کامیابی ہے اور وہی لوگ تخلیقی طور پر زندہ بھی رہتے ہیں جس طرح آج شعری میدان میں ایک ہڑبونگ مچی ہے سینئر جونیئر چھوٹا بڑا ہر کوئی بازی لے جانے کے چکر میں شاعری کا بیڑہ غرق کر رہا ہے اور مشاعرہ بازی نے خیال وفکر کی جو دھجیاں اڑائی ہیں لطافت کو کثافت میں تبدیل کر دیا ہے وہ سب کے سامنے ہے۔ ایسے ابتر حالات میں ایک خوب صورت، نظریاتی اور بامقصد شعری مجموعے کا منصۂ شہود پر آنا بذات خود ایک معجزہ ہے۔ اور قدرت کا ادب پر احسان بھی کہ کوئی ایسا شعری مجموعہ تو سامنے آیا کہ جس کو ہم بڑے فخر مان کے ساتھ ادب کا

فیصل زمان چشتی

اتنا شدھ کہہ سکیں اور لوگوں کو بتا سکیں کہ شاعری ایسے بھی کی جا سکتی ہے۔ میری مراد عماد اظہر نے اس تازہ شعری مجموعے ساتواں دن سے ہے عماد اظہر اس شعری مجموعے میں اپنی قلبی واردات، باطنی کشف اور اپنے روحانی سفر کو گواہ بنا کر محفوظ کر دیا ہے۔ یہ مجاز سے حقیقت کی طرف سفر کر رہے ہیں۔

ان کا جذبہ لافانی اور محبت کا رنگ اتنا پکا اور گہرا ہے جو دنیاوی معاملات کی گرد سے ہرگز میلا نہیں ہوتا اور نہ ہی پھیکا پڑتا ہے بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہی مزید خوب صورت ہو رہا ہے۔ اس مجموعے میں ان کی شاعری سطحی معاملات سے بہت اُوپر ہے خالص اور باطنی سچائیوں کا خوب صورت اور نفیس اظہار بہترین اور باکمال اشعار کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے جو ہماری روح کو شاداب کر رہا ہے ۔ اس مجموعہ کلام ’’ساتواں دن‘‘ میں ان کی شاعری اس عارفانہ کیفیت کی گواہ ہے جس میں یہ رہتے ہیں اور انھوں نے اپنی لازوال اور بہترین شاعری کے ذریعے ہمیں بھی اپنا ہمراز اور ہمرکاب بنالیا ہے۔ کچھ اشعار دیکھیے:

جانے کس سمت لیے پھرتا فقیری کا غرور
صاحبو! شکر ہے ہم خاک ہوئے پاک ہوئے

یہ مدینہ ہے یہاں رنج و الم کوئی نہیں
جو گنہ گار بھی عشاق ہوئے پاک ہوئے

....

وہ لوگ کیسے مدینہ سے لوٹ آتے ہیں
جو اپنے آپ کو عشاق بھی سمجھتے ہیں

....

یہ کائنات بھی اس غار کی بدولت ہے
جہاں فقیر ہمیشہ دیا جلاتے ہیں

....

کوزۂ خوابِ گزشتہ کو دوبارہ سے بھرا
میں نے مٹی کی جگہ وحشت کو دریا سے بھرا

....

یہ وہ لافانی جذبات احساسات و کیفیات ہیں جو انسان کو کسی اور ہی جہان کی سیر کرواتے ہیں اور انسان دنیا کے معاملات سے ماورا ہو جاتا ہے ۔ عماد اظہر پیدائشی شاعر ہیں وہ قدرت کی صناعی اور خوبصورت کو ایک شاعر کی نظر سے دیکھتے ہیں اپنے اردگرد کا ماحول اور ذاتی کیفیات یعنی داخلی اور خارجی صورت حال کا انھیں بخوبی ادراک رہتا ہے۔ ایک خالص اور جینوئن شاعر کی طبیعت، فطرت اور سوچ عام لوگوں سے مختلف ہوتی ہے کیونکہ وہ حالات کو اور مشاہدات کو اور نظر سے ہی دکھتا ہے اسی طرح عماد اظہر کی سوچ اور فکر و خیال بھی عام

لوگوں سے مختلف ہے، جس کا اظہار ان کی شاعری میں جا بجا ملتا ہے۔

انسان، مقدر، قسمت، حالات، مشکلات، جن، دوزخ ایسے سوالات ہیں جن کے جوابات شروع سے لے کر آج تک انسان ڈھونڈتا رہا ہے اور ڈھونڈتا رہے گا کیونکہ مختلف مذاہب و عقائد کی وجہ سے ان کی تشریحات اور انداز بیاں مختلف ہوتا رہا ہے اور ہر ذی شعور کے ذہن میں ان کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ عماد اظہر نے بھی ایسے سوالات و جوابات کو اپنے اشعار کا موضوع بنایا ہے اور قدرت کے اُن رازوں کو جاننے کی کوشش کی ہے جو ابھی تک انسان کے لیے حیرت کا باعث ہیں۔ جیسا کہ:

خدا سے پہلے خدا بھی کوئی کہانی تھا
بس ایک اسم تھا اور اسم لامکانی تھا

ہری بھری سی کوئی شاخ غار میں تھی کہیں
اور اس پہ سبز منہری دعا کا پانی تھا

....

باعثِ وحشتِ دلگیر بنانے لگا تھا
جب خدا خاک کی تقدیر بنانے لگا تھا

عین اس وقت ہُوا مجھ سے کوئی کار خدا
جس گھڑی میں تری تصویر بنانے لگا تھا

رونقِ حُجرۂ درویش بھی معزول ہوئی
اب وہاں فقر تمنا سے بھرا رہتا ہے

....

عماد اظہر کی شاعری سے ہمیں ان کی طبیعت اور مزاج کا پتہ چلتا ہے کیونکہ شاعری ایک ایسا دروازہ ہے، جس کے راستے سے ہم شاعر کے مزاج کو جان سکتے ہیں ان کی شاعری میں ایقان اور حقیقت کا رنگ اتنا نمایاں ہے کہ ان کے اشعار پڑھ کے پاکیزگی اور حقیقت نمایاں ہو کر سامنے آنے لگتی ہے۔ ایسے اشعار سے اسرار و معرفت کے خزانوں کی تلاش کا شوق بڑھتا ہے۔ ان کی شاعری کی خوب صورتی اور تہہ داری ازل اور ابد کے فلسفہ کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور انسان زمان و مکان کی بندشوں کو مسخر کرنے کا متلاشی ہو جاتا ہے۔

محمد آلِ محمد اور کربلا سے نسبت اور تعلق انسان میں ایثار، قربانی اور عشق و محبت کے سمندر میں مدوجذر لاتی ہے، دکھ اور کرب کے جذبات اور کیفیات کو جلا بخشتی ہے کربلا کا مفہوم تب سمجھ آتا ہے جب ایثار و وفا کا جذبہ وافر مقدار میں موجود ہو۔ محمد آل محمد کے اتباع سے ہی عشق و محبت کے وہ چشمے پھوٹتے ہیں جو انسان کے شعور کی آبیاری کر کے اسے کائناتوں کو مسخر کرنے کی راہ

دکھلاتے ہیں اور جس شخص کی اُن سے نسبتیں ہوں وہ دنیا کے خوش قسمت ترین انسانوں میں شامل ہوتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ عماد اظہر بھی انھی لوگوں میں شامل ہے جن کی شریانوں میں اہلِ بیتِ اطہار کی نسبت اور محبت مودّت خون بن کر رواں دواں ہے۔

ایک منظر کسی منظر سے نہیں جائے گا
واقعہ بابِ منور سے نہیں جائے گا

دوسرا کوئی بھی مرضی سے پلٹ سکتا ہے
ایک بھی فرد بہتّر سے نہیں جائے گا

نصرتِ دشت میں عشّاقِ حسینی تھے سبھی
یہ نظارہ مرے اندر سے نہیں جائے گا

....

عماد اظہر کا خیال، اسلوب اور شعری ٹیکنیک ان کی اپنی اور شعری رنگ بھی اپنا ہے ان کی شاعری میں ایک خاص جمالیاتی آہنگ موجود ہے جس کی وجہ سے اپنے ہم عصرین میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کا منفرد ہونا ہی ان کی کامیابی ہے۔ ''ساتواں دن'' روحانیت اور پاکیزگی کا ایسا مجموعہ ہے جس سے پڑھنے اور سننے والا اپنے عقل و شعور کو منور اور معطر کرتا رہتا ہے یہ نئے تجربات پر مبنی وہ کتاب ہے جو میرے خیال میں بار بار پڑھنے سے منکشف ہوگی (جس طرح شاعری کے خانِ اعظم منیر نیازی نے کہا تھا کہ یہ شعر کی مرضی ہے کہ وہ کسی پر منکشف ہو یا نہ ہو، کیونکہ روحانی تجربات ایک جست میں طے نہیں ہوتے بل کہ مسلسل ریاضت سے ہی ان تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔ اس شعری مجموعے کے رنگ اور خدوخال عام مجموعوں سے قطعی مختلف اور جدا ہیں۔

انھوں نے تصوفانہ رنگ و فلسفہ شعر کے قلب میں ڈھال کر جدید غزل کی عزت اور وقار میں مزید اضافہ کیا ہے۔ ساتواں دن میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ادب کا ایک سنجیدہ قاری پڑھنے کی طلب رکھتا ہے۔ ایسی شاعری اپنے قاری اور سامع خود پیدا کرتی ہے اور لوگوں کا شاعری پر کھویا ہوا اعتماد بحال کرتی ہے۔ آخر میں چند اشعار:

اک تماشا ہی سہی بار دگر جاتی ہے
ناؤ چلتی ہے مگر ریت سے بھری جاتی ہے

....

ہم ایک ساتھ فقیروں کی حاضری میں تھے
یہ اسم میرے زمانے میں جسم ہوتا تھا

....

زمیں پہ اس کا مرے ساتھ ساتواں دن ہے
وہ اس سے پہلے کوئی فردِ آسمانی تھا

☆☆☆☆☆

دردانہ نوشین خان کا ’’کتب مینار‘‘

دردانہ نوشین خان سے پہلا تعارف ادبی رسائل و جرائد کے ذریعے ہوا۔ میرے خیال میں پہلی بار ان کا نام ادبی جریدے ’’بیاض‘‘ میں دیکھا تھا۔ پھر دیگر جرائد میں ان کی تحریریں نظر سے گزریں 2024 میں بہاولپور سے شائع ہونے والے ادبی جریدے ’’الزبیر‘‘ میں ان کا تحریر کردہ مضمون ’’میرا 2024 کا رمضان اور ماضی کا رمضان‘‘ پڑھا تو امی، ابو کے ساتھ گزرے ہمارے بچپن کے رمضان بھی نظروں کے سامنے آ گئے۔ ان کی تحریر کا ایک پیراگراف زندگی کی حقیقت بیان کرتا محسوس ہوا۔

’’پھر بچے بھی بڑے ہوتے گئے۔ ان کے گھر آباد ہونے لگے۔ ماں کا بچھڑنا بیٹی کا بزرگ ہو جانا ہوتا ہے۔ باپ کا بچھڑنا سائبان کا اعتماد چھن جانا ہوتا ہے مگر بہنیں ایک گود کا، ایک آنگن، ایک سائبان کا مشترکہ ماضی رکھتی ہیں۔ (بھائی بھی رکھتے ہوں گے مگر میرا کوئی بھائی نہ تھا) بہنوں کی باہمی نوک جھونک، شکوے شکایتیں، ناراضگیاں ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتیں، وہ کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کا عکس ہوتی ہیں‘‘۔

ایک معروف لکھنے والے سے ان کا نمبر لیا۔ ان سے رابطہ ہوا تو ان کے ایڈریس پہ اپنے کالمز کی دوسری کتاب ’’شہاب فکر‘‘ بھجوا دی۔ دو ہفتے بعد ان کی تین کتابیں موصول ہوئیں۔ جن میں سے ایک ناول، ادبی مضامین اور نظم کی کتاب شامل تھی۔ طوالت کے پیش نظر ناول پڑھنا میرے لیے ہمیشہ مشکل رہا ہے۔ تاہم تحفے میں بھجوائے ناول یا کتاب کا حق ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ سر دست ان کے مضامین کی کتاب پر کچھ لکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

اس کتاب میں شامل مضامین مختلف ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر تاثرات ہیں۔ کتاب میں کل 18 مضامین شامل ہیں۔

رانا محمد شاہد

پیش لفظ کا ابتدائیہ متاثر کن ہے۔

''ادیب سے زیادہ باتونی کوئی نہیں ہوتا۔ تاہم خیال رہے، باتوں باتوں میں بڑا فرق ہوتا ہے۔باتیں تو غیبت، تضحیک، بہتان، استہزاء بھی ہیں اور منطق و دلیل بھی، اظہار تدبر، پند و نصائح اور مباحثہ بھی۔اول الذکر وقت کا زیاں اور، موخر الذکر ابلاغ ہے۔ ادیب باتیں سوچتا لکھتا اور قلب سے لیکر قلم تک جیتا ہے''۔

کبھی میں بھی یہ سمجھتا تھا کہ لکھنا ایک مشغلہ ہے مگر گزرتے وقت نے بتایا کہ لکھنا ایڈکشن ہے۔ایسے نشے کی صورت جو کوشش کے باوجود نہ چھوٹے۔

اس حوالے سے وردانہ لکھتی ہیں۔

''لکھنا پڑھنا مشغلہ(Hobby) گردانا جاتا ہے لیکن عمر کا ایک طویل حصہ اس دشت کی سیاحی میں گزارنے کے بعد میں کہہ سکتی ہوں کہ لکھنا ایک لت(addiction) ہے۔یہ کم یا بیش ہوسکتی ہے، ختم نہیں ہوتی۔ جبکہ مطالعہ (غیر نصابی) دوسرے درجے کی لت ہے۔دوسرے درجے سے مراد اس کے چھوٹنے کے امکانی مواقع زیادہ ہیں۔ دراصل کتابی کیڑا پڑھنے والا کم اور لکھنے والا زیادہ ہوتا ہے''۔

ان کی اس بات سے سو فیصد اتفاق ہے کہ کتابوں کی تعداد (گنتی) لیجنڈ نہیں بناتی۔ کبھی ایک غزل حتیٰ کہ ایک شعر بھی آپ کا تعارف بن جاتا ہے تو کبھی درجنوں کتابیں بھی گمنامی میں دھکیل دیتی ہیں۔چند ماہ پہلے فیس بک پر ایک شاعر کی دھڑا دھڑ نئی کتابوں کی اشاعت کے حوالے کسی نے لکھا۔

''موصوف کی ہر تین، چار ماہ بعد نئی کتاب آجاتی ہے۔ مگر مجال ہے کہ مجھے ان کا ایک شعر بھی یاد ہو''۔

کتاب میں شامل 18 مضامین میں سے سر دست جو چند مضامین پڑھے ہیں۔ان پر لکھ رہا ہوں۔

''ایک لطیف تہذیب کی خوشبو عطیہ فیضی''

عطیہ فیضی ایک لطیف تہذیب کا استعارہ تھیں۔اس تہذیب کی خوشبو قاری کو مصنفہ کے انداز بیاں سے بھی آتی ہے۔جیسا کہ مصنفہ لکھتی ہیں۔''کروشیا کی چادروں والے پلنگ، کڑھائی کے ستھرے اجلے میز پوش، کارنس پہ ہاتھوں سے سجائی گئی گڑیوں کی سجاوٹ، کھڑکیوں پر آویزاں نفیس کشیدہ کاری کے پردے اور کھڑکیوں کے پار سبز پتوں میں جھانکتے سفید پھولوں کے بیلوں کی آنکھ مچولی---''

ویسے یہ بات حقیقتاً حیران کن تھی کہ عطیہ فیضی نے ایک صدی پہلے علم موسیقی پہ عبور حاصل کیا۔جبکہ بقول مصنفہ کے آج بھی کسی مسلمان ہندوستانی لڑکی کا علم موسیقی حاصل کرنا خال خال ہے۔

سچ کہوں تو عطیہ فیضی پر لکھی تحریر کا آخری حصہ بمشکل پڑھ سکا۔شوہر کے انتقال کے بعد کے حالات پڑھ کر دل دکھ سے بھر گیا۔

اس سے بڑی اذیت کیا ہوگی کہ عطیہ فیضی کو اپنی ضروریات زندگی کے لیے معمولی رقم کی ضرورت ہوئی مگر پیسے پاس نہ ہوتے۔
بقول ماہر القادری کہ عطیہ نے اپنے ایک جاننے والے سے 50 روپے ادھار مانگے۔ پچاس کے بجائے سو روپے کا تحفہ دیکھ کر وہ اشک بار ہو گئیں۔ پھر لیلیٰ شہزادہ کا اذیت ناک نظارہ کہ کسی تقریب میں عطیہ بیگم کچھ بسکٹ پلیٹ سے چوری چھپے اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ رہی تھیں۔ تاکہ بعد میں کھانے کے کام آسکیں۔ اس سے بڑا دکھ کیا ہوگا کہ بقول مصنفہ:
”علم و دانش گویا ضروریات زندگی کے آگے خس و خاشاک ہو رہے تھے“۔
بیگم نصرت عبدالرشید (والدہ بشریٰ رحمان) کی نعتیہ شاعری پر ایک خوبصورت تحریر پڑھنے کو ملی۔ ان کی نعتیہ شاعری کے ساتھ ساتھ پر درد نظم ”حقیقی ڈولی“ بھی کمال کی تھی۔ اپنے انتقال سے صرف ایک ماہ پہلے لکھا گیا یہ صوفیانہ کلام رخصتی، ڈولی اور جدائی کا خوب صورت اظہار یہ ہے۔ ہماری خوش قسمتی کہ بشریٰ آپا سے 2018 میں (پی سی ہوٹل) لاہور میں ایک تقریب میں ملاقات ہوئی تھی۔ ان کی گفتگو اور اعتماد ہی بتاتے تھے کہ وہ کتنی عظیم خاتون کی بیٹی تھیں۔ بشریٰ آپا چالیس سال گزر جانے کے باوجود ماں کے ذکر پر زار و قطار روتی تھیں۔ یہ پڑھ کر عجیب نہیں لگا۔ اس لیے کہ ماؤں کی دائمی جدائی کو برسوں بھی گزر جائیں تو بیٹیاں انہیں یونہی یاد کرتی ہیں، جیسے کل کی بات ہو۔
ابدال بیلا کی خود نوشت ”بندہ“ بھی ایک موضوع لگا۔ ان کی اس آپ بیتی کی ابتدا ”امی جان“ کے عنوان سے لکھے باب سے ہوتی ہے۔ مائیں سانجھی ہوتی ہیں تو ان کی کہانیاں اور ان کی مشکلات بھی ملتی جلتی ہیں۔ بقول درِ دانہ نوشین کے ”ماں کے احساسات اور تکلیفوں کو ستر برس بعد بیٹے کے قلم نے محفوظ کیا اور کیا خوب کیا۔“ انھوں (ماں) نے ہمیں خواب دیکھنے والی آنکھیں دیں۔ ”ماں اب رضائیوں میں گدے ڈال رہی ہے، پھٹی پتلونیں سی رہی ہے، میلے کپڑے صابن سے مل مل کر دھو رہی ہے، گرم ہانڈی میں ڈوئی بھر کر دال یا ترکاری بہن بھائیوں کے رنگ و ڈیزائن سے فرق تھالیوں میں پروس رہی ہے“۔
”گویا کہ ابدال بیلا اپنی ماں کے ہر کام کو چن چن کر یادوں کے توشہ خانہ میں سنبھالتا رہا۔
باب ”قلم“ کے حوالے سے لکھے گئے جملے ”امی جی اس وقت تختی پر لکھنے کے لیے آپ نے جو قلم دیا تھا“۔ پڑھتے ہوئے وہ قلم سامنے آگیا جو امی نے اپنی دائمی جدائی سے ایک سال پہلے 2013 میں خرید کر دیا تھا۔ آج بھی اسی سے لکھتا ہوں۔ 12 سال گزر چکے ہیں۔ یہ قلم اس وقت زیادہ شدت سے یاد آتا ہے۔ جب

اپنے بچوں کو اپنی ان کی ماں سے ہر دو ماہ بعد نیا قلم خریدنے کا سنتا ہوں کہ قلم گم ہو گیا ہے یا خراب ہو گیا ہے۔
مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہیں:
''اعتکاف'' وہ اعتکاف تھا جو مسجد نبوی میں رکھا۔ جس کی دعا وہ مانگ کر بھول چکے تھے مگر سمیع الدعاء نہیں بھولتا۔ اگلے سال بن مانگے عطا ہوا۔ ایک ایسا اعتکاف جس میں ہر طلب سنی جا رہی تھی، پوری کی جا رہی تھی''۔ یہ پڑھا تو ابو جی کا دوسرا عمرہ یاد آ گیا۔ پہلا عمرہ امی، ابو نے اکٹھے 2004 میں کیا تھا۔ پھر 2007 میں جب ابو کا بالکل بھی ارادہ نہیں تھا۔ اللہ نے بن مانگے اپنے گھر (عمرے) پہ بلا لیا۔ اس بات کا یقین پختہ ہو گیا کہ اللہ کے گھر بلاوے کے بغیر نہیں جا سکتے۔
دردانہ نوشین خان کی اس تحریر کی خوب صورتی یہ بھی ہے کہ انھوں نے ہر باب سے کوئی ایک اہم جملہ حوالہ دے کر لکھا ہے۔ ممتاز مفتی کے ذکر میں ان کی انوکھی نصیحت قابل ذکر ہے۔ ''جس بندے نے کبھی دکھ دیا، ناحق ستایا، اس سے بدلہ نہ لینا بس اتنا کرنا اس کا نام اپنے قلم سے نہ لکھنا۔ اس کے نام کو زندہ نہ رکھنا''۔ سچ پوچھیں تو ابدال بیلا کی آپ بیتی ''بندہ'' پر نوشین صاحبہ کی تحریر پڑھ کر ان کی آپ بیتی خرید کر پڑھنے کو دل کر رہا ہے۔ ایک لکھاری کی اس سے بڑی کامیابی کیا ہو سکتی ہے۔

سلمیٰ اعوان کے ناول ''تنہا'' پر بھی خوب صورت تبصرہ پڑھنے کو ملا۔ سلمیٰ اعوان سے ابتدائی تعارف ماہنامہ اردو ڈائجسٹ کے توسط سے ہوا تھا۔ جس میں لکھنے کی ابتدا 2001 میں کی تھی۔ البتہ مطالعہ اس سے بھی پہلے سے کر رہے تھے۔ سلمیٰ اعوان اردو ڈائجسٹ کی مشاورتی ٹیم کا حصہ تھیں۔ دردانہ نوشین خان نے ناول کے مرکزی خیال کو بڑی خوب صورتی سے پیش کیا۔ انھوں نے بنگال سے متعلق جو چیزیں گنوائی تھیں۔ ان میں سے ہمیں سندر بن جنگل، چٹاگانگ، ڈھاکہ، بنگال کا جادو کے بعد صرف شبنم اور روبن گھوش کو ہی جانتے تھے۔ اس لیے کہ ہر جمعرات اور پھر ہفتہ کو پی ٹی وی پر شبنم کی آنے والی فلم ضرور دیکھتے تھے۔ بل کہ ان دنوں ہماری پسندیدہ اداکارہ شبنم ہی تھیں۔ یہ تو کچھ وقت کے بعد پتا چلا کہ وہ پاکستانی نہیں بل کہ بنگلہ دیشی ہیں۔ ناول میں بنگلہ دیشی ثقافت اور رسم و رواج کو خوب صورتی سے اجاگر کیا گیا۔ خوب صورت منظر کشی بھی اس ناول کا خاصہ ہے۔ ناول نگار کی اصل کامیابی یہی ہے کہ وہ قاری کو بھی اپنے ساتھ لے کر پھرتا ہے اور کہیں بھی اس کی توجہ بٹنے نہیں دیتا۔ نفرت کی دیوار وہ جملے بھی تھے، جن کا ذکر اس مختصر تحریر میں دردانہ صاحبہ نے کیا۔ سلمیٰ اعوان کے اس ناول میں تاریخ کے ساتھ اگر ادب نمایاں ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ سلمیٰ اعوان کی ساری زندگی علم و ادب کی ترقی و

ترویج میں گزری ہے۔

"کلیات نسیم کا سرسری جائزہ" بھی ہمارے لیے دلچسپی کا حامل تھا کہ نسیم سحر صاحب سے دو سال سے زیادہ عرصہ سے تعلق ہے۔ وہ وقتاً فوقتاً اپنی کتابیں بھیجتے رہتے ہیں اور کچھ ایسی ہی کوشش ہماری طرف سے بھی ہوتی ہے کہ اپنی ہر کتاب انہیں بھجوائی جائے۔

"کلیات نسیم سحر" پر دردانہ نوشین خان نے بھرپور تبصرہ لکھا ہے۔ وہ ان کی نثر اور شاعری کے مختلف پہلوؤں کو منظر عام پر لائی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ نسیم سحر بہت زیادہ لکھنے والے ادیب ہیں۔ آج کے تقریباً تمام ادبی جرائد میں وہ نظر آتے ہیں۔ کئی اخبارات کے ادبی صفحات پر بھی وہ تسلسل سے لکھتے رہے ہیں۔

خالد احمد کی "نم گرفتہ" اور "پہلی پو پھٹی پروائی" (طویل نعتیہ نظم) میرے پاس بھی ہے 2022 میں بیاض کے آفس کا چکر لگا تو اعجاز رضوی نے خالد احمد کی ان دو کتابوں کے علاوہ دیگر کچھ کتابیں بھی عطا کی تھیں۔

خالد احمد ہمہ وقت تخلیق کار تھے۔ پاکستان ٹیلی ویژن کے لیے ان کے لکھے ڈرامے "خرمن" "پانی" "غبار" بہترین ڈرامے تھے۔ تاہم زیادہ شہرت "کاجل گھر" کو ملی۔ غزل کے ساتھ پابند نظم میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ دردانہ نوشین خان نے "نم گرفتہ" میں شامل ان کی خوب صورت نظموں کا حوالہ دے کر نثری پیرہن عطا کیا ہے۔ کیا خوب صورت خیال ہے:

چادرِ خاک کی سلوٹیں دور کی جا رہی ہیں
کہ ہونا اور نہ ہونا برابر کیا جا رہا ہے
مگر یہ خلا پر نہ ہوگا
کہ ہونا نہ ہونا کسی سے برابر نہ ہوں گے

"پہلی پو پھٹی پروائی" ایک طویل نعتیہ نظم ہے۔ جسے خالد احمد نے مثنوی پیرائے میں لکھا۔ دردانہ نوشین خان نے اس پر بھرپور تحریر لکھی۔ نعتیہ کلام سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ ایک بہترین اور اہم کتاب ہے۔

"کتب مینار" کے جو چند مضامین پڑھے ہیں۔ ان پر مختصر سا اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی اس کتاب کی اہم بات یہ ہے کہ ہر تحریر کے آخر میں اس ادبی جریدے کا حوالہ ہے، جس میں اس تحریر کی اشاعت ہوئی۔ بہترین ٹائٹل اور خوب صورت کاغذ کے ساتھ یہ ایک جاذب نظر کتاب ہے۔ آخر میں ان کے پیش لفظ کی آخری بات ہی ایک تخلیق کار (ادیب، شاعر) کا حاصل ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔

تخلیقی کرب کا معاوضہ کیا ہے؟

منصفانہ مطالعہ، بے لوث توجہ اور بے لاگ تبصرہ

میں نے عوضانہ ادا کرنے کی کما حقہ سعی کی ہے"۔

☆☆☆☆☆

انٹرویو: عائشہ احمد جاوید

محترمہ عائشہ احمد جاوید مشہور و معروف شاعر ارشد جاوید اور شہناز کوثر صاحبہ کی صاحبزادی ہیں، انھوں نے لکھنے کی ابتدا شاعری سے کی، مگر پھر جلد ہی افسانہ کی طرف آ گئیں۔
آپ کی تخلیقات ماہنامہ بیاض، اور دیگر رسائل میں شائع ہو رہی ہیں۔ عائشہ احمد جاوید اپنے شوہر جناب وجاہت حسین اور بچوں عبداللہ حسین، ارسل حسین کے ہمراہ ''بیاض'' تشریف لائیں تو ادارہ بیاض نے ان سے کچھ رسمی گفتگو کی، جو قارئین کی نذر ہے۔

☆......آپ اپنے بارے میں کچھ بتایئے۔

میرا نام سحرش جاوید ہے قلمی نام ''عائشہ احمد جاوید'' ہے۔ بچپن بہت شرارتیں کرنا اور لاڈ میں گزرا۔ جب ذرا ہوش سنبھالی تو رنگ قدرت اور خواب سے لگاؤ ہوا۔ جب ان کیفیتوں میں مراحل طے کیے تو روحانیت کی طرف سفر ہوا۔ جب اس رنگ کا اظہار ہونا شروع ہوا تو حلقہ احباب نے کہا کیسی باتیں کرتی ہو بھلا بتاؤ تو تمھاری تعلیم کیا ہے؟

تو میں نے کہا M.A Education پھر لوگ میرا تجربہ کرتے مگر میں سمجھتی ہوں زندگی ایک بہت مشکل سفر ہے مگر میرے ہم سفر وجاہت نے اس سفر کو آسان اور خوب صورت بنا دیا ہے۔

☆......ادب کی طرف کیسے رجوع کیا؟

خیالات اور احساسات کو لفظوں میں اُتار کر روح کو سکون آتا ہے۔ اس سکون کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے ادب کی طرف آئی۔ ابتدا ایک لوکل اخبار سے کی، جس میں میری پہلی آزاد نظم ''یادیں'' شائع ہوئی۔ اس کے بعد باقاعدہ طور پر ایک انٹرنیٹ میگزین ''تخلیق نو'' سے آغاز کیا جس کے مدیر اعلیٰ اعجاز رضوی صاحب تھے۔ اس کے بعد دنیائے ادب کراچی میں لکھا اور ماہنامہ بیاض، لاہور میں لکھنا شروع کیا اور تا حال اس سے وابستہ ہوں، اور آج بہت خوش ہوں کہ میں ''بیاض'' کے آفس میں آئی اور آپ لوگوں سے ملاقات کی یہاں تک آنے کا سفر میری زندگی کا بہترین سفر ہے جو مجھے ہمیشہ اچھے دنوں کی یاد دلائے گا۔

☆......آپ کے والد اعلیٰ درجے کے شاعر تھے، مگر آپ افسانہ نگار بن گئیں۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

میرے والد محترم ارشد حسین جاوید کا تعارف بہت وسیع ہے مگر ادب میں ایک وجہ شہرت شاعری تھا اسی طرح میرے ادبی سفر کا آغاز تو شاعری سے ہی ہوا۔ مگر افسانہ نمایاں صنفِ ادب بن گیا۔ میرے والد مختلف اور بہت سی خوبیوں کے مالک تھے۔ اس لیے ادب معاشرت خون میں شامل تھی ۔ شاعری سے آغاز ہوا اور افسانہ نگار بن گئی۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی گئی آئندہ ڈرامہ نگاری کی طرف جاؤں گی۔

☆......آپ ادبی مرکز لاہور اسلام آباد کراچی سے دور رہ کر بھی تحقیقی کاموں میں مصروف رہیں۔ مرکز سے دور رہنا کیسا لگتا ہے؟

میں سمجھتی ہوں کہ ہر شخص کے لیے وقت جگہ اور بہتری کا تعین خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ مرکز میں کام کرنے والے بھی ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ مرکز سے دور رہنے والے بھی ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ مقصد تو صرف ادب کے لیے خدمات سرانجام دینا ہے۔ دور رہنا شاید میرے کام کے لیے بہتر ہے۔

☆......آپ کے خیال میں ادبی رسالوں کو کیسا ہونا چاہیے؟

میرے خیال میں ادبی رسالوں کو بلاتفریق اور بلا تکلف صرف اور صرف لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ نئے لکھنے والوں اور تمام لکھنے والوں میں ادب ہونا بہت

ضروری ہے- تاکہ یہ ربط ان کی تخلیق کو مزید مضبوط بنائے-

☆......آپ مصروف گھریلو زندگی کے بعد اپنے لیے وقت کیسے نکالتی ہیں؟

خوابوں کو حقیقت کرنے کے لیے وقت نکالنا پڑتا ہے- چاہے آپ کی شادی شدہ زندگی ہو یا اکیلے ہوں لگن اور شوق اپنا راستہ خود بخود دبنا لیتا ہے-

☆...... آپ کا پسندیدہ افسانہ نگار کون ہے؟

میرے پسندیدہ افسانہ نگار اشفاق احمد، احمد ندیم قاسمی ہیں مگر اور بہت سے لکھنے والے مجھے پسند ہیں، بس تحریر اچھی ہونی چاہیے-

☆...... شاعری میں کسے پسند کرتیں ہیں؟

یوں تو بہت بڑے بڑے نام اور ہستیاں ہیں، مگر ساحر لدھیانوی، احمد فراز، خالد احمد، اعجاز رضوی اور میرے والد محترم ارشد حسین جاوید صاحب اور اپنی والدہ محترمہ شہناز کوثر صاحبہ کو زیادہ پسند کرتی ہوں- خالد احمد صاحب تو میرے والد کے دوستوں میں شامل تھے- اور وہ اکثر لاہور والوں کا ذکر کرتے تھے میری یادوں میں بہت کچھ محفوظ ہے-

☆......آپ کی نثر میں ڈرامہ یا مکالمہ بہت ہوتا ہے تو پھر آپ ڈرامہ نگاری کی طرف کیوں نہیں آئیں؟

ہر چیز لکھنے کے بعد ہی سنورتی ہے- اس لیے اب میرا رجحان ڈرامہ نگاری کی طرف ہے کوشش بھی کر رہی ہوں-

☆...... ادبی تقریبات میں شرکت نہ کرنے کی کیا وجہ ہے؟

مناسب وقت سے صحیح وقت کے سفر میں شرکت نہ کر سکی- مجھے لگا اپنے کام کے معیار کو بہتر کروں- جب مجھے لگے گا کہ اس تخلیق میں کچھ حق ادا ہوا ہے تو ادبی تقریبات میں شرکت کروں گی- اب محسوس کرتی ہوں کہ شرکت بھی کرنی چاہیے-

☆......آپ کی طبیعت میں تصوف نظر آتا ہے- اس کی کیا وجہ ہے؟

چیزوں کو خیالات کو احساس کو دیکھنے کا انداز اور ہی قدرت کا دیا ہوا تحفہ ہوتا ہے، جس طرح کا انداز ہوگا طبیعت اس طرف مائل ہوگئی اور میں کچھ روحانی تجربات سے گزری ہوں سو وہی بیان کر رہی ہوں-

☆...... ناول ناولٹ افسانہ یا شاعری کس صنف کو زیادہ شوق سے پڑھتی ہیں؟

سب اصناف ادب کو شوق سے پڑھتی ہوں-

مزاج پر منحصر ہے کہ وہ کیا چیز طلب کر رہا ہے۔ زیادہ تر شاعری اور پھر افسانہ شوق سے پڑھتی ہوں۔

☆..... اس دور میں کتاب کی کیا اہمیت ہے؟

اس دور میں کتاب کی اہمیت تو واجبی سی ہے مگر ہاں علم کی پختگی کی اہمیت زیادہ ہے۔ علم نایاب ہو گا تو لوگ کتاب اُٹھائیں گے مگر اب علم کے بہت سے ذریعے موجود ہیں۔

☆..... موجودہ دور کے چند اچھے افسانہ نگار کون سے ہیں؟

نعمان منظور، عافر شہزاد، سعدیہ اشرف قریشی، سیما پیروز، وقار احمد ملک مجھے پسند ہیں۔

☆..... کیا آپ مائیکرو فکشن کو ادبی تخلیق سمجھتی ہیں؟

ادب کی ہر صنف، جس نے قاری کو متاثر کیا ہو اس صنف کی اہمیت یقیناً ہے مائیکرو فکشن یقیناً ایک تخلیق ہے، جو مختصر ترین پیرائے میں بہت طویل سفر طے کرواتی ہے۔

☆..... آپ نے ''بیاض'' آفس میں آ کر کیا محسوس کیا؟

ماہنامہ بیاض، خالد احمد صاحب، عمران منظور صاحب، نعمان منظور صاحب اور اعجاز رضوی صاحب میرے لیے اجنبی نہیں ہیں، میں سب سے واقف ہوں، یہاں آنے کا مقصد صرف آپ لوگوں سے ملنا تھا مگر یہ حقیقت ہے کہ یہ ایک ادبی رسالے کے دفتر سے زیادہ ایک پُرسکون اور پُروقار جگہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔

☆..... نئے لکھنے والوں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گی؟

نئے لکھنے والوں کے لیے یہ پیغام ہے کہ انسان دوست رویّوں کو سمجھیں اپنے اردگرد ہونے والے واقعات کو پرکھیں اور محسوس کریں آپ کا قلم خود بخود لکھنے لگے گا اور جب قلم لکھنے لگے تو اس سے بڑھ کر کوئی بات نہیں سو لکھیں، شاعر ہیں تو شاعری کریں کہ آنے والی نسل کو پیش کرنے کے لیے ادب سے بہتر کوئی تحفہ نہیں۔

عائشہ احمد جاوید صاحبہ آپ کا اور آپ کے سرتاج جناب وجاہت حسین اور آپ کے بیٹوں عبداللہ حسین اور ارسل حسین کا بہت بہت شکریہ کہ آپ رحیم یار خان سے ایک طویل سفر کے بعد ہم سے ملنے آئے۔ آپ کی آمد کا بہت بہت شکریہ۔

☆☆☆☆☆

ادارہ: ماہنامہ بیاض، لاہور

غزل

دکھوں کی زد میں تھی پتھر کی سل بھی
سو ڈھہ کر بہہ گئی دیوارِ دل بھی

ہوا کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں
ہم ایسے مضمحل بھی، پا بہ گِل بھی

ہمیں اچھا نہیں لگتا کہ رکھیں
تنِ بیمار میں بیمار دل بھی

ہمارا آسماں خالی نہیں ہے
ہمارے تن پہ ہیں کچھ سرخ تِل بھی

ردائے ہجر میں لپٹے پڑے ہیں
نہ اکتا دے یہ قربِ مستقل بھی

نشاطِ زہد بھی بخشش طلب ہے
سکوتِ بندگانِ منفعل بھی

گلابِ عالمِ امثال اب تو
ضمیرِ آدمِ خاکی میں کھل بھی

ہم اپنے دل پہ کچھ نازاں تھے خالد
سو اک دن ہم کو ہونا تھا خجل بھی

خالد احمد

غزلیں

مت پوچھ کن جہات میں کتنا بدل دیا
اک عشق نے خفی جلی سارا بدل دیا

اک صبح کی اذان سے پھوٹا جو نورِ ثور
اُس نے دنوں میں طورِ شہر کا بدل دیا

دہلیزِ مصلحت کے گداؤں کو کیا خبر
خونِ غزہ نے دہر کا نقشہ بدل دیا

کچھ موسموں کے بعد کُھلے گا جہان پر
پل میں ہوائے غیب نے کیا کیا بدل دیا

راضی رہے ہیں اُس کی رضا پر تمام عمر
جس رُت بھی، جس جواز بھی، جیسا بدل دیا

میں عرضِ مدعا کے لیے چُن رہا تھا لفظ
اتنے میں دل نے اپنا ارادہ بدل دیا

عالی بس ایک رَو میں لکھی ہر نئی غزل
پھر جو بھی لفظ من کو نہ بھایا، بدل دیا

جلیل عالی

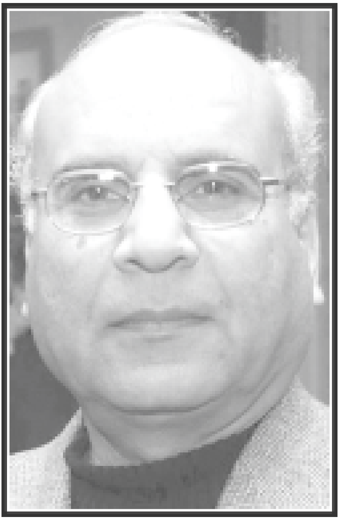

اُسے تو آگ لگانے سے باز آنا نہیں
ہمارا ظرف، ہمیں بات کو بڑھانا نہیں

نمازِ شُکر ہے واجب کہ جنگ میں اِس بار
کھلا کہ غیب سے نصرت کوئی فسانہ نہیں

کہیں سے ایسی ہوائے موافقت آئی
ہٹا ہدف سے مرا ایک بھی نشانہ نہیں

کوئی نگاہ مجھے اور کچھ دکھا رہی تھی
مری رِجا کو مگر دوستوں نے مانا نہیں

بہت لکھے ہیں مگر اب تو رزم گاہ میں ہوں
سو گیت امن کے اِس پل مجھے سنانا نہیں

جہاں میں جیشِ حرائی کا کیا ہے جوہرِ خاص
سمجھ سکا ابھی اِس راز کو زمانہ نہیں

رہیں نظر میں سبھی پیچ و تاب دشمن کے
کہ سہل اُس کو شکست اپنی بھول جانا نہیں

ہے اکتساب کی دُھن ہم کو سو مزاج اپنا
مکالمانہ ہے عالی مناظرانہ نہیں

غزل

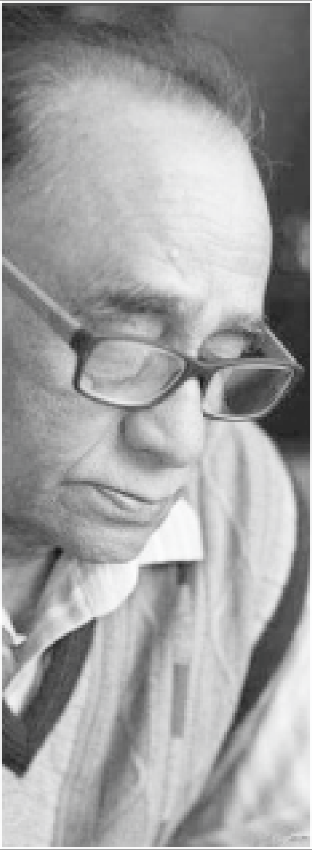

انور شعور

دل میں بنا پڑی تھی دیوار و در سے پہلے
ہم نے تمھیں چُنا تھا پہلی نظر سے پہلے

ویرانۂ جہاں میں کیسا سکوت ہو گا
اس ہاو ہُو سے پہلے، اس شور و شر سے پہلے

پھر آج ہو گئے ہیں خواب و خیال روشن
فرصت نہیں ملے گی اب رات بھر سے پہلے

ہم درمیان میں ہیں، تقسیم ہو تبرک
چاہے ادھر سے پہلے چاہے اُدھر سے پہلے

اب رت جگا ہمارا معمول ہو گیا ہے
دفتر نہیں پہنچتے ہم دوپہر سے پہلے

انور شعور اپنی اصلاح تو کرو تم
آغاز اس عمل کا ہوتا ہے گھر سے پہلے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لڑکھڑا کر دم نہ دے دیں ڈگمگاتی دوریاں
دل میں بجھتی لو کی صورت کپکپاتی دوریاں

غزل

اعجاز کنور راجہ

ہم سمجھتے ہیں ابد گیر، بدل جاتی ہے
دل سے مٹتی نہیں تحریر، بدل جاتی ہے

رات بھر لب پہ دعا ہوتی ہے آزادی کی
دن نکلتا ہے تو زنجیر بدل جاتی ہے

کوئی مقبول دعا میرے ارادوں کے خلاف
سرخ پھولوں سے مرے تیر بدل جاتی ہے

سوچتا کچھ ہوں مگر نوک قلم تک آ کر
دفعتاً صورت تحریر بدل جاتی ہے

ایک سے ہوتے ہیں الفاظ و معانی لیکن
لب بدلتے ہیں تو تاثیر بدل جاتی ہے

وقت کے ساتھ بدلتے ہیں مفسر ایسے
تیری آیات کی تفسیر بدل جاتی ہے

اے مرے مالک و مختار دعاؤں کے طفیل
ہم سمجھتے تھے کہ تقدیر بدل جاتی ہے

حسن سے عشق اگر ہو تو یہی ہوتا ہے
روز دیوار پہ تصویر بدل جاتی ہے

سچ کہنا ہے تو قد کاٹھ ضروری ہے کنور
اس طرح جرم کی تعزیر بدل جاتی ہے

غزلیں

دیکھنا، سمجھے ہیں کیا خوب سمجھنے والے!
مجھ سے دیوانے کو مجذوب سمجھنے والے

تجھ کو رونے کا سلیقہ ہی کہاں آتا ہے؟
آنکھ کو دیدۂ یعقوب سمجھنے والے

ہم نے سقراط کی تقلید ہمیشہ کی ہے
ہم بھی ہیں زہر کو مرغوب سمجھنے والے!

اُسی خوش فہم قبیلے سے تعلّق ہے مرا
زرد پتّوں کو بھی مکتوب سمجھنے والے

عین ممکن ہے، وہی خوب سمجھتے ہوں مجھے
سب مرے خوب کو ناخوب سمجھنے والے

تہ بہ تہ کتنے مفاہیم ہیں پنہاں اس میں
جانتے ہیں مرا اسلوب سمجھنے والے

پیش بینی کی انہیں داد تو بنتی ہے نسیم
وصل کو ہجر کا مندوب سمجھنے والے

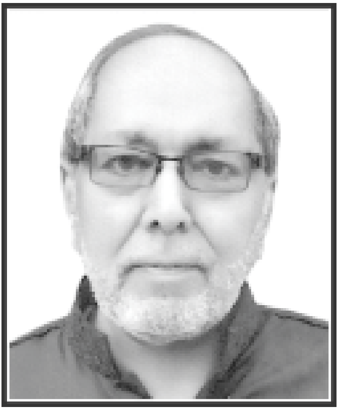

نسیمِ سحر

مَیں خد و خال میں موجود نہیں
وقت کے جال میں موجود نہیں

لوحِ آیندہ پہ تحریر ہوں میں
لمحۂ حال میں موجود نہیں

اُن میں کوئی نہ تلاشے مجھ کو
مَیں پَر و بال میں موجود نہیں!

خشک کچھ ایسی ہوئی ہیں آنکھیں
اشک رومال میں موجود نہیں

اب اُسے ڈھونڈ رہی ہے دُنیا
شہر بھونچال میں موجود نہیں

جس پیادے سے ہوئی شاہ کو مات
اب وہی چال میں موجود نہیں

رنگ و بُو جانے کدھر غائب ہیں
پھول کی شال میں موجود نہیں

پہلے تو دیکھی گئی تھیں، اور اب!
مچھلیاں جال میں موجود نہیں

مجھے درکار ہے وہ لمحہ نسیم
جو مہ و سال میں موجود نہیں

غزلیں

خوابِ عدم میں شام و سحر جاگتا ہوں مَیں
آنکھیں مُندی ہوئی ہیں مگر جاگتا ہوں مَیں

میرے حلیف سمجھے ہُوئے ہیں کہ سو چکا
میرے حریف کو ہے یہ ڈر، جاگتا ہُوں مَیں

حائل ہے اپنی اپنی انا ورنہ کس لیے
بے خواب وہ اُدھر ہے، اِدھر جاگتا ہوں مَیں

دیکھو تو اہلِ ہوش! مرے گھر میں جھانک کر
سویا ہُوا ہے کون اگر جاگتا ہُوں مَیں

مَیں ہُوں شہیدِ عشق سو کُنجِ لحد میں بھی
مِلتی ہے مجھ کو ساری خبر، جاگتا ہوں مَیں

خاور اعجاز

خاک ہو کر آسماں سے رابطہ رکھتا ہُوں مَیں
حرف ہُوں پر داستاں سے رابطہ رکھتا ہُوں مَیں

میرے باغِ فکر میں کِھلتی ہیں تازہ کونپلیں
اِک بہارِ بے خزاں سے رابطہ رکھتا ہُوں مَیں

عہدِ رفتہ سے نہیں ٹوٹا ابھی تک سلسلہ
اِک جھروکا ہے جہاں سے رابطہ رکھتا ہُوں مَیں

گرد ہو کر بھی نہیں چھوڑا ہے راہِ شوق کو
یعنی اُس کے کارواں سے رابطہ رکھتا ہُوں مَیں

ڈھونڈتی پھرتی ہے برقِ بے اماں خاور مجھے
پھر بھی اپنے آشیاں سے رابطہ رکھتا ہُوں مَیں

غزل

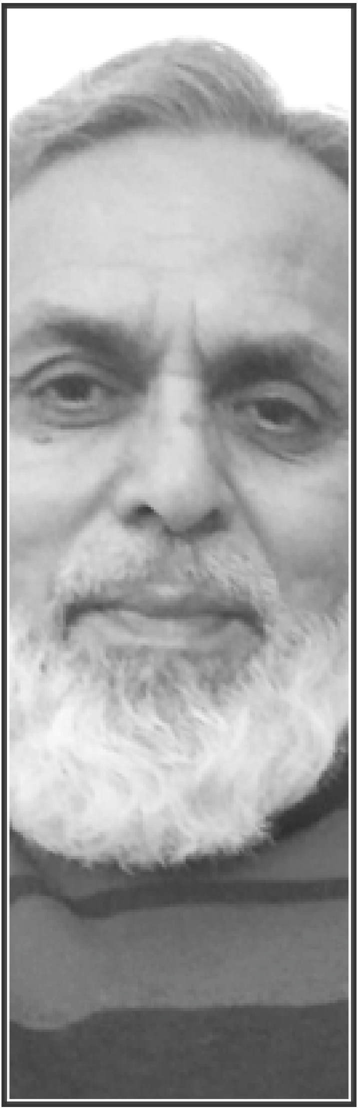

محمد انیس انصاری

دھوپ نگری میں خنک چھاؤں بچھاتا میں ہوں
آنے والوں کے لیے پیڑ لگاتا ہوں ہوں

ننھے بچّوں کو قلم اور کتابیں دے کر
شہر میں علم کی آواز اُٹھاتا میں ہوں

روز سورج کو سمندر سے اُٹھا لاتا ہوں
روز اِس طاق میں اک شمع جلاتا میں ہوں

شب گئے، گونجتی ہے میری اذاں کی آواز
اپنی سوئی ہوئی بستی کو جگاتا میں ہوں

روک کر بازوئے ہمت سے نشے کا سیلاب
اپنے فردا کو اندھیروں سے بچاتا میں ہوں

پوش بستی کے مکینوں کو بتائے کوئی
جھونپڑی میں بھی نئے محل بناتا میں ہوں

پہلے بچّوں کو میں پاؤں پہ کھڑا کرتا ہوں
پھر بتدریج اُنھیں چلنا سکھاتا میں ہوں

پہلے تصویر بناتا ہوں تری جانِ انیس!
دیر تک پھر ترے چہرے سے ملاتا میں ہوں

غزل

سُو بسُو عکسِ رُخِ تاب کا پیچھا کرتے
عمر کاٹی شبِ مہتاب کا پیچھا کرتے

ہم کسی ساحلِ خوش بخت پہ موجیں گنتے
ہم کسی گوہرِ نایاب کا پیچھا کرتے

ہم کسی ریشمی رستے کے مسافر بنتے
ہم کسی منزلِ زریاب کا پیچھا کرتے

وقت ہی دُھوپ کو زنجیر کیے بیٹھا تھا
کس طرح سایۂ شاداب کا پیچھا کرتے

شب کے ہاتھوں پہ اُتر آتا کوئی تازہ گلاب
خواب، گر دیدۂ بے خواب کا پیچھا کرتے

در پہ ٹھہرا ہی نہیں آ کے ستارہ کوئی
کیا شبِ تار میں مہتاب کا پیچھا کرتے

کوئی صدیوں کی مسافت تھی دُکھن اوڑھے ہوئے
کیا کسی لمحۂ بے تاب کا پیچھا کرتے

نثار ترابی

غزل

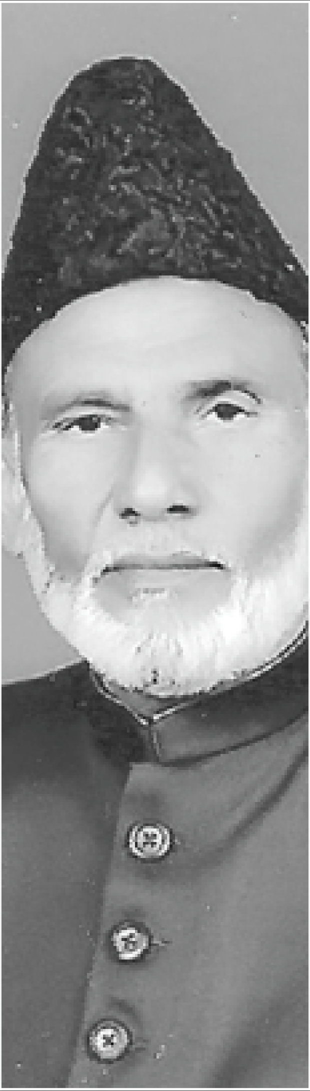

شریف ساجد

بات بے بات خفا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں
اور مجھے بھول گیا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

کوئی دنیا سے نہیں جاتا رضامندی سے
آدمی غم سے رہا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

جھوٹ وہ بولے تو دنیا کو یقیں آ جائے
دشمنِ صدق و صفا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

وہ قنوطیت و یاسیت و غم کا پیکر
غنچہ دل نہ کھلا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

سامنے اس کے کوئی مرتا ہے مر جائے بھلے
دم میں اس کے نہ شفا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

ہم نہ مانیں گے یہ الزام منافق پن کا
اُس نے خود کو ہی کہا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

وہ پریشاں ہے جھٹک کر مرا دامانِ طلب
اذنِ تجدیدِ وفا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

کون لایا ہے اسے راہِ وفا پہ ساجد
خود ہی محسوس کیا ہو، نہیں ایسا بھی نہیں

غزلیں

ضروری کام ہے مگر میں کام کر نہیں رہا
دیے کے ساتھ ان دنوں کلام کر نہیں رہا

وہ شخص میری آنکھ کو بھلا لگا تو ہے مگر
عجیب یہ ہے دل میں وہ مقام کر نہیں رہا

ابھی تمہارے دشت سے غبار اٹھ نہیں رہے
ابھی مرا غزال بھی خرام کر نہیں رہا

ذرا سی دیر بیٹھنا ہے تیری سبز چھاؤں میں
یقین کر میں مستقل قیام کر نہیں رہا

اے جلد باز شخص تجھ سے خاص بات کیا کروں
ابھی میں عام بات کو بھی عام کر نہیں رہا

جو شخص ایک عمر تک سرِ نیاز خم رہا
وہ دور سے بھی آج کل سلام کر نہیں رہا

جو زندگی تھی وہ بھی مجھ ٹھیک سے نہیں کٹی
جو عشق ہے اسے بھی میں مدام کر نہیں رہا

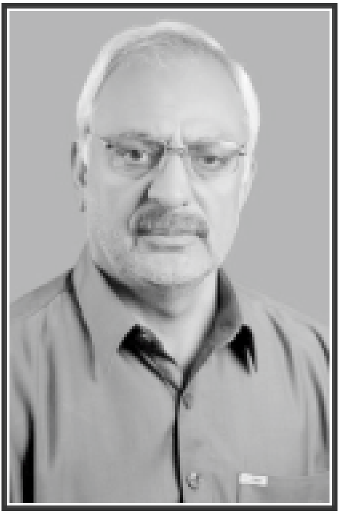

افتخار شاہد

پہلے پہلے تو اشاروں سے بتایا نے
بعد میں حال زبانی بھی سنایا میں نے

ایک دو بار تو دستک بھی ضروری سمجھی
بعد میں شور کیا حشر اٹھایا میں نے

وہ بڑی دیر سے چلمن سے لگی بیٹھی تھی
جانے کیا سوچ کے پردہ نہ اٹھایا میں نے

نقش بگڑے ہیں تو کیا اس میں خطا ہے میری
چاک تیرا تھا فقط اس کو گھمایا میں نے

میں نے دیوار پہ ناخن سے لکیریں کھینچیں
اپنے ہونے کا تو احساس دلایا میں نے

غزل

چھت پر اڑتا بادل دیکھا بھیگ گیا
پھر اکلوتا کچا کوٹھا بھیگ گیا

ٹی وی کی سکرین پہ بارش دیکھی تو
میں کمرے میں بیٹھا بیٹھا بھیگ گیا

وہ تو بینچ پہ چھتری لے کر بیٹھ گئی
میں رستے میں چلتا چلتا بھیگ گیا

دل کی تار پہ یادیں سوکھنے ڈالی تھیں
یاد آیا تو چہرہ سارا بھیگ گیا

ضبط کے آنسو آنکھیں توڑ کے نکلے تو
روتے روتے رات سرہانہ بھیگ گیا

دیپک میں ملہار الاپ کے دیکھا تو
جاتا آتا آتا جاتا بھیگ گیا

بارش بھی کب اوپر نیچے دیکھتی ہے
بارش میں سب اونچا نیچا بھیگ گیا

ایسا کیا تھا حیرانی کے عالم میں
پہلے ٹھٹکا پھر وہ ماتھا بھیگ گیا

جل تھل جل تھل آنکھوں کی پرچھتی پر
اس کاجل سے سارا چھاتا بھیگ گیا

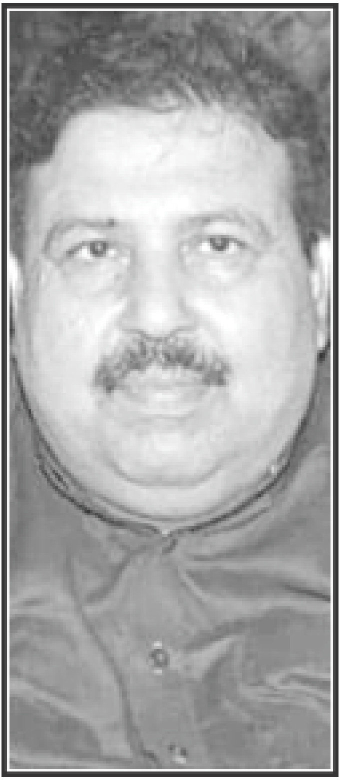

مسعود احمد

غزل

کیا کہوں اپنی کہانی کیا کہوں
مُنہ دکھا کر مُنہ زبانی کیا کہوں

لے گیا وہ جسم و جاں کا سب فریب
دی خِضرؑ نے جو نشانی کیا کہوں

بَن کے پائل تیرے پاؤں میں سجا
پھر بھی تجھ کو بدگمانی کیا کہوں

تجھ کو چھونا بھی ہُوا لطفِ گناہ
تُف تجھے اے زندگانی کیا کہوں

خُلد سے پہلے بھی تھا اپنا مکاں
رُوح کتنی ہے پُرانی کیا کہوں

ہے مُقیّد بے ثباتی میں وجود
کتنے پل کی تھی جوانی کیا کہوں

آئنہ دیکھے نگاہِ مست کو
اے جمالِ جاوِدانی کیا کہوں

سعید جمال

غزل

گھنگھور گھٹا، مست ہوا، یاد کرو گے
منظر یہ محبت کا سدا، یاد کرو گے

دریا کے کنارے پہ وُہ ڈھلتا ہوا سُورج
وہ شام حسیں جلوہ نما، یاد کرو گے

ہر گام مسرت کی فضاؤں کے مناظر
فطرت کی ہمیشہ یہ ادا، یاد کرو گے

تم جانا اگر چاہو نہیں روکیں گے لیکن
اتنا ہے یقیں ہم کو سدا، یاد کرو گے

اتنا دمِ رُخصت ہی ہمیں دوست بتا دو
ہم درد کے ماروں کو بھی کیا، یاد کرو گے؟

ٹپکے جو مری آنکھ سے سچائی کے موتی
موقع یہ محل، صبر و رضا، یاد کرو گے

بس ایک اشارے پہ مری جاں ہے نچھاور
ہوں صاحبِ ایثار وفا یاد کرو گے

آنے نہ دیا حرف کبھی حسنِ وفا پر
مفلس ہوں مگر میری انا، یاد کرو گے

اِخلاص کا پیکر ہے وہ اک بندہ خدا کا
اقبال نے جو دی ہے دُعا، یاد کرو گے

اقبال سروبہ

غزل

جانتا ہوں کہ مرے سامنے آنے کا نہیں
اس لیے خوف مجھے کوئی زمانے کا نہیں

کوئے خوباں میں قدم رکھتے ہوئے سوچا نہ تھا
راستہ اس میں کوئی لوٹ کے آنے کا نہیں

ادھ جلا پیڑ ہوں پتے نہ پرندے مجھ پر
بوجھ تک سائے کا اپنے میں اٹھانے کا نہیں

کھا گئی جانے مجھے کون سی نادیدہ بلا
میں تو دانتوں کے نشاں تک بھی دکھانے کا نہیں

خواب مرضی کا نہ آئے تو یقیناً اس میں
دوش سر کا ہے مری جان سرہانے کا نہیں

میری آنکھوں سے ٹپکتے ہوئے آنسو دیکھو
زخم جو دل پہ لگا ہے وہ دکھانے کا نہیں

ان کو سونے دو یونہی روزِ جزا تک راحت
فائدہ نیند سے مُردوں کو جگانے کا نہیں

راحت سرحدی

غزل

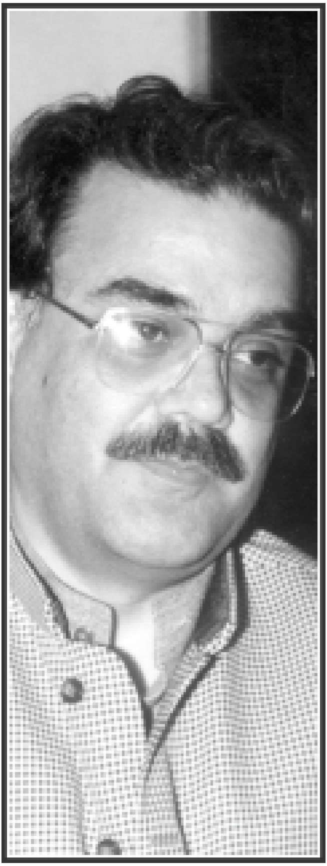

شاہنواز زیدی

وہی آنکھوں میں پوشیدہ اشارے سے، وہی باتوں میں چونکانے معنوں کے
گزرتے وقت نے اب تک نہیں بدلے، ہمارے شہر میں تیور حسینوں کے

رخِ خورشید ہو یا دامنِ مشعل، مرے گھر روشنی دو چار دن کی ہے
انھیں تو ایک دن بجھنا ہی بجھنا ہے، ہوا موجود ہے باطن میں شعلوں کے

بہار آتے ہی محوِ آئینہ ہونا، حسینوں اور پھولوں کی روایت تھی
یہ اہلِ درد کی صحبت میں سیکھے ہیں، گریباں چاک کر لینا قیسوں کے

مکیں اس شہر کے، کوئی انھیں دیکھے، عجب خود ساختہ جیلوں میں رہتے ہیں
گھروں کے شہ دروں پر مستعد درباں، دریچوں پر لگے پنجرے سلاخوں کے

تمھیں طاقت نے اندھا کر دیا ہے ورنہ اتنا تو تمھیں بھی علم ہو گا ہی
کہ تم جتنی بھی کر لو گے زبردستی، کبھی بھی دل نہیں جیتو گے لوگوں کے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دل دھڑکنے پہ بھی آمادہ نہ پایا خالد
ہر نفس گوش بر آواز خدا اپنا تھا

غزلیں

باندھ لی، میں نے بھی، ضد سرکار سے
کام کی نسبت بنے دربار سے

تشنگی کچھ اور جیسے بڑھ گئی
سارے میرے مشغلے بے کار سے

تیوری ماتھے سے جب چھٹنے لگی
نرم پڑنے کے ملے آثار سے

روگ تو ایسا بظاہر کچھ نہ تھا
لوگ کیوں رہنے لگے بیمار سے

ایک آقا اور چند آلۂ کار
باقی ماندہ، جابجا لاچار سے

رخشندہ نوید

خیالوں کی کسی ٹہنی پہ رُک کر جھولتے رہنا
پہیلی کی طرح ہر وقت ہم کو بوجھتے رہنا

مثالِ آئینہ کچھ یاد اس کو کم ہی رہتا ہے
اسے عادت ہے وعدہ کرنا اور پھر بھُولتے رہنا

کسی انجانی راحت کو لیے ہمراہ شاموں میں
کہیں تنہا ہی سڑکوں پہ اکیلے گھومتے رہنا

بہت آساں نہیں ہوتا کسی جذبے کی سنگت میں
بھنورصورت سمندر میں کنارے ڈھونڈتے رہنا

اب ایسے موڑ پر کیا خامشی سے دیکھتے جائیں
کسی ساحل پہ ناؤ کا بھٹک کر ڈوبتے رہنا

غزلیں

یہ راز جرم کی دنیا میں جا کے فاش ہوا
معاش مل نہ سکا تو میں بدمعاش ہوا

ابھی کسی نے اُٹھایا تھا اپنا تیشۂ لفظ
میں اُس کی ضرب سے پہلے ہی پاش پاش ہوا

وہ شخص رات اکیلا تھا اپنے کمرے میں
نہ جانے کیسی اذیت کے بعد لاش ہوا

تمھاری چاپ مجھے رات بھر سنائی دی
پلٹ پلٹ کے دریچے میں ارتعاش ہوا

رہی نہ اپنے شب و روز سے بھی دلچسپی
تمھارے بعد عجب طرزِ بُود و باش ہوا

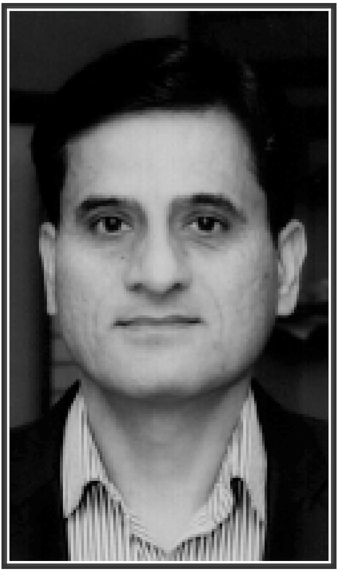

تصدق شعار

کس لیے پھر سرِ تسلیم ہمیشہ خم ہو
جب نہ سجدوں سے مرے دل کی سیاہی کم ہو

کس طرح بیٹھ رہوں گھر میں چراغاں کر کے
میرے اطراف اگر زیست کی لَو مدھم ہو

چھپتا پھرتا ہے مرے دل کے کسی گوشے میں
جس طرح درد مرے واسطے نامحرم ہو

زندگی میں نے گزاری ہے بڑی بے ترتیب
عین ممکن ہے مری فردِ عمل مبہم ہو

کوئی پٹی، نہ کوئی رنگ ہو اقلیت کا
جیسے حالات ہیں ویسا ہی کوئی پرچم ہو

غزلیں

تھام عجلت میں نہ یوں دستِ اجل، اے مرے دل
روٹھ جانے کا یہ موقع نہ محل، اے مرے دل

آگے اک موڑ ہے پھر شام ابد کا رستہ
رہ گئی دور کہیں، صبح ازل، اے مرے دل

گرد ہی گرد ہے اب عمر کے آئینے پر
وہ خدوخالِ مہ و سال، نہ پل، اے مرے دل

چپ کو میں اوڑھ کے بیٹھوں گا ورانڈے میں کہیں
روز و شب میں ترے آئے نہ خلل، اے مرے دل

وقت کی اپنی ہے رفتار، کہاں رکتا ہے
تیرے بس میں تو ترا آج، نہ کل، اے مرے دل

ایک سا راگ یہ دیپک کا جلا دے گا تجھے
تُو کسی گیت، کسی بول میں ڈھل، اے مرے دل

اب بھی، کوئی پرندہ، نہ کوئی باغ نہ گل
کیسا آباد کیا عشق کا تھل، اے مرے دل

قیوم طاہر

پا بُریدہ کہاں اجل رہی ہے
ہر نفس ساتھ ساتھ چل رہی ہے

تہ کرو اب لبادہِ رنگیں
کورے لٹھے کی بات چل رہی ہے

یاد اک لالٹین کی صورت
کمرہ خالی ہے اور جل رہی ہے

ایک نوحہ بنا ہُوا ہے گیت
اک سیاپے میں نظم ڈھل رہی ہے

نم اترنے لگا ہے زیادہ کیا
شکل کیا، آنکھ اب بدل رہی ہے

اک دھوئیں میں وجود ہے میرا
سانس اندر سے یعنی گل رہی ہے

کھو رہا ہوں میں سب چراغوں کو
میری لَو مجھ میں ہاتھ مَل رہی ہے

غزل

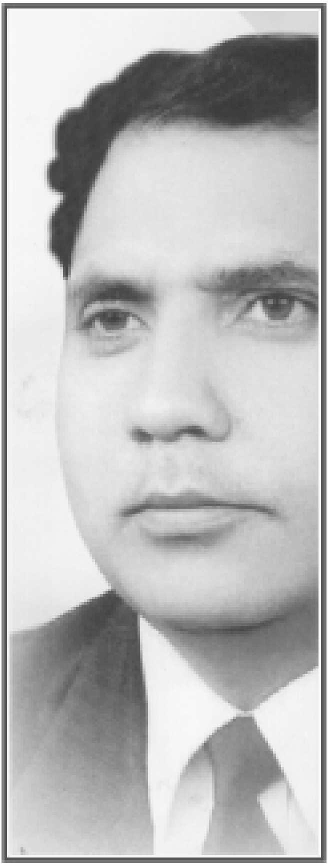

صلیبِ عصر پہ چن چن کے وارے جا رہے ہیں
ہمی پھر سے سرِ مقتل پکارے جا رہے ہیں

ہمی نے خواب دیکھے تھے نویلے موسموں کے
ہمارے سر ہی شانوں سے اتارے جا رہے ہیں

ہمی نے خون دے کر لو چراغوں کی بڑھائی
ہمیں تاریک قبروں میں اتارے جا رہے ہیں

نئی اک اور ہجرت فرض ہوتی جا رہی ہے
یہاں خوابوں پہ بھی شب خون مارے جا رہے ہیں

ہری شاخیں درختوں کی جھلستی جا رہی ہیں
پرندے کوچ کر کے اب تو سارے جا رہے ہیں

نجانے کس گھڑی ہم ہوش میں آئیں گے عرفان
لڑائی غیر کی بازو ہمارے جا رہے ہیں

عرفان صادق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر سمت بس اک رت ہو، ہر سمت یہ چرچا ہو
آنکھیں کہیں امڈی ہوں، بادل کہیں برسا ہو

غزل

ہے عشق بات ذرا احترام سے آگے
یہاں پہ چپ کی ہے وقعت کلام سے آگے

عجب سفر تھا ہمارا، کہ ہم سفر تو رہے
وہ چل رہا تھا مگر ازدہام سے آگے

دعا کا مرحلہ آتا تو مانگتے کھل کر
نماز شوق بڑھی نا قیام سے آگے

تمام کوئی کہانی کبھی نہیں ہوتی
ملے گا قصہ نیا اختتام سے آگے

ہمیش طُرفہ تکلف سے بات بگڑی ہے
نکل سکی نہیں وصلت سلام سے آگے

یہ جا بجا کے شکستہ حروف کہتے ہیں
پیام اور تھا خط کے پیام سے آگے

ہمیں تو نقش کفِ پائے یار کافی تھا
بڑھاتے کیسے قدم خوش خرام سے آگے

شگفتہ نعیم ہاشمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دیوان خالد پڑھے گا یہاں
ہم نوا کیا، کہ اب ہم زباں بھی نہیں

غزل

ڈھلے ڈھلائے درختوں کی دید ہو جائے
ذرا ہوا تھمے ، بارش مزید ہو جائے

میانِ شاخ سے پھوٹے ہری بھری کونپل
اُگے وہ فصل، پرندوں کی عید ہو جائے

کنول کی ناف سے بھنورا نچوڑ لے امرت
گلوں کی باس پہ تتلی شہید ہو جائے

بہار آئے تو آنگن میں قمریاں بولیں
خزاں کی رُت ہو تو سردی شدید ہو جائے

وہ دور ہو تو اداسی ہو بالکونی میں
وہ سامنے ہو تو منظر جدید ہو جائے

ابھی زباں پہ خموشی کے سخت پہرے ہیں
وہ ہونٹ کھولے تو گفت و شنید ہو جائے

کسی قریب کے جنگل میں سرسراہٹ ہو
مگر وہ اُس کی صدا بھی بعید ہو جائے

وہ آ رہا ہے، لیے پھر سے سُرمئی شامیں
کبھی تو یہ بھی اچانک نوید ہو جائے

سخن میں خوب نکھارا ہے آفتاب نے فن
جسے سُنائے غزل ، وہ مُرید ہو جائے

آفتاب خان

غزل

خیال رکھنا تھا اتنا تو یاد آتے ہوئے
میں خود کو بھول نہ جاتا تجھے بھلاتے ہوئے

یہ راز مجھ پہ کھلا جب میں تجھ سے بچھڑا تو
وہ آنسو پونچھتا تھا کیوں غزل سناتے ہوئے

مرے علاوہ کسی کو نہ تھی خبر اس کی
کہ اس کی چیخ کیوں نکلی دیا بجھاتے ہوئے

وہ اپنے پیار کی خوشبو وہ اپنی یاد کا درد
بھلا گیا ہے وہ کیا کیا یہاں سے جاتے ہوئے

بہار اور جوانی کی عمر کتنی ہے
کسی نے سوچا نہ تھا تتلیاں اڑاتے ہوئے

وہ جن کو شہر سے بے دخل ہونا چاہیے تھا
وہ اب بھی پھرتے ہیں گلیوں میں دندناتے ہوئے

گلے میں اس کے تھیں مجبوریوں کی زنجیریں
پلٹ کے دیکھتا جاتا تھا اُٹھ کے جاتے ہوئے

سبھی تھے محو پہاڑی سے پریاں اتری تھیں
وہ رک کے بیٹھ گیا داستاں سناتے ہوئے

ہرن سے دوستی تھی شیر سے شکایت تھی
مگر میں ملتا تھا دونوں سے آتے جاتے ہوئے

گھمائے پھرتے ہو سورج کو رات دن اکرم
گرا نہ دینا اسے اس طرح گھماتے ہوئے

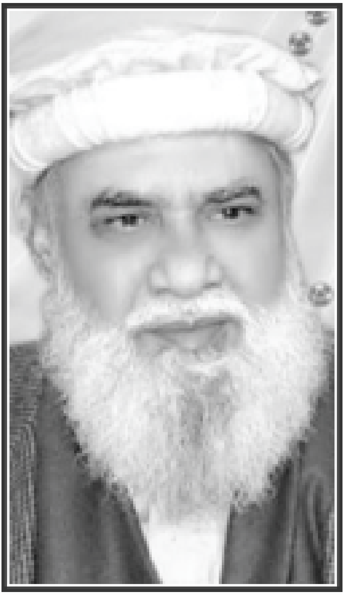

اکرم ناصر

غزل

آ گئے ہوش ٹھکانے اب تو
ہو گئے ختم فسانے اب تو

سادہ لوحوں کی فقط بات نہیں
ہاتھ ملتے ہیں سیانے اب تو

دل کو دیمک نہ کہیں لگ جائے
کوئی آئے بھی چرانے اب تو

برہمی کا نہیں ہے ڈر کوئی
آ گئے یار منانے اب تو

دن ہیں بدلے تو فقط گھوڑے کے
بدلیں میرے بھی زمانے اب تو

اب نئے دوست بنے ہیں روشن
چھوڑ دو درد پرانے اب تو

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا کہوں شہرِ غزالاں کبھی دیکھا ہی نہ تھا
جانِ جاں! میں نے یہ زنداں کبھی دیکھا ہی نہ تھا

غزل

جھیلیں ہیں کوہسار شجر راستے میں ہیں
تُو ساتھ ہے تو برگ و ثمر راستے میں ہیں

شاید کہ بحرِ سیر و سفر راستے میں ہیں
بتلایئے گا آپ اگر راستے میں ہیں

میں بے دھڑک چلا ہوں اُسی راہ پہ جہاں
اک ایک گام سیکڑوں ڈر راستے میں ہیں

مجھ سے کہا گیا تھا بڑے اعتماد سے
اب کے کئی نشانِ سحر راستے میں ہیں

اب اُن کو چاہیے کہ کریں انتظار، ہم
لینے کو اُن کی خیر و خبر راستے میں ہیں

پڑتے ہیں راستے میں کئی بے قرار لوگ
کتنے ہی بے نواؤں کے گھر راستے میں ہیں

ہر گام پر ہے ایک نئے سحر کا اثر
کچھ ایسے بھی پُرانے کھنڈر راستے میں ہیں

معلوم کیا کہ جائیں گے اب کس نگر کی سمت
شہرِ جنوں کے شہر بدر راستے میں ہیں

سینچی ہے ہم نے فصلِ بہاراں کی اک جھلک
اِک اِک قدم پہ برق و شرر راستے میں ہیں

پہنچا جو ہم کو صرف وہ وہم و گمان ہے
ہم کیا کہیں کہ اہلِ خبر راستے میں ہیں

تاریکیوں کا سلسلہ اب تک دراز ہے
لگتا ہے کچھ نجومِ سحر راستے میں ہیں

اے شامِ انتظار ابھی انتظار کر
کچھ سدِّ راہ، اہلِ شرر راستے میں ہیں

جانے سے پیشتر اسے رکھنا خیال میں
ندی کے پاس رقصِ شرر راستے میں ہیں

کام آئے گی نہ ناؤ اکیلی کبھی نبیل
دریا ہیں راستے میں بھنور راستے میں ہیں

آخر نبیل یوں بھی سفر کٹ ہی جائے گا
سایا نہیں اگرچہ شجر راستے میں ہیں

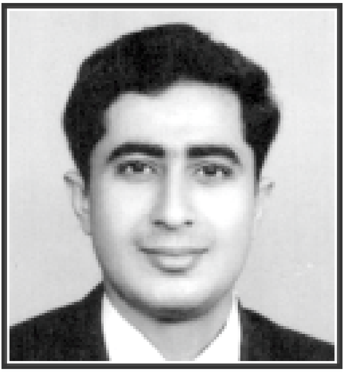

نبیل احمد نبیل

غزل

جھولے ساون کے، وہ بارش وہ گھٹائیں یاد ہیں
کوک کوئل کی ، پپیہے کی صدائیں یاد ہیں

دھڑکنوں میں جذب چاہت کی ادائیں یاد ہیں
بے وفائی کے جلو میں کچھ وفائیں یاد ہیں

چاندنی راتیں، ہوا مہکی ہوئی ، گہرا سکوت
چھپ کے ملتے تھے جہاں ہم وہ گپھائیں یاد ہیں

بن کہے جو کہہ گئے تم یاد ہے اب بھی ہمیں
پوچھ کر ہم سے جو ہیں وہ سب خطائیں یاد ہیں

یاد آتے ہیں ابھی تک وہ انا کے مرحلے
مل کے پھر دونوں نے مانگی جو دعائیں یاد ہیں

تم سے دوری کا وہ غم اس پر زمانے کے ستم
وقت نے جو ہم پہ ہیں ساری جفائیں یاد ہیں

اک تمنا کی تھی دل نے ساتھ تم ہر پل رہو
اس تمنا کی جو پائی تھیں سزائیں یاد ہیں

تسنیم کوثر

غزل

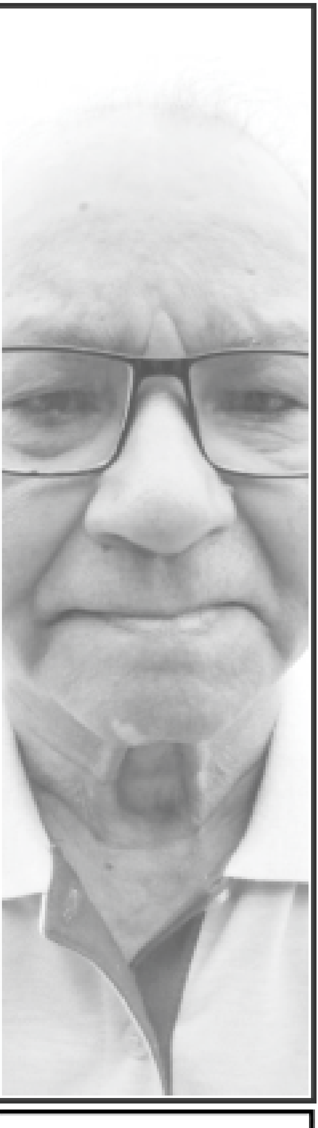

تمھیں مشکل سے پایا ہے ستارو
مجھے للہ زمیں پر مت اتارو

مجھے دیکھو سفر آخر ہے میرا
تمھیں تو دُنیا دیکھے گی، نظارو

جُدائی کے الم تم کو دکھاؤں
کبھی مل بیٹھو دریا کے کنارو

سبھی موسم تمھارے نام کردوں
سنہری شام اک ہمرہ گزارو

ہے کاجل آنکھ میں، کالی گھٹا ہے
سیہ ہے رات، زلفوں کو سنوارو

ستاروں کے سفر میں تھک گیا ہوں
غبارو، اب مجھے نیچے اتارو

میں اپنے آپ میں گم ہوگیا ہوں
مجھے آواز دو اجمل، پکارو

اجمل اعجاز

غزل

تیرے الطاف کی مسند سے اتارے ہوئے لوگ
اپنے ہی آپ سے ہر جنگ میں ہارے ہوئے لوگ

جانے کس قریۂ بے خواب میں آباد ہوئے
تیری آنکھوں کی سحر خیزی پہ وارے ہوئے لوگ

تُو نے جب دیکھا تو سب تیرے طرف دار ہوئے
جو ہمارے تھے وہ پل بھر میں تمھارے ہوئے لوگ

ناؤ ڈوبی تو سمندر نے مجھے ڈھانپ لیا
موج بپھری تو ہر سمت کنارے ہوئے لوگ

ہائے وہ لوگ محبت میں جو برباد ہوئے
کہیں جگنو کہیں آنسو کہیں تارے ہوئے لوگ

اصغر علی بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہاتھ سے لے نکل گئی، شور میں ضربِ ذات کے
ہم ہی تو گر تھے، ہم ہی سَم، زمزمۂ حیات کے

غزل

نور مہتاب میں نہیں صاحب
گیت مضراب میں نہیں صاحب

آسماں میں ہے عکس پانی کا
عکس تالاب میں نہیں صاحب

کچھ حقیقت ہے اس نمائش کی
تو یہ سب خواب میں نہیں صاحب

گالیوں میں بھی ڈھونڈیے خود کو
صرف القاب میں نہیں صاحب!

بادباں سے الجھ پڑی کشتی
موت گرداب میں نہیں صاحب

آج کل ہوں تو بس فراواں ہوں
جنسِ کمیاب میں نہیں صاحب

ورطۂ خواب سے مجھے دیکھو
ورطۂ خواب میں نہیں صاحب

دل وہاں باغ میں کِھلا ہو گا
دل یہاں غاب میں نہیں صاحب

منظر اعجاز منظر

غزل

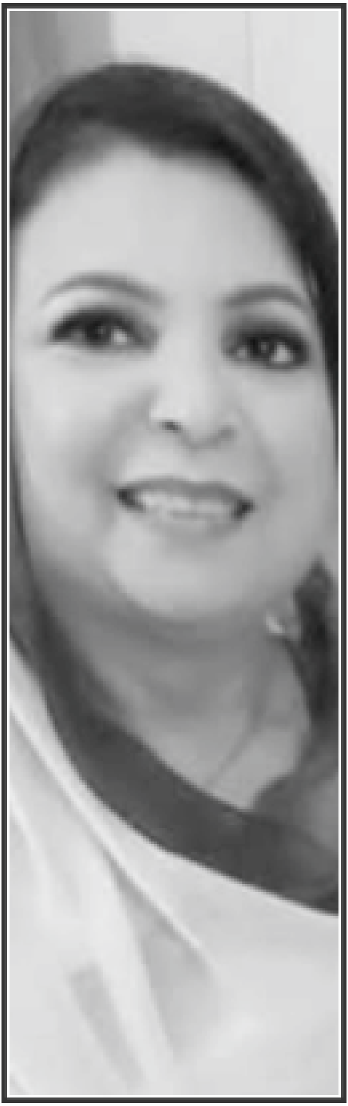

خالدہ انور

غالب و میر کی مثال کہاں
عرض کچھ میں کروں ، مجال کہاں

راہ تکتے ہوئے وفاؤں کی
کٹ گئی عمر ، ماہ و سال کہاں

وقتِ رخصت نظر میں آ بیٹھا
اب تلک تھا یہی سوال کہاں

دشتِ سنسان میں نہیں کوئی
چھپ گئے ہیں سبھی غزال کہاں

بسترِ مرگ پہ جو پوچھا حال
خوب! آیا تمھیں خیال کہاں

باتوں باتوں میں ذکر آ نکلا
یاد آتا ہے خوش خصال کہاں

مرزا غالب! نہیں مثال تری
تجھ سا اب صاحبِ کمال کہاں

غزلیں

دُنیا تو ہم سے جینے کا رشتہ بھی چھین لے
بس میں جو ہو تو منہ کا نوالہ بھی چھین لے

ہم کو بس ایک لمحہ محبت کا چاہیے
ایسا نہیں تو اس کی تمنا بھی چھین لے

اب آ بھی جائے موت جو آنی ہے ایک بار
اور آ کے ہم سے موت کا خدشہ بھی چھین لے

رہزن بہت ہیں راہ میں ایسا نہ ہو کہیں
آنکھوں سے کوئی خواب دریچہ بھی چھین لے

وہ یار آ کے چھین لے آنکھوں سے نیند بھی
ہم سے ندیم خوابوں کی دُنیا بھی چھین لے

ریاض ندیم نیازی

حُسنِ گفتار میں ، اقرار میں کھو جاتے ہیں
سادہ دل لوگ ترے پیار میں کھو جاتے ہیں

خود غرض دنیا سے مطلب نہیں ہوتا اُن کو
جو فقط جذبۂ ایثار میں کھو جاتے ہیں

حُسنِ کردار کی توقیر سمجھتے ہی نہیں
لوگ تو جُبہ و دستار میں کھو جاتے ہیں

خون و دہشت کے سوا کچھ نہیں دِکھتا اُن کو
لوگ جو صبح کے اخبار میں کھو جاتے ہیں

وہ جو میلے میں سدا رہتے ہیں محفوظ ندیم
اپنے ہی شہر کے بازار میں کھو جاتے ہیں

غزل

شبہ طراز

ابد کی راہ میں بیٹھی زمانے بھونتی ہے
اکیلی جان شہر بھر کے دانے بھونتی ہے

خلائیں گھورتی رہتی ہیں اُس کی سُرخ آنکھیں
خلائیں گھورتے کیا کیا نجانے بھونتی ہے

بظاہر پھولتے، گرتے نظر آتے ہیں دانے
مگر وہ کچھ نہ کچھ اندرون خانے بھونتی ہے

وہ بُنتی رہتی ہے صدری سے کے رنگوں سے
یوں ست رنگی ردا کے تانے بانے بھونتی ہے

وہ بھر کے پیٹ کی بھٹی میں سکّے عاجزی کے
سکونِ قلب کے سارے خزانے بھونتی ہے

کبھی دیکھے تھے جو اُس نے محبت کے دنوں میں
وہ میٹھے خواب، وہ سپنے سہانے بھونتی ہے

یُگوں کے جال میں جکڑے ہوئی اک بے بسی کو
گزرتا وقت اور لمحے پرانے بھونتی ہے

غزلیں

اس سے مل کر مرا احساسِ نمو تازہ ہوا
اور پھر میری رگِ جاں میں لہو تازہ ہوا

اپنی تعمیر سے بیگانہ نہیں میں بھی رہا
پئے تخریب اگر میرا عدو تازہ ہوا

موسمِ گل مجھے جینے کی طرف لے آیا
شوخ رنگوں میں مرا شوقِ رفو تازہ ہوا

سجدۂ شکر ادا کرتے ہوئے آنکھ لگی
اور پھر اشکِ ندامت سے وضو تازہ ہوا

اس کی بجھتی ہوئی آنکھوں پہ مجھے پیار آیا
مئے امید انڈیلی تو سبو تازہ ہوا

اکرم جاذب

بے شک مجھے منزل ذرا تاخیر سے ملتی
کچھ خواب کی صورت بھی تو تعبیر سے ملتی

مت ساکت و ساکن رہیں امیدِ کرم پر
قسمت کی عنایت بھی ہے تدبیر سے ملتی

کچھ لوگ بڑے بن کے بھی چھوٹے ہی رہے ہیں
فرصت ہی نہیں ذات کی تشہیر سے ملتی

عجلت میں ملی شے جو ندامت کا سبب ہے
کچھ وقت میں یہ عزت و توقیر سے ملتی

ہر بار اسی واسطے میں جکڑا گیا ہوں
زنجیر نہیں دوسری زنجیر سے ملتی

غزل

جیت میں تھا نہ اپنی مات میں گم
یہ زمانہ تھا حادثات میں گم

ایک حیرت کدہ ہے یہ عالم
جانے کیا کیا ہے کائنات میں گم

مجھ کو اپنی خبر نہیں رہتی
جب میں ہوتا ہوں اس کی ذات میں گم

وقت ایسا بھی آنے والا ہے
دن کو ہونا پڑے گا رات میں گم

گاؤں سے معتبر بزرگ آئے
شہر ہوتا گیا نجات میں گم

ایک کمرے میں چند لوگوں کو
میں نے دیکھا مذاکرات میں گم

وہ قلندر چلا گیا ہے نوید
میں تھا برسوں سے جس کی بات میں گم

محمد نوید مرزا

غزل

ظہور چوہان

اپنی ہی ذات میں زندانی عطا کر دی ہے
لذتِ غم نے یہ آسانی عطا کر دی ہے

خواہشِ وصل ! تجھے دل میں بسایا جس نے
تُو نے اُس شخص کو ویرانی عطا کر دی ہے

نعمتیں سارے زمانے کی مجھے دے دی ہیں
ساتھ ہی بے سرو سامانی عطا کر دی ہے

اس محبت نے مرے دل میں اُترنے کے بعد
ایک بے نام پریشانی عطا کر دی ہے

یہ بھی ممکن ہے کہ منزل ہی نئی ہو میری
اس لیے راہ بھی انجانی عطا کر دی ہے

شاعری ! تیرے طلسمات جگانے کے لیے
میں نے اپنی تجھے حیرانی عطا کر دی ہے

جس نے سب خواب اٹھائے مری آنکھوں سے ظہور
اُس نے خوابوں کی فراوانی عطا کر دی ہے

غزل

آہیں ہیں کہ رُکتی نہیں نالہ نہیں جاتا
بن جائے ہتھیلی کا جو چھالا نہیں جاتا

جس دن سے محبت کا تیری چمکا ہے سورج
اس دن سے میرے گھر کا اُجالا نہیں جاتا

جس شوخ کو اک بار بسا لیتے ہیں دل میں
اس شوخ کو پھر دل سے نکالا نہیں جاتا

کرنا ہے تو پھر کیجیے اقرار محبت
کام آج کا کل پر کبھی ٹالا نہیں جاتا

اک آگ سی دل میں جو سلگتی ہے شب و روز
اس آگ پر پانی بھی تو ڈالا نہیں جاتا

کیا تھام سکیں گے وہ کسی گرتے ہوئے کو
آپ اپنا ہی خود جن سے سنبھالا نہیں جاتا

وہ نام جسے عشق کی نسبت ملے اشفاق
اس نام کا تا عمر حوالہ نہیں جاتا

محمد اشفاق بیگ

غزل

خوابوں میں ایک خواب تھا جیسے سراب سا
الجھے ہوئے سوال ادھورے جواب سا

لہجے میں اتنی تلخیاں آئیں کہاں سے تھیں
"ہم دیکھتے ہی رہ گئے چہرا گلاب سا"

دیتا رہا فریب مجھے چاہتوں کا وہ
چہرے سے جب تلک نہ وہ اترا نقاب سا

طے تھا بچھڑنا اسکا مگر حوصلہ نہ تھا
حائل تھا فیصلے میں یہ کیسا حجاب سا

تعبیر ڈھونڈنے میں زمانے گزر گئے
لگتا ہے اب وہ خواب بھی مجھ کو عذاب سا

مل تو رہا تھا گرچہ وہ مجھ سے تپاک سے
لہجے میں جانے کیوں تھا کوئی اجتناب سا

ملتا نہ ہو مزاج تو کٹتا نہیں سفر
لگتا ہے خار خار یہ رستہ گلاب سا

نائلہ راٹھور

غزل

میتھیو محسن

داغِ دل جب مہکنے لگتا ہے
باغِ ہستی چہکنے لگتا ہے

اُن کے اِک زیرِ لب تبسم سے
غنچہ غنچہ مہکنے لگتا ہے

دیکھ کر مست مست آنکھوں کو
سارا عالم بہکنے لگتا ہے

ہونٹ اگر سی بھی لیں تو آنکھوں سے
رازِ الفت ٹپکنے لگتا ہے

جب وہ کرتے ہیں پیار کی باتیں
اور بھی دل دھڑکنے لگتا ہے

اُن کے طرزِ گریز سے محسن
کیوں تعلق جھلکنے لگتا ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عمر بھر اک زخم کی ہم پردہ داری کر تھکے
آج کی شب کانچ کی دیوار ہو جائیں گے ہم؟

غزل

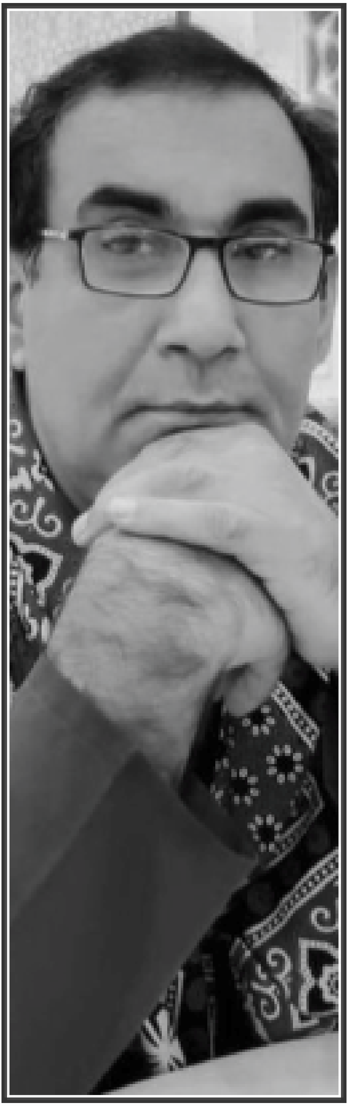

دوام رہتا نہیں ہے دوام بالآخر
ہر ایک صبح کی ہوتی ہے شام بالآخر

لپیٹ دے گا وہ جس نے بچھا رکھی ہے بساط
نہیں رہے گا کسی کا بھی نام بالآخر

پگھل رہا ہے جو لاوہ ذرا ابلنے دو
سوال پوچھیں گے مل کر غلام بالآخر

امیرِ شہر سمجھنے میں دیر کر دے گا
بچا نہ پائے گا وہ احترام بالآخر

ہمارے گاؤں کے لڑکے جوان ہونے دو
وہ اس نظام کو دیں گے لگام بالآخر

محل سراؤں کے دیوار و در بتا رہے ہیں
کہ ہونے والا ہے اب انہدام بالآخر

تمام آئنے لوگوں نے توڑ ڈالے ہیں
صغیر مل گیا تجھ کو بھی کام بالآخر

صغیر احمد صغیر

غزل

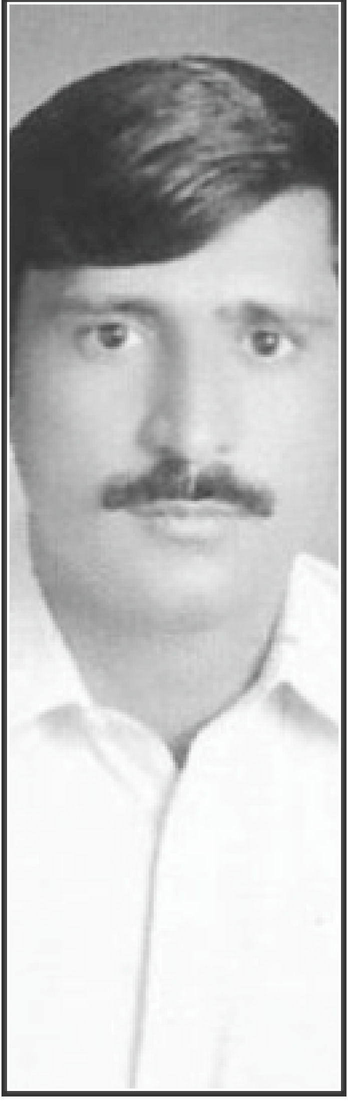

خلوص و مہر و محبت کے گیت گاتا جا
دیارِ پاک کو جنت نما بناتا جا

ترے لہو کی ضرورت ہے تیری دھرتی کو
"تمام اجڑی ہوئی بستیاں بساتا جا"

وہ تیری بات پہ ناراض ہو، تو ہو جائے
بس ایک بار اسے آئینہ دکھاتا جا

سنا ہے تشنہ لبوں سے تجھے عقیدت ہے
مثالِ ابر مری پیاس بھی بجھاتا جا

متاعِ جان لٹا دوں گا اک اشارے پر
اگر یہ شرطِ محبت ہے آزماتا جا

نہیں ہے ظلم کا کردار جس کہانی میں
خدا کے واسطے وہ داستاں سناتا جا

جہانِ ہجر کی لذت عجیب لذت ہے
متاعِ ہجر کو دانش گلے لگاتا جا

اعجاز دانش

غزل

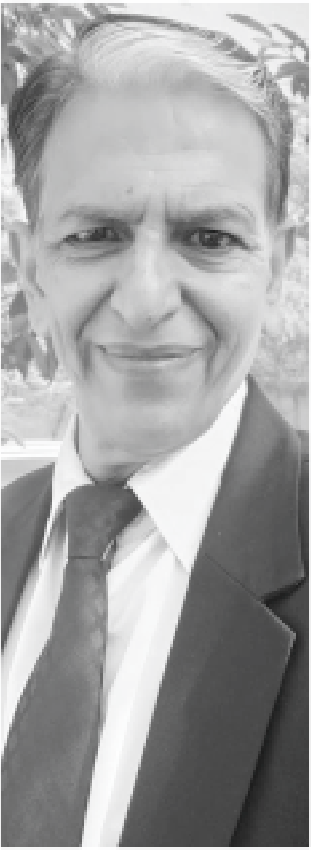

پیار کو جو اشد نہیں کرتے
لمحے ان کی مدد نہیں کرتے

زندگی بھی قمار خانہ ہے
ہم حقیقت کو رد نہیں کرتے

اپنے دشمن بھی ساتھ رکھتے ہیں
ہم کسی سے حسد نہیں کرتے

پیڑ اپنی زمیں میں بویا کر
پیڑ گملے میں قد نہیں کرتے

بد نظر سے بچائیے خود کو
یوں عیاں خال و خد نہیں کرتے

ساتھ عابد نبھا ہی دیتے ہیں
بے وفائی کی حد نہیں کرتے

عابد معروف مغل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس نے آنکھیں بھر دیں خالد
کس نے دھول میں پھول کھلایا

غزل

وقت لگا بات سمجھنے اور سمجھانے میں
میں نے رہنا سیکھ لیا پاگل خانے میں

فنکاری کرنا پڑتی ہے ہنسنے ہنسانے کی
کتنی مشکل پیش آئی زخم چھپانے میں

وصل کے لمحے سے پہلے آدھی عمر کٹی
آدھی عمر کٹے گی اب ہجر منانے میں

پھر سے راکھ میں چنگاری کوئی کرید نہ دے
میں نے ہاتھ جلا ڈالے آگ بجھانے میں

میرے گھر سے تیرا گھر دور ہی کتنا ہے
خوب تکلف برتا ہے آنے جانے میں

مجھ سے دل نے نازک سی کی ہے سرگوشی
تُو نے کچھ محسوس کیا ہاتھ مِلانے میں

دریا کم ہوتے ہوتے آخر سوکھ گیا
دیر بہت کر دی میں نے پھول بہانے میں

خود کو ڈھونڈنے نکلا ہوں خالی رستے پر
شاید دیر لگا دوں میں واپس آنے میں

خود کو پیاسا مرتا ہوا دیکھ رہا ہوں امر
کیا کرنے میں آیا تھا اِس ویرانے میں

امر مہکی

غزل

سلسلہ وار لگاتار کیا جاتا ہے
بارشِ وصل کو ہموار کیا جاتا ہے

آپ جیسوں سے محبت نہیں کرتا کوئی
آپ جیسوں کو گنہگار کیا جاتا ہے

زندگی میں سبھی ہمراز نظر آتے ہیں
رازداں کو پسِ دیوار کیا جاتا ہے

ایک ہی وار سے ہم ٹوٹ نہیں سکتے ہیں
ایک ہی وار لگاتار کیا جاتا ہے

اے مرے وعدہ فراموش محبت کے طفیل
ہر کسی کو کہاں سرشار کیا جاتا ہے

جس پہ امید نہیں ہوتی ثمر کی اس کو
باغِ حیرت میں ثمربار کیا جاتا ہے

مجھ کو معلوم ہے میں تنہا کھڑا ہوں لیکن
ہر کسی کو کہاں بیمار کیا جاتا ہے

بھولی بسری ہوئی یادوں کو اجاگر کر کے
ہم کو پھر آپ کا بیمار کیا جاتا ہے

وادیٔ عشق میں حیرت کی فضا ہے سو ندیم
چیخنے والوں کا پرچار کیا جاتا ہے

ندیم ملک

غزل

یہ بات سچ ہے کہ سب کو خدا سے ملتا ہے
مگر وہ کہتا ہے: سعیِ صفا سے ملتا ہے

زمانے بھر کی کتابوں سے بھی نہیں ملتا
وہ اک سبق جو کسی آشنا سے ملتا ہے

کہاں سنا ہے کہاں، ٹھہرو! مجھ کو یاد آیا
تمھارا لہجہ تو اس بے وفا سے ملتا ہے

بلاؤ لوگ کٹہرے میں وہ جو کہتے تھے
جتن سے ملتا ہے یا تو دعا سے ملتا ہے

مجھے خبر ہے مرے گھر نہیں رکیں گے آپ
مزاج آپ کا بادِ صبا سے ملتا ہے

بھنور کو، آندھیوں کو دوش کس طرح میں دوں
برا تو ڈوبنے کا ناخدا سے ملتا ہے

نوید ایسے قبیلے سے ہوں میں وابستہ
جہاں خلوص کا بدلہ جفا سے ملتا ہے

نوید عاجز

غزل

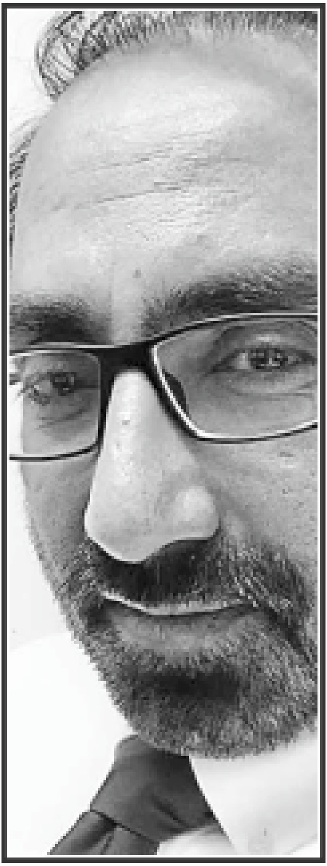

نیم شب کی ساعت ہو اور چاروں اور اندھیرا
جیسے چرخ کے زینے سے اترے گھنگھور اندھیرا

پورن ماشی کے آنگن میں روشنیوں کا رقص
اور اماوس کے بَن میں وحشی منھ زور اندھیرا

دھرتی کے ماتھے پہ روشن سورج کی قندیل
سیارے کی پشت پہ لرزاں گہرا گھور اندھیرا

چودھویں شب ہو اور مہتاب کا روشن ہو فانوس
اور اک غار میں پوشیدہ ہو جیسے چور اندھیرا

ہاتھ میں سرخ شراب کا کوزہ پہلو میں شمشیر
بے خوابی میں لغو مناجاتوں کا شور اندھیرا

رات نے آخر گل کر ڈالا دیکھو سرخ چراغ
شہر کی گلیوں میں در آیا آدم خو اندھیرا

عابد رضا

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

اک قہقہہ کام کر گیا تھا
ہر شخص بہ چشمِ تر گیا تھا

غزلیں

سوچ ہے کنگال کو کھانے لگی
یاد ہے پھر حال کو کھانے لگی

عیب ہے میرا ہنر یہ بول کر
مکڑی اپنے جال کو کھانے لگی

مال دیمک کی طرح کھاتا رہا
اور دیمک مال کو کھانے لگی

قوم نے کھویا نہیں اقبال کو
قوم تو اقبال کو کھانے لگی

وقت کا احساس حیدر تب ہوا
اک گھڑی جب سال کو کھانے لگی

جس نظر میں رہے زر کی قیمت
کچھ نہیں ایسی نظر کی قیمت

تم نے دیکھی نہ جڑوں کی حالت
خاک سمجھو گے شجر کی قیمت

دل نے اُس گھر کو مکاں مان لیا
وہ لگاتے رہے گھر کی قیمت

اب تو سر قابلِ سودا ہی نہیں
اب نہیں ہے کوئی سر کی قیمت

وہ دریچہ ہے اُسے کیا معلوم
پوچھ دیوار سے در کی قیمت

بیش قیمت ہے ہر اک پل یارو
ہو جدھر سمجھو اُدھر کی قیمت

رکھ دیا سوچ کے حیدر یہ قلم
کون سمجھے گا ہنر کی قیمت

تراب حیدر

غزل

حسین امجد

بچائے رکھتی نہ اب تک وہ ایک ذات مجھے
تو کب کا روند چکی ہوتی کائنات مجھے

میں بھوک، پیاس کی شدت سے مر گیا ہوتا
تمھاری زندہ دلی دے گئی حیات مجھے

چراغ ایک بمشکل بچا لیا ورنہ
اندھیرا آج بھی دینے لگا تھا مات مجھے

ہنسی، مذاق میں اک بات جو کہی تھی کبھی
عجیب بات ہے بھولی نہیں وہ بات مجھے

گمان میں بھی نہیں تھا کہ اب حسین امجد
پرانے گھر سے ملیں گے نوادرات مجھے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ سانس بچ رہے تھے سو وہ سانس بھی لیے
وعدہ خلاف تھے، سو ترے بعد جی لیے

غزل

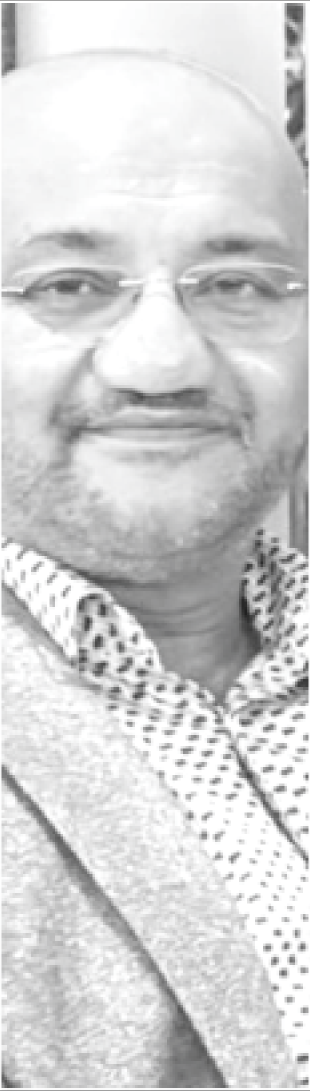

تقدیر میں الجھا تھا مَیں تدبیر سے پہلے
زنجیر ہی تھی پاؤں میں زنجیر سے پہلے

پھر پھول کئی تازہ کھلے صحنِ سخن میں
ویران تھا شعروں کا چمن میر سے پہلے

ہم جنگ سے پہلے ہی محبت سے ہوئے قتل
گھائل تری نظروں نے کیا تیر سے پہلے

اوصاف سبھی بُغض ترا کھا گیا میرے
انصاف تو کر لیتا تو تُعزیر سے پہلے

واعظ ! نہ سنا قصے مجھے من گھڑت اپنے
تُو ترجمہ پڑھ لے نئی تفسیر سے پہلے

نعمان ! بھلا کس کی نظر کھا گئی اس کو
اجڑا ہے گھروندا مرا تعمیر سے پہلے

نعمان محمود

غزل

محبت اک صداقت ہے، وفا تقدیر کا پہلو
جدائی بھی تو رکھتی ہے کوئی تنویر کا پہلو
کلیم اللہ کی راہوں میں بھی ہجرت تھی مقدر جو
نہ بدلا ان کے سائے میں کوئی تاثیر کا پہلو

اگر سچا ہو پیمانِ وفا، کیوں خوفِ فرقت ہو؟
کہ سب آہوں کے پردے میں ہے اک تسخیر کا پہلو
محبت میں بچھڑنے کا بھی اک مفہوم ہوتا ہے
یہی ہوتا ہے اہلِ عشق کی تقصیر کا پہلو

مگر انسان کمزوروں کی بستی میں مکیں ٹھہرا
کہیں خواہش کا لمحہ ہے، کہیں تقدیر کا پہلو
متیں دیکھے یہ دل کے آئنے میں عکسِ ہستی کو
کہ ہر ظلمت میں پنہاں ہے کوئی تحریر کا پہلو

خدا نے دس ہی احکامِ وفا موسیٰ کو جو بخشے
کہ رہ جائے بقا میں بھی کوئی تدبیر کا پہلو

مرزا متین الرحمٰن

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

سایہ گر تھا، انبساطِ لازوال اُس کے لیے
موت تھی، برگِ نہالِ نَو جمال اُس کے لیے

غزل

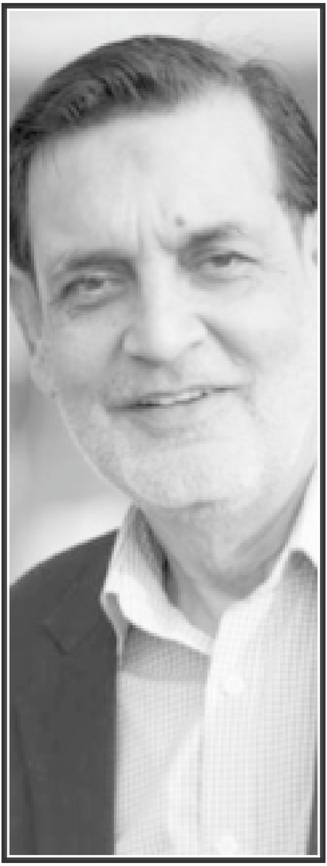

حسن پرویز سیّد

باقی سے الگ تو بھی باقی سے جدا میں بھی
ہوں اپنے ارادوں میں مرضی کا خدا میں بھی

میری بھی ضرورت تو تیری بھی ضرورت میں
تو خالقِ بخشندہ ، بندہِ خطا میں بھی

تجھ کو بھی شکایت ہے ناشکریٔ نعمت کی
اس اپنی خرابی کا کرتا ہوں گِلہ میں بھی

تو نے بھی انہیں بخشی محمود کی اونچائی
اعزازِ نبوت کے خاتم پہ فدا میں بھی

تھا دعویٰ تیرا کی لیکن جب اسے دیکھا
اُن جھیل سی آنکھوں میں خود ڈوب گیا میں بھی

سیّد ہوں، شرف حق ہے، لیکن یہ بِلا شک ہے
طوفانِ حوادث میں محتاجِ دعا میں بھی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ہجر کا غم کچھ اور ہے ، آنکھ کا نم کچھ اور شے
زیرِ چراغ آگہی نورِ ہنر نہیں تو کیا

غزل

ہوا کے سرد جھونکوں میں کوئی پیغام رہتا ہے
محبت کی کہانی کا ابھی انجام رہتا ہے

طلب ہو جس کو شہرت کی اسے اب کیا کہا جائے
جو خود کو جان لیتا ہے، وہی گم نام رہتا ہے

یقیناً ضبط کی حد سے وہ پھر اک بار گزرے گا
کہ ان ہونٹوں پہ میرے نام کا الزام رہتا ہے

در و دیوار سنتے ہیں ابھی تک اس کی آہٹ کو
محبت کا ہمارے شہر میں بھی نام رہتا ہے

مری بستی میں خوشیوں کی بہاریں اب نہیں آتیں
کہیں پت جھڑ، کہیں بارش، کہیں کہرام رہتا ہے

نہ رستہ ختم ہوتا ہے، نہ سایہ ساتھ دیتا ہے
تمھاری یاد کا ہاتھوں میں اب بھی جام رہتا ہے

جو لمحہ ہاتھ آ جائے، وہی بے رنگ ہو جائے
یہاں ہر خواب محوِ گریہ و آلام رہتا ہے

نگاہوں سے اگرچہ خواب سب رخصت ہوئے لیکن
تمھارا عکس ہر منظر میں صبح و شام رہتا ہے

محبت کی زمیں میں کچھ پرانے زخم تازہ ہیں
تمھاری یاد کا اب بھی دلوں پر جام رہتا ہے

یہ اہلِ فقر کی دنیا عجب دنیا ہے دیکھو زینؔ
یہاں جو خاص ہوتا ہے وہ بن کے عام رہتا ہے

عبدالرؤف زین

غزلیں

میں ترے ساتھ بھی اکیلا ہوں
ایک میں ہوں کہ تیرا سایہ ہوں

میں سمندر میں ڈوب کر نکلا
تیری آنکھوں میں آج ڈوبا ہوں

تیری مجھ پہ نظر نہیں پڑتی
میں تجھے دیکھتا ہی رہتا ہوں

تلخ لہجہ سمجھ میں آیا ہے
میں تری کوئی بات سمجھا ہوں

پھر تری خامشی نے مار دیا
پھر سرِ کوئے یار رویا ہوں

تصدق فرید

یار تو بھی نہیں بنا میرا
پہلے کیا کچھ نہیں لٹا میرا

اب مرے ساتھ جاگتا ہی نہیں
مجھ سے ناراض ہے دیا میرا

آنکھ ، دل اور دماغ ملتے نہیں
جسم ثابت جدا جدا میرا

وقت پہ اس نے وقت لوٹا ہے
وقت ہاتھوں سے چھن گیا میرا

پوچھتا وجہِ بے وفائی فرید
وقت دیتا اگر خدا میرا

عبداللہ بن اُبَیّ

پیروز بخت قاضی

مدینہ طیبہ میں رسولؐ اللہ کی تشریف آوری سے پہلے اوس اور خزرج کے قبیلے آپس کی خانہ جنگیوں سے تھک کر ایک شخص کی قیادت وسیادت پر قریب قریب متفق ہو چکے تھے اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اس کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاجپوشی کی رسم ادا کر دیں حتیٰ کہ اس کے لیے تاج بھی بنا لیا گیا تھا۔ یہ قبیلۂ خزرج کا رئیس عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول تھا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلۂ خزرج میں اس کی بزرگی بالکل متفق علیہ تھی۔ اور اوس وخورج اس سے پہلے کبھی ایک شخص کی قیادت پر جمع نہیں ہوئے تھے۔

ابن ہشام اس وقت کے حالات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جب اسلام کا چرچا مدینہ پہنچا اور ان دونوں قبیلوں کے بااثر آدمی مسلمان ہونے شروع ہو گئے۔ ہجرت سے پہلے بیعتِ عقبۂ ثانیہ کے موقع پر جب رسول اللہ کو مدینہ طیبہ تشریف لانے کی دعوت دی جا رہی تھی اس وقت حضرت عباس بن عُبادہ بن نضلہؓ انصاری اس وقت کو صرف اس مصلحت سے موخر کرنا چاہتے تھے کہ عبداللہ بن ابی بھی بیعت اور دعوت میں شریک ہو جائے، تاکہ مدینہ بالاتفاق اسلام کا مرکز بن سکے۔ لیکن جو وفد بیعت کے لیے حاضر ہوا تھا اس نے اس مصلحت کو کوئی اہمیت نہ دی اور اس کے تمام شرکاء جن میں دونوں قبیلوں کے 75 آدمی شامل تھے، ہر خطرہ مول لے کر حضورؐ کو دعوت دینے کے لیے تیار ہو گئے۔

نبوت کے بارھویں سال حج کے موقع پر 75 نفوس کا وہ وفد نبیؐ سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بل کہ آپ کو اور آپ کے پیروؤں کا رکو اپنے گھر میں جگہ دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلام کی تاریخ میں ایک انقلابی موقع تھا جسے خدا نے اپنی عنایت سے فراہم کیا اور نبیؐ نے ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیا۔ اہلِ یثرب نبیؐ کو محض ایک پناہ گزین کی حیثیت سے نہیں بل کہ خدا کے نائب اور اپنے امام اور فرمانروا کی حیثیت سے بلا رہے تھے۔ اور اسلام کے پیروؤں کو ان کا بلاوا اس لیے نہ تھا کہ وہ ایک اجنبی سرزمین میں محض مہاجر ہونے کی حیثیت سے جگہ پالیں بل کہ مقصد یہ تھا کہ عرب کے مختلف قبائل اور خطوں میں جو مسلمان منتشر ہیں وہ یثرب میں جمع ہو کر اور باہم مل کر ایک منظم معاشرہ بنالیں۔ اس طرح یثرب مدینۃ الاسلام کی حیثیت اختیار کر گیا۔ مسلمانوں نے ایک ایک دو دو کر کے مدینہ کی طرف ہجرت شروع کر دی۔ اور ادھر اہلِ مکہ کو بھنک پڑ چکی تھی اور قریش کی مجلسِ شوریٰ میں طے پایا کہ بنی ہاشم کے سوا تمام خانوادہ ہائے قریش کا ایک ایک آدمی چھانٹا جائے اور یہ سب مل کر محمدؐ کو قتل کر دیں تا کہ بنی ہاشم کے لیے تنہا لڑنا مشکل ہو جائے اور وہ انتقام کے بجائے خون بہا قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ لیکن خدا کے فضل اور حضورؐ کے حسنِ تدبر سے یہ چال ناکام ہو گئی اور آپؐ خیریت سے مدینہ پہنچ گئے۔ اب مکہ کے قریش نے مدینہ کے سردار عبداللہ بن ابی کو خط لکھا کہ تم خود اس سے لڑو یا اسے نکال دو۔ اس پر عبداللہ بن ابی آمادۂ شر ہوا لیکن نبیؐ نے بروقت اس شر کی روک تھام کر دی۔

جب حضور مدینہ پہنچے تو انصار کے ہر گھر میں اسلام اتنا پھیل چکا تھا کہ عبداللہ بن اُبَیّ بے بس ہو گیا اور اس کو اپنی سرداری بچانے کے لیے اس کے سوا کوئی صورت نظر نہ آئی کہ وہ خود بھی مسلمان ہو جائے۔ چنانچہ وہ اپنے ان بہت سے حامیوں کے ساتھ جن میں دونوں قبیلوں کے شیوخ اور سردار شامل تھے، داخلِ اسلام ہو گیا حالانکہ دل ان سب کے جل رہے تھے۔ اور خاص طور پر ابنِ اُبَیّ کو اس بات کا سخت غم تھا کہ رسولؐ اللہ نے اس کی بادشاہی چھین لی ہے۔ کئی سال تک اس کا یہ منافقانہ ایمان اور اپنی ریاست چھن جانے کا یہ غم طرح طرح کے رنگ دکھاتا رہا۔ ایک طرف (بقول ابن ہشام) حال یہ تھا کہ ہر جمعہ کو جب رسولؐ اللہ خطبہ ارشاد فرمانے کے لیے بیٹھتے تو عبداللہ بن اُبَیّ اُٹھ

کر کہتا "حضرات یہ اللہ کے رسول آپ کے درمیان موجود ہیں ان کی ذات سے اللہ نے آپ کو عزت اور شرف بخشا ہے لہٰذا آپ ان کی تائید کریں اور جو کچھ یہ فرماتے ہیں اسے غور سے سنیں اور ان کی اطاعت کریں۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ روز بروز اس کی منافقت کا پردہ چاک ہوتا چلا جا رہا تھا اور مخلص مسلمانوں پر یہ بات کھلتی چلی جاتی تھی کہ وہ اور اس کے ساتھی اسلام اور رسول اور اہلِ ایمان سے سخت بغض رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ حضورؐ کسی راستے سے گزر رہے تھے کہ ابن اُبَیّ نے آپ سے بدتمیزی کی۔ آپ نے حضرت سعد بن عبادہ سے اس کی شکایت فرمائی تو انھوں نے عرض کیا "یارسول اللہ اس شخص کے ساتھ نرمی برتیئے آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہم اس کے لیے تاجِ شاہی تیار کر رہے تھے۔ اب یہ سمجھتا ہے کہ آپ نے اس سے بادشاہی چھین لی ہے۔" (ابنِ ہشام جلد 2، ص 238-237)

مدینہ پہنچ کر آپؐ نے انصار مدینہ کے دونوں بڑے قبیلوں اوس اور خزرج اور مدینہ میں رہنے والے یہودیوں کے درمیان معاہدے کر کے ایک نئی ریاست کی بنیاد رکھی، جس میں سب کے شہری حقوق برابر متعین کیے گئے اور ہر خطرے اور لڑائی میں ایک دوسرے کا ساتھ دینے اور کسی بھی فریق کے دشمن کا ساتھ دینے سے اجتناب کا عہد کیا گیا۔ لیکن جلدی ہی یہودی قبائل نے معاہدے کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ معاہدے کی خلاف ورزی تو جنگ بدر سے پہلے ہی اختیار ہو گئی تھی لیکن جب بدر میں رسولؐ اللہ اور مسلمانوں کو قریش پر فتح مبین حاصل ہو گئی تو وہ تلملا اُٹھے اور ان کے بغض کی آگ اور زیادہ بھڑک اُٹھی۔ اس جنگ سے وہ یہ امید لگائے بیٹھے تھے کہ قریش کی طاقت سے ٹکرا کر مسلمانوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جنگ بدر کے بعد جب یہود قبیلہ بنی قینقاع کی صریح بدعہدی اور بلا اشتعال سرکشی پر رسولؐ اللہ نے ان سے جنگ کی تو یہ شخص، عبداللہ بن ابی، ان کی حمایت پر اُٹھ کھڑا ہوا اور حضورؐ کی زرہ پکڑ کر کہنے لگا کہ "یہ سات سو مردانِ جنگی، جو ہر دشمن کے مقابلے میں میرا ساتھ دیتے رہے ہیں، آج ایک دن میں آپ انھیں ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں؟ خدا کی قسم، میں آپ کو ہرگز نہ چھوڑوں گا جب تک آپ میرے ان حلیفوں کو معاف نہ کریں گے۔ (ابنِ ہشام جلد 3 ص 53-52)

جنگ اُحد کے موقع پر اس شخص نے صریح غداری کی اور عین وقت پر اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر میدان جنگ سے الٹا واپس آ گیا۔ جس نازک گھڑی میں اس نے یہ حرکت کی تھی اس کی نزاکت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قریش کے لوگ تین ہزار کا لشکر لے کر مدینہ پر چڑھ آئے تھے، اور رسول اللہ ان کے مقابلے میں صرف ایک ہزار آدمی ساتھ لے کر مدافعت کے لیے نکلے تھے۔ ان ایک ہزار میں سے بھی یہ منافق تین سو آدمی توڑ لایا اور حضور کو صرف سات سو کی جمعیت کے ساتھ تین ہزار دشمنوں کا مقابلہ کرنا پڑا۔

اس واقعہ کے بعد مدینہ کے عام مسلمانوں کو یقین کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ یہ شخص قطعی منافق ہے۔ اور اس کے وہ ساتھی بھی پہچان لیے گئے جو منافقت میں اس کے شریک کار تھے۔ اسی بنا پر جنگ اُحد کے بعد جب پہلا جمعہ آیا اور یہ شخص حضور کے خطبہ سے پہلے حسب معمول تقریر کرنے کے لیے اٹھا تو لوگوں نے اس کا دامن کھینچ کر کہا "بیٹھ جاؤ تم یہ باتیں کرنے کے اہل نہیں ہو۔" مدینے میں یہ پہلا موقع تھا کہ اعلانیہ اس شخص کی تذلیل کی گئی۔ اس پر برہم ہو کر وہ لوگوں کی گردنوں پر سے کودتا پھاندتا مسجد سے نکل گیا۔ مسجد کے دروازے پر بعض انصاریوں نے اس سے کہا "یہ کیا حرکت ہے۔ واپس چلو اور رسول اللہ سے استغفار کی درخواست کرو۔" اس نے بگڑ کر جواب دیا "میں ان سے کوئی استغفار نہیں کرانا چاہتا۔" (ابنِ ہشام، جلد 3 ص 111)

پھر سن 4 ھ میں غزوۂ بنی النضیر پیش آیا اور اس موقع پر اس شخص اور اس کے ساتھیوں نے اور بھی زیادہ کھل کر اسلام کے خلاف دشمنوں کی حمایت کی۔ ایک طرف حضور اور مسلمان صحابہ ان یہودی دشمنوں سے جنگ کی تیاری کر رہے تھے اور دوسری طرف یہ منافقین اندر ہی اندر یہودیوں کو پیغام بھیج رہے تھے کہ ڈٹے رہو، ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ تم سے جنگ کی جائے گی تو ہم تمھاری مدد کریں گے اور تم کو نکالا جائے گا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں گے۔ اس خفیہ ساز باز کا راز اللہ تعالیٰ نے کھول دیا۔ سورۃ الحشر 59 میں ارشاد ربانی ہے۔"

"تم نے دیکھا نہیں ان لوگوں کو جنھوں نے منافقت کی روش اختیار کی ہے؟ یہ اپنے کافر اہلِ کتاب بھائیوں سے کہتے ہیں، "اگر تمھیں نکالا گیا تو ہم تمھارے ساتھ نکلیں

گے، اور تمھارے معاملہ میں ہم کسی کی بات ہرگز نہ مانیں گے۔ اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم تمھاری مدد کریں گے۔'' مگر اللہ گواہ ہے کہ یہ لوگ قطعی جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ ہرگز نہ نکلیں گے، اور اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی ہرگز مدد نہ کریں گے اور پھر کہیں سے کوئی مدد نہ پائیں گے۔ ان کے دلوں میں اللہ سے بڑھ کر تمھارا خوف ہے۔ اس لیے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جو کچھ سوجھ بوجھ نہیں رکھتے۔ یہ کبھی اکٹھے ہوکر (کھلے میدان میں) تمھارا مقابلہ نہ کریں گے، لڑیں گے بھی تو قلعہ بند بستیوں میں بیٹھ کر یا دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ یہ آپس کی مخالفت میں بڑے سخت ہیں۔ تم انھیں اکٹھا سمجھتے ہو مگر ان کے دل ایک دوسرے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں۔ (الحشر 59: 11تا14)

اتنا کچھ واضح ہو جانے کے باوجود جس وجہ سے رسول اللہؐ اس کے ساتھ درگزر کا معاملہ فرما رہے تھے وہ یہ تھی کہ منافقین کا ایک بڑا جتھا اس کے ساتھ تھا۔ اَوس اور خزرج دونوں قبیلوں کے بہت سے سردار اس کے حامی تھے۔ مدینے کی آبادی میں کم از کم ایک تہائی تعداد اس کے ساتھیوں کی موجود تھی، جیسا کہ غزوہ اُحد کے موقع پر ظاہر ہو چکا تھا۔ ایسی حالت میں یہ کسی طرح مناسب نہ تھا کہ باہر کے دشمنوں سے لڑائی کے ساتھ ساتھ اندر کے ان دشمنوں سے بھی جنگ مول لے لی جاتی۔ اسی بنا پر ان کی منافقت کا حال جانتے ہوئے بھی حضورؐ ایک مدت تک ان کے ساتھ ان کے ظاہری دعوائے ایمان کے لحاظ سے معاملہ کرتے رہے۔ دوسری طرف یہ لوگ بھی نہ اتنی طاقت رکھتے تھے نہ ہمت کہ علانیہ کافر بن کر اہلِ ایمان سے لڑ لیتے یا کسی حملہ آور دشمن کے ساتھ کھلم کھلا مل کر میدان میں آ جاتے۔ بظاہر وہ اپنا ایک مضبوط جتھا بنائے ہوئے تھے مگر ان کے اندر وہ کمزوریاں موجود تھیں جن کا نقشہ اللہ تعالیٰ نے سورہ حشر کی محولہ بالا آیات میں صاف صاف کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ اس لیے وہ مسلمان بنے رہنے میں ہی اپنی خیر سمجھتے تھے۔ مسجدوں میں آتے تھے، نمازیں پڑھتے تھے، زکوٰۃ بھی دے ڈالتے تھے۔ زبان سے ایمان کے لمبے چوڑے دعوے کرتے تھے جن کے کرنے کی مخلص مسلمانوں کو کبھی ضرورت پیش نہ آتی تھی۔ ان کے پاس اپنی ہر منافقانہ حرکت کے لیے ہزار جھوٹی توجیہیں موجود تھیں جن سے خاص طور پر اپنے ہم قبیلہ انصار کو یہ دھوکا

دینے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم تمھارے قبیلہ انصار کو یہ دھوکا دینے کی کوشش کرتے تھے کہ ہم تمھارے ساتھ ہیں۔ ان تدبیروں سے وہ اپنے آپ کو ان نقصانات سے بھی بچا رہے تھے جو انصار کی برادری سے الگ ہو جانے کی صورت میں ان کو پہنچ سکتے تھے، اور فتنہ پردازی کے ان مواقع سے بھی فائدہ اٹھا رہے تھے جو اس برادری میں شامل رہ کر انھیں مل سکتے تھے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی وجہ سے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھ منافقین کو غزوہ بنی المصطلق کی مہم میں رسولؐ اللہ کے ساتھ جانے کا موقع مل گیا۔ اور انھوں نے بیک وقت دو ایسے عظیم فتنے اٹھا دیئے، جو مسلمانوں کی جمعیت کو بالکل پارہ پارہ کر سکتے تھے، مگر قرآن پاک کی تعلیم اور رسولؐ پاک کی صحبت سے اہل ایمان کو جو بہترین تربیت ملی تھی اس کی بدولت ان دونوں فتنوں کا بروقت قلع قمع ہو گیا اور یہ منافقین الٹا خود ہی رسوا ہو کر رہ گئے۔ ان میں سے ایک فتنہ وہ تھا، جس کا ذکر سورۃ نور میں کیا گیا ہے اور دوسرا فتنہ وہ ہے، جس کا ذکر سورۃ المنافقون میں موجود ہے۔

ذی القعدہ سن 5ھ میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب سے دوسرے کے بیٹے کو اپنا بیٹا اور متبنیٰ بنانے کی جاہلانہ رسم کا خاتمہ کرنے کے لیے خود اپنے متبنیٰ (زید بن حارثہ) کی مطلقہ بیوی (زینب بنت جحش) سے نکاح کیا۔ اس موقع پر مدینے کے منافقین پروپیگنڈا کا ایک طوفانِ عظیم لے کر اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر سے یہود و مشرکین نے بھی ان کی آواز میں آواز ملا کر افترا پرداز پالنا شروع کر دیا۔ انھوں نے یہ قصہ گھڑ کر مشہور کر دیا کہ محمدؐ کس طرح اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی کو دیکھ کر اس پر عاشق ہو گئے۔ اور کس طرح بیٹے کو ان کے عشق کا علم ہوا اور وہ طلاق دے کر بیوی سے دستبردار ہو گیا، اور پھر کس طرح انھوں نے خود اپنی بہو سے بیاہ کر لیا۔ مسلمان تک اس قصہ کے اثرات سے نہ بچ سکے۔ مستشرقینِ مغرب نے خوب نمک مرچ لگا کر اپنی کتابوں میں ذکر کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت زینبؓ نبیؐ کی حقیقی پھوپھی (اُمیمہ بنت عبدالمطلب) کی صاحبزادی تھی۔ بچپن سے جوانی تک ان کی ساری عمر حضورؐ کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی۔ ان کو اتفاقاً ایک روز دیکھ لینے اور معاذ اللہ ان پر عاشق ہو جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر اس واقعہ سے ایک ہی سال پہلے نبیؐ نے خود ان کو مجبور کر کے حضرت زید سے ان کی

شادی کی تھی۔ ان کے بھائی عبداللہ بن جحش اس شادی سے ناراض تھے۔ خود حضرت زینب اس پر راضی نہ تھیں کیونکہ ایک آزاد کردہ غلام کی بیوی بننا قریش کے شریف ترین گھرانے کی بیٹی طبعاً قبول نہ کر سکتی تھی۔ مگر نبیؐ نے صرف اس لیے کہ مسلمانوں میں معاشرتی مساوات قائم کرنے کی ابتدا خود اپنے خاندان سے کریں، انھیں حکماً اس پر راضی کیا تھا۔ یہ ساری باتیں دوست اور دشمن سب کو معلوم تھیں۔ اور یہ بھی کسی سے چھپا ہوا نہ تھا کہ حضرت زینب کا احساسِ فخرِ نسبی ہی وہ اصل وجہ تھی جس کی بنا پر ان کا اور زید بن حارثہ کا نباہ نہ ہو سکا اور آخرِ کار طلاق تک نوبت پہنچی۔ مگر اس کے باوجود بے شرم افترا پردازوں نے نبیؐ پر بدترین اخلاقی الزامات لگائے اور ان کو اس کثرت سے رواج دیا کہ آج تک ان کا یہ پروپیگنڈا اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔

منافقین نے دوسرا حملہ غزوہ بنی المُصطلق کے موقع پر کیا اور یہ پہلے سے بھی زیادہ سخت تھا۔ یہ قبیلہ جو بنی خزاعہ کی ایک شاخ تھی جو بحر احمر کے ساحل پر جدہ اور رابغ کے درمیان مُریسیع نامی چشمے کے آس پاس آباد تھا۔ شعبان سن 6 ھ میں نبیؐ کو اطلاع ملی کہ یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف جنگ کی تیاریاں کر رہے ہیں اور دوسرے قبائل کو بھی جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ آپؐ یہ اطلاع ملتے ہی ایک لشکر لے کر اُن کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس مہم میں عبداللہ بن اُبَی بھی منافقوں کی ایک بڑی تعداد لے کر آپ کے ساتھ ہو گیا۔ ابن سعد کا بیان ہے کہ اس سے پہلے کسی جنگ میں منافقین اس کثرت سے شامل نہ ہوئے تھے۔ مُریسیع کے مقام پر آنحضرتؐ نے اچانک دشمن کو جا لیا اور تھوڑی سی کوشش کے بعد پورے قبیلے کو مال اسباب سمیت گرفتار کر لیا۔ اس مہم سے فارغ ہو کر ابھی لشکر اسلام وہیں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا کہ ایک روز حضرت عمرؓ کے ایک ملازم اور قبیلۂ خزرج کے ایک حلیف کے درمیان پانی پر جھگڑا ہو گیا۔ ایک نے انصار کو پکارا دوسرے نے مہاجرین کو آواز دی۔ دونوں طرف سے لوگ جمع ہو گئے اور معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ لیکن عبداللہ بن اُبَی نے جو انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتا تھا، بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ اس نے انصار کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا کہ ''یہ مہاجرین ہم پر ٹوٹ پڑے ہیں اور ہمارے حریف بن بیٹھے ہیں۔ ہماری اور ان قریشی کنگلوں کی مثال ایسی ہے کہ کتے کو پال تاکہ تجھی کو بھنبھوڑ کھائے۔ یہ سب تمہارا

اپنا کیا دھرا ہے۔ تم لوگوں نے خود ہی انھیں لا کر اپنے ہاں بسایا ہے اور ان کو اپنے مال اور جائیداد میں حصہ دار بنایا ہے۔ آج اگر تم ان سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ چلتے پھرتے نظر آئیں۔“ پھر اس نے قسم کھا کر کہا کہ ”مدینے واپس پہنچنے کے بعد جو ہم میں سے عزت والا ہے وہ ذلیل لوگوں کو نکال باہر کر دے گا۔“ قرآن کی سورۃ منافقون میں خود اللہ تعالیٰ نے اس کا قول نقل کیا ہے۔ ان باتوں کی خبر جب رسولؐ اللہ کو پہنچی تو حضرت عمرؓ نے مشورہ دیا کہ اس شخص کو قتل کرا دینا چاہیے لیکن حضورؐ نے کہا ”عمرو! دنیا کیا کہے گی کہ محمدؐ خود اپنے ہی ساتھیوں کو قتل کر رہا ہے۔“ پھر آپ نے فوراً ہی اس مقام سے کوچ کا حکم دے دیا اور دوسرے دن دوپہر تک کسی جگہ پڑاؤ نہ کیا تا کہ لوگ خوب تھک جائیں اور کسی کو بیٹھ کر چہ میگوئیاں کرنے اور سننے کی مہلت نہ ملے۔ راستے میں اُسید بن حضیر نے عرض کیا ”یا رسولؐ اللہ آج آپ نے اپنے معمول کے خلاف ناوقت کوچ کا حکم دیا؟“

آپ نے فرمایا ”تم نے سنا نہیں کہ تمھارے صاحب (عبداللہ بن اُبی) نے کیا باتیں کی ہیں؟“ انھوں نے عرض کیا ”یا رسول اللہ، اس شخص سے رعایت فرمایئے، آپ جب مدینے تشریف لائے ہیں تو ہم لوگ اسے اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اس کے لیے تاج تیار ہو رہا تھا۔ آپ کی آمد سے اس کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ اسی کی جلن وہ نکال رہا ہے۔“

یہ شوشا ابھی تازہ ہی تھا کہ اسی سفر میں اس نے ایک اور خطرناک فتنہ اٹھا دیا، اور فتنہ بھی ایسا کہ اگر نبیؐ اور آپ کے جانثار صحابہ انتہائی ضبط و تحمل سے اور حکمت و دانائی سے کام نہ لیتے تو مدینے کی نوخیز مسلم سوسائٹی میں سخت خانہ جنگی برپا ہو جاتی۔ یہ حضرت عائشہؓ پر تہمت کا فتنہ تھا۔ اس فتنے کا واقعہ خود حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں:

”رسولؐ اللہ کا قاعدہ تھا کہ جب آپ سفر پر جاتے تو قرعہ ڈال کر فیصلہ فرماتے کہ آپ کی بیویوں میں سے کون آپ کے ساتھ جائے گی۔ غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر قرعہ میرے نام نکلا اور میں آپ کے ساتھ گئی۔ واپسی پر جب ہم مدینے کے قریب تھے ایک منزل پر رات کے وقت آپؐ نے پڑاؤ کیا، اور ابھی رات کا کچھ حصہ باقی تھا کہ کوچ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ میں اُٹھ کر رفع حاجت کے لیے گئی اور جب پلٹنے لگی تو قیام گاہ کے قریب پہنچ کر مجھے محسوس ہوا کہ میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر کہیں

گر پڑا ہے۔ میں اسے تلاش کرنے میں لگ گئی اور اتنے میں قافلہ روانہ ہو گیا۔ قاعدہ یہ تھا کہ میں کوچ کے وقت اپنے ہودے میں بیٹھ جاتی تھی۔ اور چار آدمی اُسے اٹھا کر اونٹ پر رکھ دیتے تھے ہم عورتیں اس زمانے میں غذا کی کمی کے سبب بہت ہلکی پھلکی تھیں۔ میرا ہودہ اٹھاتے وقت لوگوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ میں اس میں نہیں ہوں۔ وہ بے خبری میں خالی ہودہ اونٹ پر رکھ کر روانہ ہو گئے۔ میں جب ہار لے کر پلٹی تو وہاں کوئی نہ تھا۔ آخر اپنی چادر اوڑھ کر وہیں لیٹ گئی۔ اور دل میں سوچ لیا کہ آگے جا کر جب یہ لوگ مجھے نہیں پائیں گے تو خود ہی ڈھونڈتے ہوئے آ جائیں گے۔ اسی حالت میں مجھے نیند آ گئی۔ صبح کے وقت صفوان بن مُعَطّل سُلمی اس جگہ سے گزرے جہاں میں سو رہی تھی اور مجھے دیکھتے ہی پہچان گئے کیونکہ پردے کا حکم آنے سے پہلے وہ مجھے بارہا دیکھ چکے تھے۔'' (یہ صاحب بدری صحابیوں میں سے تھے۔ ان کو صبح دیر تک سونے کی عادت تھی، اس لیے یہ بھی لشکر گاہ میں کہیں پڑے سوتے رہ گئے تھے اور اب اُٹھ کر مدینے جا رہے تھے۔ ابو داؤد اور دوسری کتب سنن میں یہ ذکر آتا ہے کہ ان کی بیوی نے نبیؐ سے ان کی شکایت کی تھی کہ یہ کبھی صبح کی نماز وقت پر نہیں پڑھتے۔ انھوں نے عذر پیش کیا کہ یا رسولؐ اللہ یہ میرا خاندانی عیب ہے۔ دیر تک سوتے رہنے کی اس کمزوری کو میں کسی طرح دور نہیں کر سکتا۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ اچھا جب آنکھ کھلے نماز ادا کر لیا کرو۔ بعض محدثین نے ان کے قافلے سے پیچھے رہ جانے کی یہی وجہ بیان کی ہے۔ مگر بعض دوسرے محدثین اس کی یہ وجہ بیان کرتے ہیں کہ نبیؐ نے ان کو اس خدمت پر مامور کیا تھا کہ رات کے اندھیرے میں کوچ کرنے کی وجہ سے اگر کسی کی کوئی چیز چُھوٹ گئی ہو تو صبح اسے تلاش کر کے لیتے آئیں۔

حضرت عائشہؓ آگے بیان فرماتی ہیں کہ ''مجھے دیکھ کر صفوانؓ نے اونٹ روک لیا اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا ''انا للہ وانا الیہ رجعون'' رسولؐ اللہ کی بیوی یہیں رہ گئیں۔'' اس آواز سے میری آنکھ کھل گئی اور میں نے اُٹھ کر فوراً اپنے منہ پر چادر ڈال لی۔ انھوں نے مجھ سے کوئی بات نہ کی، بس اپنا اونٹ میرے پاس بٹھا دیا اور الگ ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔ میں اونٹ پر سوار ہو گئی اور وہ نکیل پکڑ کر روانہ ہو گئے۔ دوپہر کے قریب ہم

نے لشکر کو جالیا جب کہ وہ ابھی ایک جگہ جا کر ٹھہرا ہی تھا اور لشکر والوں نے کو ابھی یہ پتہ نہ چلا تھا کہ میں پیچھے چھوٹ گئی ہوں۔ اس پر بہتان اٹھانے والوں نے بہتا اٹھا دیے اور ان میں سب سے پیش پیش عبداللہ بن اُبَی تھا۔ مگر میں اس سے بے خبر تھی کہ مجھ پر کیا باتیں بن رہی ہیں۔''

دوسری روایات میں آیا ہے کہ جس وقت صفوان کے اونٹ پر حضرت عائشہؓ لشکر گاہ میں پہنچیں اور معلوم ہوا کہ آپ اس طرح پیچھے رہ گئی تھیں اسی وقت عبداللہ بن اُبَی پکار اٹھا کہ ''خدا کی قسم یہ بچ کر نہیں آئی ہے، لو دیکھو تمھارے نبی کی بیوی نے رات ایک اور شخص کے ساتھ گزاری اور اب وہ اسے علانیہ لیے چلا آرہا ہے۔''

عائشہؓ مزید فرماتی ہیں کہ ''مدینے پہنچ کر میں بیمار ہوگئی اور ایک مہینے کے قریب پلنگ پر پڑی رہی۔ شہر میں اس بہتان کی خبریں اُڑ رہی تھیں، رسولؐ اللہ کے کانوں تک بھی یہ بات پہنچ چکی تھی، مگر مجھے کچھ پتہ نہ تھا۔ البتہ جو چیز مجھے کھٹکتی تھی وہ یہ کہ رسولؐ اللہ کی وہ توجہ میری طرف نہ تھی جو بیماری کے زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ آپ گھر میں آتے تو بس گھر والوں سے یہ پوچھ کر رہ جاتے ''کیسی ہیں یہ؟'' خود مجھ سے کوئی کلام نہ کرتے۔ اس سے مجھے شبہ ہوتا کہ کوئی بات ہے ضرور۔ آخر آپ سے اجازت لے کر میں اپنی ماں کے گھر چلی گئی تا کہ وہ میری تیمارداری اچھی طرح کر سکیں۔

ایک روز رات کے وقت حاجت کے لیے میں مدینے سے باہر گئی اس وقت تک ہمارے گھروں میں بیت الخلا نہ تھے اور ہم لوگ جنگل ہی میں جایا کرتے تھے۔ میرے ساتھ مِسطح کی ماں بیٹھی تھیں جو میرے والد کی خالہ زاد بہن تھیں۔ راستے میں ان کو ٹھوکر لگی اور بے ساختہ ان کی زبان سے نکلا غارت ہو مِسطح۔ میں نے کہا اچھی ماں ہو جو بیٹے کو کوستی ہو، اور بیٹا بھی وہ جس نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے۔ انھوں نے کہا ''بیٹا'' کیا تجھے اس کی باتوں کی کچھ خبر نہیں؟'' پھر انھوں نے سارا قصہ سنایا کہ افترا پرداز لوگ میرے متعلق کیا باتیں اڑا رہے ہیں۔ (منافقین کے سوا خود مسلمانوں میں سے جو لوگ، اس فتنے میں شامل ہو گئے تھے ان میں مِسطح حسان بن ثابت مشہور شاعر اسلام، اور حمنہ بنت جحش یعنی حضرت زینبؓ کی بہن کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔ یہ داستان سن کر میرا خون خشک ہو گیا، وہ حاجت بھی بھول گئی جس کے لیے آئی تھی، سیدھی گھر گئی رات بھر رو رو کر کاٹی۔''

[جاری ہے۔]

فسادِ عکس

کلیم خارجی

ایک سہ پہر جب وہ غسل کرنے کے لیے کپڑے اتار رہا تھا۔ تو اس نے دیکھا غسل خانے کی دیوار پر ایک قدِ آدم آئینہ لگا ہوا ہے۔ پہلے تو وہ اس بات کی خوشی میں سرشار ہوگیا کہ وہ پوری طرح اپنے جسم کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اور ہر طرح سے اور ہر انداز سے اپنے جسم کے ایک ایک عضو کو اس طرح غور سے دیکھ سکتا ہے۔ کہ دنیا کے کسی اور آدمی کے پاس نہ اتنی فرصت ہوتی ہے نہ سہولت۔ وہ اپنی گھنی داڑھی اور گول چہرے پر اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی چکور اور بہت چھوٹی انگلیاں پھیرتے ہوئے مسکراتا رہا۔ اُسے اپنا آپ بہت اچھا، صحت مند، با رعب اور پرکشش لگ رہا تھا۔ اس کا پیٹ پورے جسم کو گھیرے میں لیے ہوا تھا بہت موٹی انگوٹھے نما کی ناف باہر یوں نکلی ہوئی تھی۔

جیسے کسی گول ڈرم کے سوراخ میں کارک پھنسا ہوا ہو۔ وہ اپنے پیٹ، رانوں اور چھاتی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی مردانہ وجاہت کو محسوس کرکے کوئی نغمہ گنگنانے لگا تھا۔ پھر یکا یک خاموش ہو کر وہ اپنے عکس کو گھورتے ہوئے سنجیدگی سے بڑبڑایا۔ مجھے تو آج پتہ چلا کہ لوگ غسل خانوں میں جا کر کیوں گنگناتے

ہیں۔ انھیں اپنے جسم کی طاقت اور کشش دوسروں سے زیادہ بہتر محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ آنکھیں نکال نکال کر خود کو گھورنے لگا۔ مسکرا کے دیکھنے لگا۔ چہرے کے مختلف انداز بدل بدل کے دیکھتا سوچتا، اور فیصلہ کرتا رہا کہ اُسے کس طرح کا انداز اپنا لینا چاہیے، کیسے مسکرانا چاہیے۔ غصے اور رعب میں ہونٹوں اور آنکھوں کو کس زاویے پہ رکھنا چاہیے۔ اس کے کندھے، چھاتی، پیٹ، رانوں اور پشت پہ گھنے بال تھے، جو آج اُسے اپنی مردانہ وجاہت کا یقین دلا رہے تھے، اس کا قد اُسے مایوس کرنے لگا تو وہ ایڑیوں پہ کھڑے ہو کر اپنے نتھنے سکیڑ سکیڑ کر مسکرانے لگا۔ اپنے ہاتھ کولہوں پہ رکھ کر وہ اپنی رانوں اور پیٹ کو اچانک بار بار آگے کی طرف جھٹکے دینے لگا۔ جیسے اپنے اندر چھپی ہوئی کسی طاقت کو باہر نکال کر اس کا اثر دیکھنا چاہتا ہے۔ اپنی خاص ذہنی کمزوری کی بنا پر اس نے وہ سب کچھ دیکھا۔ جسکی اُسے تمنا تھی پھر اس کے ذہن کے کسی گوشے میں احتیاط اور پر سکون اندھیرے کی ضرورت جاگ اُٹھی۔ وہ خود ہی بڑبڑایا جہالت بھی رحمت ہوتی ہے، ضروری نہیں کہ دوسروں سے حیا کی جائے، انسان کو اپنے آپ سے بھی حیا کرنی چاہیے۔ اپنی باتیں خود سُن کر اُسے بہت رُوحانی مسرت ہوئی۔ لیکن اس کے اندر کہیں

یہ احساس موجود تھا، کہ وہ ایک مرد ہے اُسکی آنکھوں کے اندر کہیں مرد ہونے کی جھلک رہ گئی تھی۔ جو اُسے مطمئن اور پر اعتماد رکھنے کے کام آ رہی تھی۔ بغیر کسی موازنے کے وہ خود کو ایک بھرپور مرد سمجھ کر مسکرانے لگا۔ اس نے بازو اوپر پھیلائے اور مڑ کر اپنی پیٹھ اور کندھے دیکھے۔ جہاں بالوں کے جزیرے اُسے بہت بھلے لگ رہے تھے۔ یکایک اُسکی نگاہ بائیں کولہے کے ذرا نیچے ابھرے ہوئے پٹھے پر جا پڑی۔ ایک سفید کنکھجورہ جیسی لمبی لکیر جو گہرائی میں جا کر کہیں غائب ہو گئی تھی۔ اُسے نظر آئی وہ کھلے منہ کے ساتھ گردن موڑے اُسے دیکھتا رہ گیا۔ یہ تو کسی تیز دھار آلے کی گہری خراش ہے۔ گہری اور سفید جلد بتا رہی تھی کہ وہاں زخم گہرا تھا۔ یہ کب، اور کیسے؟ اسکی تھوڑی ایک طرف لٹک گئی، مجھے کیوں یاد نہیں ۔۔۔؟ یہ زخم اچھی جگہ پر نہیں۔ شخصیت پہ سوالات اٹھ سکتے ہیں۔ شاید کوئی حادثہ۔ جو ابھی ذہن میں نہیں۔ شاید بہت بچپن میں کہیں کسی کیل والے تختے پہ پھسلتے ہوئے۔۔۔۔۔؟

مجھے آج تک اس زخم کا احساس کیوں نہیں ہوا۔

اگر میں مر گیا تو کیا ہوگا؟ موت کے بعد غسل دینے والے طرح طرح کی باتیں کریں گے۔ اُسے یاد آیا کہ میتوں کو غسل

دینے والے بعد میں اپنی محفلوں میں کس کس طرح کی رازدارانہ گفتگو کر کے مزے لیتے ہیں۔ خود سے باتیں کرتے کرتے وہ اپنے چہرے کی سنجیدگی دیکھتا رہا۔ جو رفتہ رفتہ ندامت اور پھر ملامت بن کر پورے آئینے میں پھیل گئی۔ اتنے بڑے آئینے کو غسل خانے میں نہیں ہونا چاہیے تھا یہ غسل خانہ تو میری ماں ، بیوی، بہنیں اور بیٹیاں بھی استعمال کرتی ہیں۔ یہ اخلاق، حیا اور شریعت کے خلاف ایک سنگین عمل ہے انسان جب اپنے آپ سے حیا کا معیار قائم نہیں کرے گا تو وہ دوسروں کے ساتھ معاملات میں کہاں تک جا سکے گا۔ خدانخواستہ ہمارے گھر کی خواتین خود کو اس طرح دیکھ لیں تو قیامت برپا ہو سکتی ہے۔ اپنے جسم کو اتنا ننگا، صاف اور روشن دیکھ کر میرے اندر شہوت جاگ سکتی ہے تو۔۔۔ تو عورتیں ویسے بھی کمزور ہوتی ہیں۔ اشتعال میں آ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے آئینہ اٹھایا جو قدرے بھاری تھا۔ کچھ دیر ہوا میں تھامے رکھنے کے بعد اس نے مجاہدانہ جذبے کے ساتھ اُسے غسل خانے کے ٹائیلوں والے فرش پہ جھٹکے سے دے مارا۔ اک دھماکے سے آئینے ٹوٹ کر کرچیوں کی صورت سفید ٹائیلوں پہ بکھر گیا۔ سفید ٹائیلوں اور روشنی کی وجہ سے اسے کرچیاں نظر نہ آئیں۔ تو اُسے ذرا گھبراہٹ سی ہونے لگی کہ کرچیوں کو کس طرح سمیٹا جائے گا۔ جبکہ غسل خانہ بہت استعمال کرنے والی جگہ ہے۔ وہ غسل خانے کی دیوار پہ کہنی رکھ کے اپنے کیے گئے عمل کے لیے دفاعی حکمت اور دلیل کی تلاش میں کھڑے کھڑے پسینے میں بھیگ گیا۔ رفتہ رفتہ اس نے حوصلہ پایا۔ پھر اس نے جلدی جلدی کپڑے پہنے۔ غسل خانے سے باہر نکلتے وقت اس کو اپنے بدن سے چمٹی ہوئی گرم نمی، پسینے کی بو اور میل کا احساس ہوا تو اس کے چہرے پہ ناگوار شکنیں اُبھر آئیں اُسے سخت غصہ آنے لگا۔ وہ تو غسل کرنے ٹھنڈا، پاک صاف اور تازہ دم ہونے کے لیے غسل خانے میں گیا تھا۔ وہ تو ذہنی، اور جسمانی اذیت کے ساتھ باہر نکلا ہے۔ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ وہ ممیایا۔ غسل تو کیا ہی نہیں وہ غصے سے ہانپتا ہوا اپنے چھوٹے بھائی کے کمرے میں گھستے ہی ناصحانہ انداز سے بھڑکتے ہوئے بولا اب اس گھر میں اخلاق، حیا اور شریعت کے خلاف بھی کام شروع ہو گئے۔ ہر غسل خانے میں آدمی قد کے برابر آئینہ کس نے رکھوایا ہے۔ یہ ایک مکروہ اور بے حیائی کا سبب بننے والا عمل ہے۔ میرا خیال ہے یہ کام تمہارا ہے۔ تم یہودیوں اور ملحدوں والے رستے پہ نکلے ہوئے ہو۔ میں کئی دنوں سے تمہیں

دیکھتا آرہا ہوں۔
اس کا بھائی جو عمر میں کم اور جثے میں اس سے بہت زیادہ تھا۔ لیکن وہ اس کی بے حد عزت بھی کرتا تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے موبائل کو تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے بولا، بھائی جان، یہ آئینہ ہمارے ایس ڈی او صاحب کا ہے۔ الیکٹرانک آئینہ ہے۔ اس میں کوئی نقص پیدا ہو گیا تھا۔ الیکٹرانکس والے سے مرمت کروایا ہے۔ گاڑی کی سیٹ پر پڑا تھا۔ ہمارے بچے گاڑی میں کھیلنے لگے تھے۔ میں نے احتیاطاً غسل خانے میں رکھ دیا تھا۔ دو دن بعد واپس آ کر آؤں گا۔ گاڑی بھی ایس ڈی او صاحب کی ہے۔ اس آئینے میں بڑے کمالات ہیں۔ یہ الیکٹرانک ہے۔ اس میں زبردست کیمرے بھی نصب ہے۔ انسان اپنے جسم کا ایک ایک رُواں دیکھ سکتا ہے۔ جسم کا کوئی بھی عضو کسی بھی زاویے سے صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ بڑے لوگوں کے چونچلے ہیں۔ بہت قیمتی ہے۔ تقریباً اسی ہزار روپے مالیت کا ہے۔
لیکن تم اسے گھر کیوں لے آئے۔ سیدھا ایس ڈی او صاحب کے ہاں چھوڑ آتے نا؟ اس کے لہجے میں غصے کے ساتھ پچھتاوا، نمایاں ہونے لگا تھا۔
اصل میں ایس۔ڈی۔او صاحب اسلام آباد چلے گئے تھے۔ گاڑی اور آئینہ میرے حوالے کر گئے۔ میں تو ان کا ڈرائیور ملازم ہوں۔ دو دن کے دوران فون آئے گا تو انہیں ایئرپورٹ پہ دوبارہ لینے جاؤں گا۔ اُس وقت تک میری چھٹی ہے۔
تو کیا اس کے کیمرے وغیرہ آن تھے۔ وہ گھبراہٹ چھپائے بغیر پھر بولا۔ نہیں نہیں۔ میں نے تو اس کا سوچ ہی نہیں لگایا تھا۔ اس کا آئینہ بھی کمال ہے بھائی کی تسلی بھری گفتگو سن کر وہ ندامت سے اپنی داڑھی کے بال نوچتے ہوئے بولا میں غسل خانے میں پھسل گیا تھا۔ سنبھل نہیں پایا تھا۔ سیدھا آئینے سے جا ٹکرایا۔ آئینہ ٹوٹ گیا ہے۔ میرے بھائی۔
اوہ، بھائی جان یہ تو بہت بڑی مصیبت بن گئی۔ میں اتنا بڑا ہرجانہ کیسے بھروں گا۔ ایس ڈی او صاحب نے دوبئی سے یہ آئینہ منگوایا تھا۔ یہ پاکستان میں ملتا بھی نہیں ہے۔ یہاں تو لوگوں کو ابھی اس کے بارے میں پتہ بھی نہیں ہے۔ ایس۔ڈی۔او صاحب اتنے اچھے آدمی بھی نہیں ہیں۔
بس میں سنبھل نہیں پایا۔ صابن لگا ہوا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔
اپنے بھائی کی رونی صورت اور پیلے رنگ کو دیکھتے ہوئے وہ لمبی لمبی آہیں بھرتا ہوا اپنی موٹی اور ناٹی بیوی کے پاس باورچی خانے میں جا پہنچا۔ جو روٹی پہ اچار اور چاول کی ڈھیری بنائے

نوالے لیے جا رہی تھی۔ اپنے موٹے موٹے ڈیلوں سے گھورتے وہ اپنے لہجے کو نرم اور خوشامدانہ بناتے ہوئے بولا، دیکھو ایک مسئلہ ۔ میرے ہاتھوں سے بگڑ گیا ہے۔ میں نے تمہیں پچھلے سال جو انگوٹھی بنا کر دی تھی۔ وہ لقمان کو دے دینا۔ تاکہ وہ فروخت کرے اپنی جان چھڑا سکے۔ ورنہ اسکی نوکری چلی جائیگی۔ تم جانتی ہو کہ پورے گھر میں صرف وہی مستقل روزگار پہ ہے۔ ایسا نہ ہو ہم سب فاقوں مر جائیں۔ میرا بھی ان دنوں کوئی خاص کام نہیں رہا۔

وہ انگوٹھی تو مجھے بہت پسند ہے۔ وہ نوالہ نگلتے ہوئے روہانسی ہو کر بولی تم نے کتنی مدت بعد مجھے کوئی چیز لے کر دی تھی۔ بس میں نے جو کہہ دیا ہے وہ کرو، وہ شہادت کی انگلی تحکمانہ انداز میں سیدھی کرتے ہوئے بولا، اللہ نے چاہا تو اس مرتبہ پھر بنوا دوں گا بالیاں بھی بنوا دوں گا۔

اپنا حکم سناتے ہوئے وہ بائیں پیر کو زمین سے اٹھانے میں سے مشکل محسوس کرنے لگا تھا۔ مسجد کی طرف جاتے ہوئے اُسے یوں لگ رہا تھا کہ اس کا سر صاف بائیں کندھے پر دھرا ہوا ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی وہ منبر کے قریب بیٹھی ہوئی نمازیوں کی ایک ٹولی کے پاس سمٹ کر بیٹھ گیا۔ تبلیغ اور دعوت کا ذکر ہو رہا تھا۔ ذرا سی خاموشی ہوئی تو وہ بے دھڑک بول اٹھا معزز حضرات میں تو تبلیغ کا کام کر کے تھک سا گیا ہوں۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں۔ اور ایسا شہید ہو جاؤں کہ میرے جسم کے چیتھڑے اڑ جائیں۔ دنیا میں رزالت بہت پھیل گئی ہے۔ زندگی میں گھٹن اور اذیت بڑھ گئی ہے۔ خدا اور رسول کے بارے میں لوگ جاہل ہو کر لالچی اور ظالم ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ سب دعا کریں۔ کہ اللہ مجھے اعلیٰ درجے کی شہادت نصیب فرمائے۔ بات ختم کر کے اسکی ہچکیاں بندھ گئیں۔ اور وہ معصوم بچوں کی طرح رونے لگا۔ ٹولی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھیں بھر گئیں۔

ایک بزرگ زور سے بولا، اس کو کہتے ہیں ایمان کی طاقت۔ یہ ہے بندہ مومن کا اصل روپ۔ لوگ اُسے عقیدت اور احترام سے دیکھنے لگے تو وہ جھینپ سا گیا۔ کندھے پہ رکھے ہوئے بڑے بڑے دھاری دار رومال سے اس نے اپنا چہرہ صاف کیا۔ اور کچھ دیر نگاہیں جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ اُسکی آنکھیں پھیل کر چٹائی پر جم گئیں تھیں۔ اچانک اُس کو اپنے بدن پہ چبھتا ہوا حبس، پسینہ اور تکلیف دہ سا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ تو اس نے بائیں کولہے پہ ہاتھ رکھا۔ اور مسجد کے ایک تاریک غسل خانے میں جا گھسا۔

☆☆☆☆☆

جھرنا

بھوربن میں ایک مہینے کے قیام کے لیے رہائش کا بندوبست ایک مہربان نے کیا تھا۔ راجا انور کامیاب بزنس مین تھے۔ برسوں پہلے کاروبار کی خاطر لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ اب تو ان کا بزنس انگلینڈ تک پھیل چکا تھا لہٰذا ان کا ایک قدم لندن میں ہوتا تھا اور ایک لاہور میں۔ اس کے باوجود گرمی کا سیزن وہ اپنے بھوربن والے بنگلے میں ہی گزارتے تھے۔

ان سے بات ہوئی تو انھوں نے فوراً آفر کر دی کہ میرے بنگلے میں رہو۔ آج کل خالی ہے۔ چناں چہ جب میں بنگلے تک پہنچا تو دور پہاڑوں پر ڈوبتا سورج سرخی بکھیرتا دکھائی دے رہا تھا۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ نوازش کو میری آمد کی اطلاع مل چکی تھی اس نے صفائی وغیرہ کر دی تھی۔ وہ اس بنگلے کا کیئر ٹیکر تھا۔ اس نے میرا بیگ اندر پہنچایا۔ آتش دان میں لکڑیاں جل رہی تھیں۔ میں اس کے ساتھ بنگلے کے مختلف کمروں کا جائزہ لے رہا تھا۔

''صاحب! کچن میں کھانے پینے کا سامان اور گیس سلنڈر بھی موجود ہے۔ آپ خود چائے وغیرہ بنانا چاہیں تو مسئلہ نہیں ہو گا۔ میں ادھر بنگلے کے ساتھ والے ہٹ میں ہوں گا۔ جب مجھے آواز دیں گے کھانا وغیرہ بنانے کے لئے آ جاؤں گا۔'' نوازش نے کہا۔

''او کے۔ مجھے جب بھی ضرورت ہو گی تمھیں بلا لوں گا۔ لیکن ابھی میں آرام کروں گا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ٹھیک ہے صاحب؛ آپ آرام کریں میں کھانا بنا لیتا ہوں، آپ کے لیے کیا بناؤں؟''

''کچھ بھی بنا لو، چاول وغیرہ۔'' میں نے چلتے چلتے کہا۔ ہم واپس لاؤنج میں آ گئے تھے۔ سامنے دیوار پر چھ سات برس کی ایک بچی کی تصویر لگی تھی۔ تصویر زندگی سے بھرپور تھی۔ بچی ہنستے ہوئے برف کا گولا کسی کی طرف پھینک رہی تھی پس منظر میں پہاڑوں پر برف نظر آ رہی تھی۔ ''یہ راجا صاحب کی بیٹی کی تصویر ہے۔'' نوازش نے مجھے تصویر کی طرف دیکھتے پایا تو بولا۔

وسیم جبران

"راجا صاحب کی بیٹی تو بڑی ہے؛ کیا یہ اسی کی تصویر ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "ہاں صاحب یہ تو پندرہ سولہ برس پہلے کی تصویر ہے۔ نوازش نے بتایا۔" اوہ تو یہ بات ہے۔ اچھا میں بیڈروم میں جا رہا ہوں۔ کھانا دو گھنٹے بعد کھاؤں گا۔" نوازش نے سر ہلا دیا۔ بیڈ پر لیٹ کر میں اپنے مقصد کے بارے میں سوچنے لگا۔ فروری کا مہینا تھا۔ مجھے مارچ کے دوسرے ہفتے تک یہاں قیام کرنا تھا۔ سوچتے سوچتے اونگھ آ گئی۔ آنکھ کھلی تو وقت دیکھا۔ آٹھ بجے تھے۔ طبیعت کچھ مضمحل تھی۔

بہرحال تازہ دم ہو کر ڈائننگ روم میں آیا۔ کچن سے اشتہا انگیز خوشبو آ رہی تھی۔ چند منٹ بعد نوازش کھانا لے کر آ گیا۔ اس نے پلاؤ کے ساتھ مٹن قورمہ بھی بنا دیا تھا۔ دیگر لوازمات کے ساتھ گرم گرم روٹیاں بھی تھیں۔ میں نے اعتراض کیا کہ اتنے اہتمام کی ضرورت نہیں لیکن نوازش نے بتایا کہ راجا صاحب کی خاص ہدایت ہے کہ کسی طرح کی کوئی کمی نہ ہو۔ میں خاموش ہو گیا۔ کھانے کے بعد نوازش اپنے ہٹ میں چلا گیا اور میں اس بڑے سے بنگلے میں تنہا رہ گیا۔

اپنے کمرے میں جا کر میں نے لیپ ٹاپ کھولا تاکہ کام کا آغاز کروں۔ کافی دیر تک سوچتا رہا کہ آغاز کہاں سے کروں۔ ذہن میں ایک آئیڈیا تھا مگر ابتدا نہیں کر پا رہا تھا۔ راجا صاحب کی بیٹی کے بارے میں سوچنے لگا۔ راجا صاحب نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔ راجا صاحب کی اپنی بیوی سے کبھی نہیں بنی۔ شاید اسی لیے ان کی ساری توجہ بزنس بڑھانے پر مرکوز تھی۔ جب کافی دیر تک کچھ نہ سوجھا تو میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور بستر پر دراز ہو گیا سوچا اتنی جلدی کیا ہے کل سے سہی۔ پھر مجھے نیند آ گئی۔

رات بارہ بجے کا وقت ہو گا۔ جب کسی شور سے میری آنکھ کھلی۔ ایک دم ساری حسیات بیدار ہو گئیں۔ رات کے اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ کوئی چور نہ ہو۔ میں پوری طرح الرٹ ہو کر آوازوں کی نوعیت پر غور کرنے لگا۔ کسی کے بولنے کی آواز تھی اور ساتھ برتنوں کی کھنک بھی تھی۔ یہ کوئی اور ہے۔ میں نے سوچا پھر دبے پاؤں آوازوں کی سمت چلا۔ ڈائننگ روم میں دو لوگ موجود تھے۔ وہ کھانا کھا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ بیس بائیس برس کی لڑکی اور اس کا ہم عمر نوجوان۔ میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو اس کے نقوش تصویر والی بچی جیسے محسوس ہوئے۔ شاید اس نے بھی میری موجودگی کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا مگر چونکنے کے بجائے کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔ "آپ جاگ گئے، دراصل ہم آپ کو ڈسٹرب نہیں کرنا چاہتے تھے۔" اس نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن آپ۔

راجا صاحب کی؟''
''ہاں میں ان کی بیٹی ہوں۔ آیئے ناں، آپ کچھ کھائیں گے؟'' اس نے پوچھا۔
''نہیں میں کھانا کھا چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو چائے بنا دوں؟'' اس نے پوچھا۔
''نو تھینکس! میری آنکھ کھلی تو آپ کی آوازیں سن کر ادھر آ گیا۔''
''سوری! اچھا آپ آرام کیجئے میں آپ سے کل تفصیل سے بات کروں گی۔'' وہ جیسے خود مجھ سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ اس دوران نوجوان خاموشی سے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ میں نے سر ہلایا اور واپس آ گیا۔ یہ لڑکی بھی عجیب ہے۔ راجا صاحب کو اس بارے میں پتہ نہیں علم ہے یا نہیں۔ میں یہی سوچتے سوچتے ایک بار پھر سو گیا۔
صبح آنکھ کھلی تو رات کا واقعہ یاد آیا لیکن جب تازہ دم ہو کر واش روم سے نکلا تو سوچ رہا تھا کہ شاید میں نے خواب دیکھا ہے بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ راجا صاحب کی بیٹی یوں رات بارہ بجے گھر آئے۔ ناشتے کی میز پر پہنچا تو نوازش نے پھر اہتمام کر رکھا تھا۔ بریڈ، جام، بٹر کے ساتھ پراٹھے اور آملیٹ بھی تھا۔ چائے کافی بھی موجود تھی۔
''صاحب ناشتہ لگا دیا ہے۔ اب میں جاتا ہوں۔'' نوازش یہ کہہ کر چلتا بنا اور میں سوچنے لگا کہ یہ ناشتہ میری ضرورت سے کہیں زیادہ ہے۔ نوازش کو منع کرنا چاہیے کہ ضرورت کے مطابق ہی کام کیا کرے۔
ناشتے کا آغاز کرنے ہی والا تھا کہ کسی کی چہکتی آواز سنائی دی۔ ''گڈ مارننگ'' میں نے چونک کر دیکھا۔ راجا صاحب کی بیٹی ڈائننگ روم میں آ گئی تھی۔ ''تم۔؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خواب نہیں دیکھا تھا۔ اس کی موجودگی ایک حقیقت تھی۔ البتہ اب وہ اکیلی نظر آ رہی تھی نوجوان اس کے ساتھ نہیں تھا۔ ''آپ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں، میں نے کہا تھا ناں صبح بات ہو گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''بیٹھو'' میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ یہ بات نہیں، وہ لڑکا تمہارے ساتھ نہیں ہے، کیا وہ ناشتہ نہیں کرے گا۔ لڑکی میری بات سن کر جھینپ سی گئی۔ ''نہیں وہ چلا گیا ہے۔ ہم بعد میں اس بارے میں بات کریں گے کیوں کہ ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' وہ بولی۔ چناں چہ ہم چپ چاپ ناشتہ کرنے لگے۔ چائے کے کپ لے کر ہم ٹیرس پر آ گئے۔ سنی ڈے تھا۔ چمکیلی دھوپ چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو ایسا لگا کہ وہ اپنے بچپن میں جتنی کیوٹ تھی نوجوانی میں اس سے کہیں زیادہ حسین لگ رہی تھی۔ بلیک جینز کے ساتھ بلیک جیکٹ اور شانوں پر لہراتے براؤن بال اس کی خوب صورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ تب مجھے خیال آیا

کہ میں نے راجا صاحب سے کبھی ان کی بیٹی کا نام نہیں پوچھا تھا۔

”آپ میرے بارے میں سوچ رہے ہیں ناں، میرا نام جھرنا ہے۔ شاید میرے ابو نے آپ کو میرے بارے میں بتایا ہو۔“ اس نے جیسے میری سوچ پڑھ لی تھی۔ ”بتایا تو تھا مگر نام نہیں بتایا تھا۔ یہ نام کچھ نامانوس سا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن مجھے بہت پسند ہے، مجھے عام چیزیں، عام لوگ اور عام نام اچھے نہیں لگتے۔ میرا نام منفرد ہے اسی لیے مجھے اچھا لگتا ہے۔“ وہ بولی۔ ”تم تو شاید اسلام آباد کی یونیورسٹی میں پڑھتی ہو، پھر یہاں کیوں؟ اور وہ لڑکا؟ کیا وہ تمھارا کلاس فیلو ہے؟“

میرے سوالات پر اس نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ”میں آپ کے سب سوالوں کے جوابات دوں گی۔ فی الوقت صرف اتنا جان لیجیے کہ وہ میرا دوست ہے اور چند دن ہم بھی یہاں رہیں گے۔ وہ ایک ضروری کام سے گیا ہے شام تک آجائے گا لیکن میری آپ سے ایک درخواست ہے براہِ کرم ابھی میرے ابو کو اس بارے میں کچھ نہ بتایئے گا۔“ وہ بے حد سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ میرے لیے یہ بہت مشکل صورتِ حال تھی۔ راجا صاحب میرے مہربان تھے ان کو بتانا میں اپنا فرض سمجھتا تھا لیکن جھرنا کی درخواست رد کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

بہرحال جھرنا نے کہا تھا کہ ابھی نہ بتایئے یعنی چند دن میں غور کر سکتا تھا کہ کیا کرنا چاہیے۔ چناں چہ میں نے اس سے وعدہ کر لیا کہ کہ فی الحال اس حوالے سے خاموش رہوں گا۔ اس نے شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں جا رہی ہے ٹی وی وغیرہ دیکھنے۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے بھی اپنا کام کرنا چاہیے لہٰذا کمرے میں آکر لیپ ٹاپ کھولا۔

ایڈیٹر صاحب نے مجھے چھ مہینے کا وقت دیا تھا اور صرف ایک مہینہ بچا تھا۔ شہر کے ہنگامے ناول کی تکمیل میں حائل تھے یا کوئی اور وجہ تھی حتمی طور پر میں بھی اس سے لاعلم تھا۔ ایسے میں پھر ناراضی بھری فون کال موصول ہوئی تو میں نے سوچا کہ کسی پرسکون جگہ پر کچھ عرصہ قیام کیا جائے اور پوری یکسوئی سے ناول لکھا جائے۔ اب جھرنا کی موجودگی کیا رخ اختیار کرے گی ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

لکھنے بیٹھا تو لفظ ذہن میں اترنے لگے تین چار گھنٹے گزر گئے اور مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ میرا انہماک اس وقت ٹوٹا جب میرے نتھنوں سے انتہائی مسحور کن خوشبو ٹکرائی - جھرنا کمرے میں آئی تھی۔ ”سوری میں بور ہو رہی تھی۔ میں آپ کے کام میں خلل نہیں ڈالنا چاہتی۔“ اس نے کہا۔ ”نہیں نہیں مجھے بھی بریک کی ضرورت تھی۔ چلو کہیں باہر

چلتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ جھرنا خوش ہوگئی۔ ہم باہر نکلے اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے پیدل چلتے رہے۔ پہاڑی علاقوں میں جگہ جگہ خوب صورتی بکھری ہوئی ہوتی ہے۔ ہم علاقے کے حسن سے متاثر تھے۔ ایک ریسٹورنٹ نظر آیا تو جھرنا رک گئی۔ مجھے چائے کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ جھرنا کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا اٹھی چناں چہ ہم ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔

بیرا ہونق سا آدمی تھا۔ میں نے اسے دو کپ چائے لانے کے لیے کہا تو عجیب سی نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ ”لگتا ہے تم بہرے بھی ہو، بھئی چائے لاؤ۔“ میں نے دوبارہ کہا۔ تو جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ جھرنا ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے وہ بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ میں اس کے دوست کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا مگر جھرنا سے کیا ہوا وعدہ یاد آ گیا کہ ابھی اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کروں گا لہٰذا خاموش رہا۔ چائے پینے کے بعد ہم واپس آ گئے۔ کچن سے کھانے کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ہمیں دیکھ کر نوازش کھانا لگانے لگا۔

جھرنا بالکل خاموش سی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے نوازش کی موجودگی میں وہ کمفرٹیبل نہیں تھی۔ میں نے ایک دوبار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے جوابات مختصر ہوں ہاں تک محدود رہے۔

کھانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے بھی اپنے بیڈروم میں جا کر لکھنا شروع کیا۔ شام ہوئی تو آوازوں سے اندازہ ہوا کہ نوجوان واپس آ گیا ہے۔ اگرچہ کسی کی جاسوسی کرنا اچھی بات نہیں لیکن تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں چپکے سے اپنے کمرے سے نکلا اور آوازوں کا تعاقب کیا۔ آوازیں ٹیرس کی طرف سے آ رہی تھیں۔ میں ایک محفوظ فاصلے سے انہیں دیکھنے لگا۔ وہ خوش گپیوں میں مصروف تھے انہیں آس پاس کی کوئی خبر نہ تھی۔

پھر وہ اندر آ گئے اور لاؤنج میں ٹی وی آن کر کے بیٹھ گئے۔ میں اندازہ لگا سکتا تھا کہ ٹی وی محض ایک بہانہ تھا۔ وہ ایک دوسرے کی رفاقت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ وہ صوفے پر اس طرح بیٹھے تھے کہ جھرنا نوجوان کے بازوؤں میں تھی۔ جھرنا کی نظریں ٹی وی پر تھیں جبکہ نوجوان کی توجہ کا مرکز جھرنا تھی۔ پھر جب وہ زیادہ رومینٹک موڈ میں آئے تو میں اپنے کمرے میں آ گیا۔

رات کے کھانے کے لیے جب ڈائننگ روم میں پہنچا تو وہ دونوں پہلے سے میز پر موجود تھے۔ میں چند رسمی باتوں کے بعد نوجوان کی طرف متوجہ ہوا تو مجھے جھرنا کی تنبیہی نگاہوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مطلب یہ کہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس سے زیادہ

بات کروں۔

”جھرنا کھانے کے بعد چائے پیو گی؟“ میں نے پوچھا۔ ہاں میں پیوں گی مگر یہ نہیں پیے گا، یہ رات کو چائے پی لے تو پھر اسے رات بھر نیند نہیں آتی۔“ جھرنا نے فوراً کہا۔

”کوئی بات نہیں میں جاگ سکتا ہوں۔ میں بھی چائے پیوں گا۔“ نوجوان نے شوخی سے کہا۔ ”میں نے نہیں کہہ دیا ناں، اب چپ رہو۔“ جھرنا نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ اسی دوران میں نے محسوس کیا کہ میز کے نیچے اس نے نوجوان کے پاؤں پر پاؤں مارا۔ نوجوان کے منہ سے ایک آواز نکلی۔ ”کیا ہوا؟“ میں نے فوراً پوچھا۔ کچھ نہیں شاید میرے پاؤں پر کسی کیڑے نے کاٹا ہے۔ نوجوان نے جلدی سے کہا۔ جھرنا پھر اسے گھورنے لگی۔

نوازش کھانا سرو کرنے لگا۔ ”نوازش میاں کھانے کے بعد ہمیں چائے بھی چاہیے، جھرنا بی بی بھی چائے پئیں گی۔“ نوازش نے میری طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ ”جی کیا کہا صاحب؟“

”چائے بھی بنا لو اب سمجھے۔“ میں نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔ ”جی سمجھ گیا“ وہ جلدی سے کچن میں گھس گیا۔ ہم ہنسنے لگے۔ اس رات میں جلدی سو گیا۔ صبح ناشتے پر پھر جھرنا اکیلی تھی نوجوان شاید پھر نکل گیا تھا۔ میں اسے سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ دوپہر کے کھانے کے بعد ہم باہر جائیں گے۔ میں نے اس وقت کو ناول لکھنے کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور کام میں مصروف ہو گیا۔ پھر دو بجے کے قریب جھرنا نے مجھے کمرے میں آکر کھانے کے لیے بلایا۔

ہم باتیں کرتے ہوئے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تو نوازش کھانا لگا کر پانی رکھ رہا تھا۔ مجھے وہ کچھ ڈرا ڈرا سا لگا۔ ہم کھانے کے لیے بیٹھے تو میں نے نوازش سے پوچھا۔

”کیا بات ہے میاں کوئی مسئلہ ہے کیا؟“

”کچھ نہیں صاحب! میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے فوراً کہا لیکن مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کچھ چھپا رہا ہے۔ میں نے زیادہ کریدنا مناسب نہیں سمجھا اور کھانا کھانے لگا۔ کھانے کے بعد ہم باہر نکلے۔ آج لمبی واک کا ارادہ تھا۔ پہلے تو ارد گرد کے علاقے میں ٹہلتے رہے پھر دیول کی سمت چلنے لگے۔ کافی دور نکل گئے اس دوران ڈھیر ساری باتیں ہوئیں بس ایک مسئلہ تھا کہ جھرنا اپنی ذات کے بارے میں کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ میں کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو خاموش ہو جاتی۔

واپسی پر معمول کے مطابق ڈنر کے بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ آج دیر تک لکھنے کا ارادہ تھا۔ شاید گیارہ بجے کا وقت رہا ہو گا جب ہلکی سی آہٹ ہوئی۔ چونک کر مڑا تو دل دھک سے رہ گیا۔ جھرنا جانے کب سے

بالکل میری کرسی کے پیچھے کھڑی میری تحریر پڑھ رہی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ اور آنکھیں بہت عجیب سی لگ رہی تھیں۔

''جھرنا تم کب آئیں؟ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔'' میں نے شاید خفت مٹانے کے لیے کہا لیکن وہ جھرنا جو بات بات پر مسکراتی تھی بڑی سنجیدہ لگ رہی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ ایک لفظ نہیں بولی۔

''جھرنا کیا ہوا؟ کچھ تو بولو؟'' میں نے اٹھ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میری کہانی لکھ رہے ہیں، آپ کیا چاہتے ہیں، مجھے رسوا کرنا چاہتے ہیں۔'' اس نے غصے سے کہا۔

''جھرنا۔ مجھے غلط مت سمجھو۔ میں بس ایک کہانی لکھ رہا ہوں، تمہارا نام کہیں نہیں آئے گا۔ میں نے نام اور مقام بھی بدل دیا تھا تمہیں۔۔۔'' میں کچھ اور بھی کہتا لیکن وہ چیخ اٹھی۔

''نہیں یہ میری کہانی ہے۔ آپ ایسا نہیں کر سکتے اور اگر آپ نے ایسا کیا تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ میں آپ کے ساتھ کیا کروں گی، آپ بہت پچھتائیں گے مگر تب بہت دیر ہو چکی ہوگی۔'' اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ غصے کی شدت سے کانپ رہی تھی۔

میں اسے تسلی دینے کے لیے اس کی طرف بڑھا تو پھر چیخ اٹھی۔ ''میرے قریب مت آیئے، میں کچھ کر بیٹھوں گی۔''

''دیکھو تم زیادہ جذباتی ہو رہی ہو۔ ہم بیٹھ کر بات کر سکتے ہیں، ابھی کچھ نہیں بگڑا، تمہیں نہیں لگتا کہ تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو۔'' میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ میں ابھی آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتی، صبح بات ہوگی۔ وہ پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی۔ میں اس نئی مصیبت کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ پھر میں نے راجا صاحب سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

وٹس ایپ کال مل گئی۔ راجا صاحب کی چہکتی آواز سنائی دی تو میں نے گھمبیر لہجے میں کہا کہ راجا صاحب آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ شاید انھوں نے میرے لہجے پر زیادہ غور نہیں کیا اور بولے۔ ''فکر نہ کرو، ساری باتیں کل ہوں گی۔ سوچا تھا تمہیں سرپرائز دوں گا مگر تمہاری کال آ گئی ہے تو بتا دیتا ہوں میں اسلام آباد ایئرپورٹ پر اتر چکا ہوں۔ کل صبح ناشتے پر ملاقات ہوگی۔'' اب میں اور کیا بات کرتا۔ کال منقطع ہو گئی۔

ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آیا تو سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں جھرنا کا موڈ کیسا ہوگا۔ وہ ابھی نہیں آئی تھی۔ نوازش ناشتہ بنا رہا تھا۔ میں کچھ دیر کرسی پر بیٹھا اس کا انتظار کرتا رہا پھر سوچا کہ اس کے کمرے میں جا کر اسے بلاتا ہوں وہ شدید ناراض تھی۔ اس سے بات کرنا بہت ضروری تھا۔ اٹھ کر اس

کے کمرے کی طرف بڑھا دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا۔ دو تین بار دستک دی۔ خاموشی طاری تھی۔

آخر میں نے دستک دیتے ہوئے آواز دی۔ ’’جھرنا۔۔۔ جھرنا۔ دروازہ کھولو۔‘‘ شاید وہ بہت زیادہ ناراض تھی نہ بول رہی تھی نہ دروازہ کھول رہی تھی۔ اچانک ایک خوفناک خیال آیا کہیں اس نے کچھ کر نہ لیا ہو۔ بے چین ہو کر دروازے کو دھکیلا، دروازہ کھلا ہوا تھا۔ بیڈ خالی تھا۔ جھرنا وہاں نہیں تھی۔ شاید واش روم میں ہو۔ میں نے واش روم کا دروازہ بجایا اسے آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ واش روم کا دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ یہاں بھی نہیں تھی۔ کہاں چلی گئی وہ۔ میں نے پھر کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرے میں اس کی موجودگی کے آثار تک نہ تھے۔ شدید پریشانی کے عالم میں ڈائننگ روم میں آیا تو ناشتہ لگ چکا تھا اور عین اسی وقت ڈور بیل بجی۔

دروازہ کھلا اور راجا صاحب اندر آ گئے۔ ان کے ساتھ ایک نوجوان لڑکی بھی تھی۔ راجا صاحب ہنستے مسکراتے مجھ سے گلے ملے۔ لڑکی نے مجھے سلام کیا۔ میں سلام کا جواب دیا اور راجا صاحب سے کہا کہ مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔ ’’تم فون پر بھی یہی کہہ رہے تھے، اب ہم آ گئے ہیں باتیں بھی ہوں گی لیکن تم پریشان لگ رہے ہو ہوا کیا؟‘‘ راجا صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

میں اس قدر پریشان تھا کہ ان کے ساتھ نوجوان لڑکی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ’’مجھے آپ کی بیٹی کے بارے میں بات کرنی ہے۔‘‘ راجا صاحب چونک اٹھے۔ ’’میری بیٹی کے بارے میں کیا بات کرنی ہے، تم تو اسے کبھی ملے ہی نہیں۔‘‘

’’میں آپ کی بیٹی جھرنا سے مل چکا ہوں اور وہ مجھ سے ناراض ہو کر کہیں چلی گئی ہے۔ در اصل میں۔‘‘

’’تم کس کی بات کر رہے ہو۔‘‘ راجا صاحب نے میری بات کاٹتے ہوئے شدید حیرت سے کہا۔ ’’میری بیٹی تو یہ ہے تمھارے سامنے۔‘‘

میں نے چونک کر اس نوجوان لڑکی کی طرف دیکھا۔ اب غور کیا تو ایسا لگا کہ اس کی شکل بھی اس برف سے کھیلتی بچی کی تصویر جیسی تھی لیکن جھرنا کی طرح خوب صورت نہیں تھی۔

’’میں اس کی بات نہیں کر رہا ہوں راجا صاحب! میں جھرنا کی بات کر رہا ہوں۔ آپ کی دوسری بیٹی۔‘‘ میں نے الجھ کر کہا۔

’’ابو آپ کی کوئی اور بیٹی بھی ہے؟‘‘ لڑکی بول اٹھی۔ راجا صاحب کی ہنسی کو بریک لگ گئی۔ ’’تم چپ رہو۔ ہاں تم بتاؤ تم کس جھرنا کی بات کر رہے ہو۔ کیوں کہ تم جانتے ہو میری ایک ہی بیٹی ہے اور اس کا نام عائشہ

ہے۔'' راجا صاحب کی بات سن کر عائشہ بھی سر ہلانے لگی۔ میرے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں نے نوازش کو آواز دی۔ نوازش ادھر آؤ، بتاؤ ذرا اس کمرے میں کون سی لڑکی رہ رہی تھی۔ وہ جھرنا تھی جس کے لیے تم ناشتہ اور کھانا بھی بناتے رہے ہو۔ یہاں ڈائننگ ٹیبل پر میرے ساتھ ہوتی تھی۔

''صاحب آپ کس کی بات کر رہے ہیں۔ آپ تو اکیلے ہی رہ رہے تھے۔ میں نے تو آپ کے ساتھ کبھی کسی کو نہیں دیکھا۔'' نوازش نے فوراً کہا اور میرا سر گھوم گیا۔ یہ جھوٹ کیوں بول رہا ہے۔ شاید جھرنا نے اسے منہ بند رکھنے کے لیے پیسے دیے ہوں۔ میں فوراً دروازے کی طرف بڑھا۔

''کہاں جا رہے ہو، ناشتہ تو کر لو۔'' راجا صاحب نے آواز لگائی لیکن میں نہیں رکا۔ میں جھرنا کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ آس پاس جہاں جہاں ہم گئے تھے میں وہاں وہاں اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اچانک کہاں غائب ہو گئی ہے۔ پھر مجھے اس ریسٹورنٹ کا خیال آیا جہاں ہم نے چائے پی تھی۔ امید کی کرن چمکی وہ بیرا تو جھوٹ نہیں بولے گا وہ ضرور بتائے گا۔ میں ریسٹورنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے پاس موبائل فون بھی ہوتا تھا۔ کاش میں نے جھرنا کی کوئی تصویر ہی بنالی ہوتی۔ خیر میں تیز تیز چلتا ہوا ریسٹورنٹ پہنچا۔

وہ بیرا مجھے فوراً ہی نظر آ گیا۔ ''مجھے پہچانتے ہو؟'' میں نے جاتے ہی سوال کیا۔ ''جی ہاں آپ چند دن پہلے یہاں چائے پینے آئے تھے، دیر تک بیٹھے رہے تھے۔ میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔'' اس نے گھبرا کر کہا۔ ''تو پھر تمہیں وہ لڑکی بھی یاد ہوگی جو اس دن میرے ساتھ تھی۔'' میں نے زور دے کر کہا۔

''لڑکی؟ نہیں صاحب آپ اکیلے تھے۔'' اس نے کہا اور میرا دماغ بھک سے اڑ گیا یہ بھی انکار رہا ہے۔ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ''دیکھو تم بھول رہے ہو، میرے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔'' میں نے پھر کہا۔ ''نہیں صاحب مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ آپ اکیلے تھے لیکن آپ نے دو کپ چائے منگائی تھی۔ میں اسی لیے تو حیران ہوا تھا۔ جب میں چائے لے کر آیا تھا تو آپ باتیں کر رہے تھے لیکن آپ کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔'' میری پیشانی پر پسینے کے قطرے نمودار ہونے لگے۔ جھرنا کون تھی اور کیسے غائب ہو گئی مجھے کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آ رہا تھا۔ میں جان گیا تھا کہ جھرنا مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ میں نے کرسی کا سہارا لیتے ہوئے بیرے سے کہا۔ ''میرے لئے چائے لے آؤ۔''

☆☆☆☆☆

خوشیوں بھری زندگی

فصیحہ آصف خان

اُف پھر سارا پھیلاوا کر دیا نا۔ ابھی ثنا نے ساری چیزیں سمیٹی تھیں۔ پتہ نہیں تمھیں سمجھ کیوں نہیں آتی۔

عزیزہ نے چیزیں اٹھاتے اٹھاتے ایک دھموکا کمر پہ دے مارا۔ نو سالہ صبا ماں کی اس حرکت پہ ہمیشہ کی طرح مار کھا کر خاموش رہی اور ساتھ ساتھ گڑیا کے کپڑے، اپنے کھلونے ٹوکری میں ڈالتی رہی۔

ماں_ سے کیا کہتی۔

ثنا نہانے گئی ہے۔ جلدی جلدی اپنے سر میں کنگھی لگاؤ۔ جوئیں نکالو اور نہاؤ۔ غلاظت کی پوٹ ہے نری یہ لڑکی۔

عزیزہ کے لہجے میں صبا کے لیے حقارت اور نفرت ہی نفرت تھی۔

چھٹی کے دن عزیزہ انھیں صفائی کا درس دیتی۔ ناخن کٹواتی، کپڑے دھلواتی گھر کی صفائی علاوہ۔

صبا آج تک ماں کے رویے اور طعن زدہ باتوں کو جان نہ پائی تھی کہ ماں اس سے سوتیلوں جیسا سلوک کیوں کرتی ہے؟ وجہ دریافت کرنے کے قابل نہ تھی اور نہ ہی یہ عمر اس کی نفرت سہنے کی تھی ماں تو سراپا محبت ہوتی ہے۔ جانے میرے حصے کی محبت کہاں کھو گئی ہے۔

وہ اکیلے میں رات کی تنہائی میں آنسو بہاتی اس سوال کے جواب میں رات بتا دیتی مگر ناکام رہتی۔

کیا واقعی یہ میری سگی ماں ہیں۔

اس کا یونیفارم بھی میلا کچیلا ہوتا۔ لنچ کے نام پر پوٹلی میں سوکھی روٹی کے اوپر چنے، کبھی اچار کی پھانک ہوتی، جسے صبا بمشکل چبا چبا کر نگلتی اور پیٹ کی آگ بجھاتی۔

اس کے برعکس ردا آپی اور ثنا آپی سے ماں کا رویہ بہت بہتر مشفقانہ تھا۔ اس جیسا بدتر اور نفرت آمیز نہ تھا۔

اور سب سے لاڈلا تو ان کا بیٹا فہد تھا۔ جو اس کی آنکھ کا تارا، ستارا تھا ردا اس وقت دسویں اور ثنا آٹھویں کلاس میں تھی، فہد ساتویں اور صبا پانچویں جماعت میں، ابا کا جنرل سٹور تھا۔ اچھا چلتا تھا، گھر میں خوشحالی تھی مگر عزیزہ کی تلخ باتوں اور چیخ چیخ نے ناظم کو بھی چکرا دیا تھا۔

وہ باپ تھے ان کے لیے ساری اولاد یکساں تھی، وہ دیکھتے رہتے کہ عزیزہ، صبا کے ساتھ زیادتی کر جاتی ہے۔ وہ اسے سمجھاتے، مگر عزیزہ تو جیسے کچھ سننے کو تیار ہی

نہ تھی، بل کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی صبا کے ساتھ نفرت اور تحقیر آمیز سلوک میں اضافہ ہی ہوتا گیا۔
بڑے تینوں بھائی، بہن تو صبا کو ہی قصوروار سمجھتے تھے۔ ماں کی زبان اور باتوں کو درست قرار دیتے۔ ماں کی لگائی ہوئی عینک سے سب دیکھتے۔ اصل حقیقت بھی دیکھتے مگر نظر چرا لیتے۔
گھر کے کشیدہ ماحول اور ماں بیٹی کے درمیان کھنچی دیوار کو وہ صبا کی ہی مرہونِ منت تصور کرتے تھے کہ اگر صبا ٹھیک ہوتی تو یہ ایسا نہ ہوتا۔

صبا کی شخصیت میں سنجیدگی اور رکھ رکھاؤ، دُکھ کی طرح رچ بس گئے تھے جیسے جیسے وقت گزرا۔ اسے ماں کی نفرت اور خود سے بلاوجہ کی تنقید سمجھ آ گئی۔ ماں کے طعنے اور آہیں اسے سب بتا گئے۔ حالاں کہ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ سب اوپر والے کی مرضی اور منشا تھی اور وجہ یہ تھی۔
اس کے برعکس ناظم کے لیے صبا کی آمد بھاگوان ثابت ہوئی ابھی وہ چند ہی دن کی تھی کہ ناظم کا بڑا پرائز بانڈ نکل آیا، جس کی بدولت ان کی معمولی سی دکان ایک بڑے سُپر سٹور میں تبدیل ہو گئی تھی مگر عزیزہ کے دل پر نرمی کی کوئی پرچھائیں نہ پڑی۔
اب وہ اپنے ہر بگڑے کام کو صبا کی نحوست قرار دیتے ہوئے اسے مارنے اور بُرا بھلا کہنے سے بھی گریز نہ کرتیں۔
اُٹھتے بیٹھتے، طعنے، تشنے کھاتی صبا میٹرک میں آ گئی۔
اس نے اپنے لیے سائنس کے مضامین کا انتخاب کیا تھا۔ یوں خود کو کتابوں میں غرق کر لیا۔ تاکہ اردگرد کی باتوں سے بے نیاز ہی رہے۔
ناظم بے حد خوش تھے۔ ردا اور ثنا نے صرف ایف اے ہی کیا تھا۔ انھیں پڑھنے کا شوق ہی نہ تھا۔ نہ ہی وہ ذہین تھیں۔ البتہ فیشن اور موبائل میں خوب ماہر تھیں۔ فہد بھی لاڈ پیار میں بگڑا بچہ تھا۔ پڑھنے سے اس کی بھی جان جاتی تھی، سو دسویں کلاس میں بمشکل پاس ہوا تو ناظم نے اسے سٹور پہ بٹھانا شروع کر دیا۔ اس کے آگے پڑھنے پہ عزیزہ نے خوب منہ بنایا۔ بڑبڑاتی بھی رہی، مگر ناظم نے اسے خاموش کرا دیا۔ ''بلاوجہ کا خرچہ'' کا رونا روتی رہتی۔

عزیزہ کی طبیعت کئی دنوں سے خراب تھی۔
ردا اور ثنا باری باندھے کام کر لیتی۔ صبا اپنے حصے کے کام سمیٹی۔ پھر بھی کئی باتیں سنتی۔ مگر خاموش سر جھکائے اپنے کام سے کام رکھتی۔
شکر تھا کہ وہ دونوں بہنوں کے مقابلے میں خوب صورت تھی۔ ذہین تھی مزاج اور طور طریقے میں بھی ان سے بہتر تھی۔
اب ڈاکٹر بننا ہی اس کا خواب تھا۔ صبا

کاموں اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ ماں کا بھی پورا خیال رکھتی کہ انھیں کوئی شکایت کا موقع نہ ملے، عزیزہ ان کے شدید بخار میں ان کے لیے پرہیزی خوراک تیار کرتی۔ وقت پہ دوائی دیتی مگر عزیزہ کا دل پتھر کا پتھر ہی رہا۔ انہی دنوں ناظم کے دوست کے گھر سے ردا اور ثنا کے لیے رشتے آ گئے۔ دونوں بھائی تھے۔ اچھا کماتے تھے گھر بھی اپنا تھا۔ دیکھے بھالے تھے۔ سو ناظم اور عزیزہ نے چٹ منگنی اور پٹ بیاہ کو ترجیح دی۔ گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

بہنوں کی جدائی کے خیال سے دل بھر آتا تھا، اگرچہ ان کے درمیان کوئی ایسی محبت چاہت یا خوب صورت لمحوں کا رشتہ نہ تھا۔ مگر صبا کا دل پھر بھی بھر آتا خیر و خوبی سے ثنا اور ردا اپنے گھر کی ہو گئیں۔ گھر میں بے حد خاموشی اور اداسی پھیل گئی تھی۔ صبا اب پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو گئی تھی۔

اب بات کرتی تو کس سے؟ ماں، بیٹی میں دوستی نہ تھی، گھریلو کام کاج اور صبا کی پڑھائی کے پیشِ نظر ناظم نے ایک ملازمہ کا بندوبست کر لیا۔ جو صبح سے شام تک کام کرتی۔ صبا کو پڑھائی کے لیے کافی وقت ملنے لگا تھا۔

فہد بھی صبح کا گیا رات گئے آتا، ناظم جلدی آ جاتے۔ بزرگی تھی۔ پھر کئی تکالیف کا شکار تھے۔ گھر ہوتے تو صبا کے ساتھ گپ شپ کرتے۔ بیٹی کی ذہانت پر دل جھوم اٹھتا تھا۔ صبا کے ایف ایس سی میں شاندار نمبر آئے اور اسے میڈیکل کالج میں داخلہ مل گیا۔

ناظم نے اس کی پیشانی چوم لی دو ہزار انعام اور دعاؤں سے نوازا۔ فہد اس کے لیے کیک لے آیا، اس خوشی کے موقع پر بھی عزیزہ کا دل موم نہ ہو سکا۔ صبا ماں کو کیک کھلانے لگی تو انھوں نے ہاتھ سے پرے کر دیا۔ ”پتہ بھی ہے مجھے شوگر ہے، پھر میٹھا کھلا کر مجھے مارنا چاہتی ہو“ عزیزہ کی نفرت اور بیزاری عروج پر تھی۔

صبا کا دل تھم کر رہ گیا۔ اور آنکھیں بھر آئیں۔ ناظم آہ بھر کر رہ گئے، فہد کو بھی ماں کا لہجہ عجیب لگا۔ نیک بخت ذرا سا چکھ لیتی، اتنا سا کھا لینے سے شوگر نہیں بڑھتی۔ صبا کا دل خوش ہو جاتا، ناظم دکھ سے بولے تو عزیزہ نے منہ موڑ لیا۔

صبا، ثنا کچھ کہے اشک چھپاتی کمرے میں آ گئی۔ تب فہد اس کے پیچھے پیچھے آ گیا اور بہن کو گلے لگا کر پیار کیا۔

وہ اب اتنا سمجھ چکا تھا کہ ماں زیادتی کرتی ہے۔ کر رہی ہے، جبکہ صبا خاموش لب سیئے رہتی ہے۔

بھائی ___ میں ___ اماں کو ماروں گی؟ اماں نے ایسا سوچا بھی کیسے؟

میرا بس چلے تو میں ان کی ہر بیماری، تکلیف دور کر دوں۔

صبا سسک کر بولی، تو فہد نے پیار سے اسے سمجھایا۔
میں جانتا ہوں__ وہ بیمار ہیں چڑچڑی ہو گئی ہیں۔ بس رونا بند کرو، مجھے یقین ہے ایک دن اماں کے دل میں تمھارے لیے محبت کے سوتے پھوٹیں گے، چلو اداس نہ ہو، باہر چلتے ہیں۔ آؤ تمھیں آئس کریم کھلاتا ہوں۔ جلدی آ جاؤ___ میں بائیک نکال رہا ہوں۔ فہد نے ناظم کو بتایا اور اسے لے کر باہر آ گیا۔
صبا کا دل کافی حد تک بہل گیا تھا، مگر اک کانٹا تھا جو اندر ہی اندر کہیں گڑ گیا تھا۔
رات، دن اپنی مخصوص رفتار سے غموں کا سفر کرتے گھنٹوں اور دنوں میں تبدیل ہو رہے تھے روا اور ثنا کے دو، دو بچے ہو گئے اب وہ مصروفیت کے سبب کم، کم آتی تھیں۔
صبا کا میڈیکل کا دوسرا سال تھا۔ وہ دل لگا کر محنت سے پڑھ رہی تھی۔ انھی دنوں اپنی ایک جاننے والے کے توسط سے عزیزہ کو فہد کے لیے لڑکی پسند آ گئی متوسط طبقے کے لوگ تھے۔ لڑکی نے بی اے کر رکھا تھا۔ والدین کو شادی کی جلدی تھی۔ مزید وہ بیٹیاں تھیں۔
عارفہ خوب صورت تھی۔ سلیقہ مند تھی۔ سو عزیزہ کو عارفہ اتنی بھائی کہ اس نے فوراً ہی بات طے کر دی۔ چند افراد کے ہمراہ جا کر عارفہ کو انگوٹھی پہنا آئیں اور چھ ماہ بعد شادی کی بات بھی کر لی۔ سب بہت خوش تھے۔ عارفہ کی معصوم صورت اور سلیقہ مندی نے ان کے دلوں میں آنے سے پہلے گھر کر لیا تھا۔

عزیزہ اب بری کی تیاریاں کر رہی تھی۔
صبا بھی اکثر ان کے ساتھ چلی جاتی۔ یا ثنا اور روا کو بلا لیا جاتا۔ چھ ماہ گزرے پتہ ہی نہ چلا۔ گھر میں رونق اتر آئی تھی۔ شادی والا گھر قہقہوں اور روشنیوں میں نہا گیا۔ ایک سہری، ٹھنڈی شام میں عارفہ ان کے آنگن میں رونق افروز ہو گئی۔
عزیزہ بہت خوش تھی۔ بس اب صبا رہ گئی تھی، جس نے ڈاکٹر بننے کی شرط رکھی تھی، کہ ڈاکٹر بن جاؤں پھر سوچیے گا۔"
عارفہ سے صبا کی خوب دوستی ہو گئی۔ صبا کے پاس وقت کم ہوتا تھا، مگر گاہے بگاہے وہ عارفہ کے ساتھ مل کر کھانا بناتی۔ مارکیٹ چلی جاتی، گپ شپ لگاتی۔
عزیزہ زیادہ تر خاموش رہتی تھی۔ ان کی طبیعت بھی زیادہ ٹھیک نہ رہتی تھی۔ رنگت پیلی پڑتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر کو چیک اپ کروایا تو خون کی کمی کا شکار بتایا۔ باقی ہر طرح سے وہ ٹھیک تھیں۔ شوگر بھی نارمل تھی۔
تب ڈاکٹر نے انھیں بہترین خوراک کھانے کو کہا، ساتھ میں دوائیاں اور خون لگوانے کی تجویز دی۔ صبا ہی ڈاکٹر سے مل کر بات چیت کرتی یوں عزیزہ کو ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔
فی الحال ایک بوتل لگائیں گے۔ ڈاکٹر زکریا ہمدانی نے تمام رپورٹس پڑھ کر حتمی رائے دی۔
ان کا بلڈ گروپ A+ ہے، گھر میں کسی کا ہے۔

فریش ہے تو وہی لگے گا ڈاکٹر صاحب نے تسلی آمیز انداز میں سمجھاتے ہوئے کہا، اور صبا رپورٹس لے کر باہر آ گئی اور اپنا بلڈ ٹیسٹ کروا لیا- اس کا بلڈ گروپ +A نکلا صبا کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے- اس کی دعائیں رنگ لائیں- وہ ماں کا حق ادا نہیں کر سکتی تھی، مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ جو اس کی بساط میں تھا-

---

صبا کا خون قطرہ قطرہ عزیزہ کی رگوں میں اتر رہا تھا-

صبا کے دل میں جیسے اطمینان اور خوشی نے بسیرے کر لیتے تھے- اس نے صرف ناظم کو بتایا تھا کہ اس نے ماں کو اپنا خون دیا ہے- ناظم نے اس کا ماتھا چوم لیا تھا- کیسی صابر بچی تھی اور کس قدر دردمند-

عزیزہ دو دن بعد گھر آ گئی-

اس وقت سبھی ان کے پاس موجود تھے-

دوائیاں ترتیب سے میز پر رکھتے ہوئے صبا نے اک بھرپور نظر ماں پہ ڈالی- اور محبت سے بولی- اس کا انداز بے حد دھیما تھا-

امی__ کیسی طبیعت ہے اب؟

ٹھیک ہوں- وہ آنکھیں بند کیے ہی بولیں-

آپ نے فروٹ، دودھ، باقاعدگی سے لینے ہیں- دوائیاں بھی اور کوئی مسئلہ نہیں-

فہد بھی ماں کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بولا-

ابو جی__ اماں کو خون کس نے دیا ہے- فہد نے آخر پوچھ ہی لیا کیا خبر خریدا ہو- وہ ابھی تک بے خبر تھا-

صبا نے__ ناظم کے کہنے کی دیر تھی کہ عزیزہ کی آنکھیں یکدم کھل گئیں - حیرت و استعجاب سے وہ چونک کر، کیا، بولیں، دماغ حیرت زدہ رہ گیا- ہاں صبا نے اپنا خون تمہیں دیا ہے- بیٹی ہے تمھاری اس کا اور تمھارا خون کا گروپ ایک ہی ہے

عزیزہ کو جیسے کسی نے اندر سے ندامت سے جھنجھوڑا-

جس بیٹی سے وہ ابھی تک نفرت کرتی آئی تھیں- اسے اپنی خوشیوں کی قاتل اور جانے کیا کیا سمجھ کر تھیں جانتی رہی ہیں- اس نے آج اپنا لہو دے کر خون کو سرخرو کر دیا تھا- فہد ماں کے چہرے پر شرمندگی اور ندامت کے قطرے دیکھ رہا تھا-

تب جانے کیا ہوا- وہ یک دم اُٹھ بیٹھیں- اور صبا کی طرف بانہیں پھیلا دیں صبا دوڑ کر آئی اور ان کے سینے سے لگ گئی- دونوں کی ہلکی ہلکی سسکیاں تھیں-

ناظم اور فہد کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں-

یہی وہ لمحہ تھا جب عزیزہ کے دل سے صبا کے لیے کدورت، نفرت، غصہ سب کچھ اشکوں میں بہہ گیا تھا اور اس کی جگہ محبت، پیار، شفقت، دلجوئی اور چاہت کے سمندر پھوٹ اُٹھے تھے-

اور صبا نے ان کی عزیز ترین بیٹی کا درجہ پا لیا تھا-

☆☆☆☆☆

واپسی

عائشہ احمد جاوید

بہت خوب صورت موسم ہے، جس موسم میں
مجھے تمھارا ساتھ ملا۔
بہت حسین لمحہ تھا وہ، جس میں میری روح کو
قرار ملا۔
منزل کا نشان ملا
لمحوں کی طوالت مختصر ہو رہی تھی۔
اور میرے دل کی دھڑکن تیز تر
چہرے کے تاثرات بدل رہے تھے۔
کیونکہ مقام ہجر آ رہا تھا۔
اچھا تو تم جا رہے ہو
ہاں جا رہا ہوں۔
مگر تمھاری زندگی سے نہیں جا رہا۔
عامر نے وضاحت کی
میرے لیے تو تمھارا جانا اس طرح ہوتا
ہے کہ تم میری روح کو میرے جسم سے الگ
کر رہے ہو۔
آنکھوں سے نور کو چھین رہے ہو۔
جس طرح مجھ سے جینے کا اختیار چھین
رہے ہو۔
اور اس کی سانس رکنے سی لگی
بس بس اتنی شاعری ٹھیک نہیں ہے
عامر نے کہا

پھر ایک گہری خاموشی ہو گئی۔
لفظ سناٹے میں گم ہو گئے
عائزہ مسکرا دی
کیونکہ اگلا جملہ اس کی ملاقات کا حاصل تھا۔
جو ہر بار نیا ہوتا تھا
ہمیشہ خوش رہنا، عائزہ، آمین"
یہ کہہ کر عامر نے ہاتھوں کو اس کی گرفت
سے آزاد کیا۔
عائزہ نے سوالیہ تشویش کا اظہار کیا۔
اب یہ کیا بات ہوئی
عامر تذبذب کا شکار ہوا۔
اب ہم آپ کے ہونے بھی تو جا رہے ہیں۔
پھر یہ اداسی کیوں؟
ڈر ہی لگتا ہے
عائزہ نے گھبرا کر کہا
کس بات سے..........؟
عامر نے تشویش کا اظہار کیا
وہی جو تم نے مجھے کہا
ہمیشہ خوش رہنا
خوشی کا راس آنا تو تقدیر ہے
عائزہ نے اپنا خدشہ ظاہر کیا
مگر اچھی نیتوں کا اچھا عمل ہی ہوتا ہے۔
عامر نے اس کے سو خدشوں کو مضبوط دلیل
سے ختم کر دیا
اور عائزہ نے گہری سانس لی اور کہا صحیح

آؤ اب میں تمھیں گھر ڈراپ کر دوں
اور دونوں گاڑی میں بیٹھ گئے
وقت گزرتا گیا
رونقیں بڑھتی گئیں
اور عامر اور عائزہ رشتہ ازدواج میں
بندھ گئے
خوب صورت دن آئے حسین شامیں آئیں
دوستی ساتھ اور محبت سفر میں تمام ہوئی
وقت تیزی سے گزرتا گیا
اور ان کی اولاد بھی اس دنیا میں آ گئی
"پریسہ عامر"
یوں زندگی کی خوشیاں مزید دوبالا ہو گئیں
وقت اپنے مسافت طے کرتا گیا وقت کے
ساتھ ساتھ
عامر کے مالی حالات وہ نہ رہے
اور عائزہ بھی اب وہی پہلے والی عائزہ
نہ رہی
چھوٹے چھوٹے ان رشتوں میں اس
بیٹی کی آس پر اس رشتے کو برداشت کیا
خود کو برداشت کرنا اب دونوں کے لیے
مشکل ہو گیا
جب حالات نہ رہے تو نخرے بھی نہ رہے
جب نخرے بھی نہ رہے تو آس بھی نہ رہی
ادھر عامر حالات سے لڑتا لڑتا چڑچڑا ہو گیا
شروع میں تو دونوں نے ایک دوسرے کو

سمجھایا رشتے سلامت رہیں
روپیہ پیسے تو آنی جانی شے ہے
مگر یہ دور جس میں مہنگائی اور
بے اعتباری مسلسل بڑھ رہی ہے
تو آخر کب تک یہ مقابلہ کرتے
کہتے ہیں غربت میں پڑھا لکھا مرد
اور مفلسی میں عورت درویش ہو جاتی ہے
کیونکہ زندگی کی تلخیوں میں اپنوں کا
کرخت چہرے کا سامنا ہو رہا ہوتا ہے
عورت کے ناز نخرے صبر کی سیڑھی چڑھ
جاتے ہیں
جس کو صبر کا حوصلہ تھامے رکھتا ہے
اکثر پیٹ کی آگ وہ حوصلہ بھی کھو دیتی ہے
اگر بھوک کا تعلق اولاد کے پیٹ سے ہو
آخر ایسا کب تک چلے گا عامر؟
عائزہ نے عورت کارڈ کا استعمال کرتے
ہوئے
باقی ماندہ زندگی کے لمحوں کو خوشگوار
کرنے کے لیے خود کا نقشہ بدلا
تو عامر بھی عائزہ کی پرانی تصویر میں
کھو کر ٹوٹی یاد کو جوڑنے لگا

وہ کھو سا گیا بولو......
یہی کہ ہم ان حالات کو کب تک برداشت کریں
آخر مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا
عائزہ نے اپنے عزم کا اظہار کیا
عامر چونک گیا ___ بولا مثلاً
عائزہ۔ جواب دو
اور پی بی اگر میں نے یہ Job کروائی
ہوتی تو کب کا کروا چکا ہوتا
پھر......؟
عائزہ نے سوالیہ پوچھا
پرس میں پیسے کان میں بالیاں ہوں
تو باہر نکلنا میں نہیں روکوں گا
حالات خراب ہیں لوگ کہیں گے
بیوی کیک مائی کھا رہا ہے
اس سے تو بہتر ہے کہ میں اوور ٹائم کرلوں
ٹھیک ہے
تم خوش رہا کرو

عامر نے خوش ہو کر کہا
اور عائزہ خاموش ہو گئی
ور کسی گہری سوچ میں پڑ گئی
حیرت ہے پہلی بار تم نے بحث
نہیں کی عامر نے تشویش کا اظہار کیا
کیا کہوں؟
سچ تو یہ ہے کہ اب ہڈیاں جواب دے گئی ہیں
دماغ خالی ہے
مگر یہ بھی سچ ہے کہ ایسے نہیں دیکھ سکتی تمھیں
مگر کچھ ہمت کر ہی لیتی

پر یہ جو تم نے بات کی ہے
اس نے ہماری محبت کے رنگ کو مزید اُجاگر
کر دیا ہے۔
جب تم مجھے شہزادی بنانا چاہتے ہو
تو مجھے غلام بننے کی کیا ضرورت ہے؟
وہ کیا کہتے ہیں
نیت کا پھل
میرا دل اور روح تمھاری بات سے قرار میں
آ گئے
بات نوکری کی نہیں وہ تو میں نے تم سے
اصرار کر کے
کروا ہی لینی تھی
مگر اس مجبوری میں بھی تمھاری نیت کا عکس
بہت صاف ہے
جس میں اپنا محبت بھرا چہرا دیکھ سکتی ہوں
تو یہ حالات کیا ہیں
جوتے کی نوک پر
اور دونوں مسکرا دیئے
تو پھر اس طرح تبدیلی آئی کہ حالات
تو کچھ خاص نہیں بدلے مگر خیالات یکسر
بدل گئے
سفر آسان ہوا
وہ کیا کہتے ہیں
میں رانجھا راضی ہا
راستہ ہموار ہوتا گیا

ادھر پر یہ 2 سال کی ہوئی
اور عامر کو گورنمنٹ جاب آفر ہوئی
یہ دیکھو میں کیا Surprise لایا ہوں
عامر جھوم گیا
عائزہ بے قرار ہوتے ہوئے کیا ہوا بتاؤ تو سہی
نہیں نہیں ایسے نہیں
آنکھیں بند کرو
لو کر لی
اور عامر نے Appoinment Letter
عائزہ کو تھما دیا
میری جاب ہو گئی اور وہ بھی گورنمنٹ جاب
واقعی
عائزہ کی آنکھوں سے آنسو
رواں ہو گئے
یہ دیکھو 15 کو Joining ہے
او ہو
اب تم نے رونا شروع کر دیا
یہ خوشی کے آنسو ہیں
تم بھی تو رو رہے ہو
واقعی
یہ ہماری خوشی کے آنسو ہیں عامر
اُن آنسوؤں میں ہر غم کو بہہ جانے دو،
اور آنے والی خوشیوں کا استقبال کرو،

☆☆☆☆☆

دیوی

تو اس گھر کا نالائق اور نکما شخص ہے۔ کچھ کام نہیں ہوتا تجھ سے۔ماں نے دیوراج کی سُستی اور کاہلی پر طعنے دیتے ہوئے کہا۔ کام کا نہ کاج کا، دشمن اناج کا۔ جا کچھ کام کاج کر۔ گھر میں پڑا چارپائی توڑتا ہے۔۔اماں تو کیا سارا وقت مجھے طعنے دیتی رہتی ہے ۔باپو بھی ایسے ہی کرتا ہے۔ میں تم لوگوں کو اچھا ہی نہیں لگتا۔ میں یہاں سے کہیں دور چلا جاؤں گا۔ ہاں ہاں جائے گا تو! سُندری دیوی کے مندر میں۔ تجھے قبول کر لے گی۔ ماں نے پھر طعنہ مارا۔ وہ مسلسل اُسے جوش دلانے کے لئے ایسی باتیں کر رہی تھی تا کہ وہ کچھ کر دکھائے۔ مگر وہ کہ ٹس سے مس نہیں ہوتا تھا۔ اچانک ہی اُسے ماں کی یہ بات بڑی دلچسپ محسوس ہوئی ۔وہ جلدی سے ماں کے پلنگ پر آ بیٹھا۔ ماں یہ سُندری دیوی کون ہے؟اس کے مندر کی کہانی تو بتا۔ اے چل ہٹ۔ میرے پاس کہانیاں سنانے کا وقت نہیں ہے۔ ارے اماں! سنا تو سہی۔ پھر جو کہے گی کروں گا۔ سچ میں۔ اماں نے بے یقینی سے اُسے دیکھا۔ سچ میں اماں۔ تیری قسم۔ ماں کو کچھ کچھ یقین ہونے لگا۔ اچھا اچھا بتاتی ہوں۔ کہانی تو کوئی نہیں۔ سُندری دیوی کا مندر یہاں سے سو کوس دور ہے۔ سونے جیسا مندر ہے۔ لوگ بتاتے ہیں۔ اُس میں ایک دیوی رہتی ہے۔ وہ اتی سُندر ہے۔ اتنی سُندر ہے کہ کوئی اُسے آنکھ بھر کر نہیں دیکھ سکتا، اور جو اُسے دیکھ لے وہ اُسے مار ڈالتی ہے۔ دیوی اپنے گلکش میں بند رہتی ہے۔ زیادہ تر تو اس کی مورتی وہاں رہتی ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے آسمانی معبد سے اُتر کر مورتی میں جان ڈال دیتی ہے۔ جس پر وہ مہربان ہو اُسے مالا مال کر دیتی ہے۔ وہ خوش کیسے ہوتی ہے کوئی نہیں جانتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں ۔سُنی سُنائی باتیں ہیں۔ پر اُس کی مورتی تو ہے جو ایک حجرے میں بند رہتی ہے۔ وہاں کوئی جاتا نہیں۔ نہ

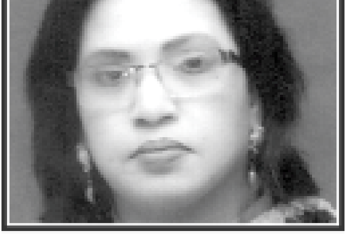

آسناتھ کنول

آج تک کوئی مرا ہے۔ سب خوفزدہ رہتے ہیں۔ میں وہاں جا کر دیکھوں۔ دیوراج جوش سے بولا۔ اُس کی آنکھیں کسی انجانی خوشی سے چمکنے لگیں۔ دیوراج میرے بیٹے تو میرا شہزادہ ہے۔ بس دیوی کے لئے بیکار ہے۔ اُس کے دیدار کے لئے کام کرنا پڑتا ہے اور تو ٹھہرا سدا کا نکما۔ تو نے ضرور دیوی کو غصہ دلاتا ہے، تا کہ تجھے مار ڈالے۔

نا۔ بابا۔ نا۔ تو یہیں رہ۔ میں کیوں تجھے گنوا لوں۔ ماتا یکدم ممتا کے الوہی روپ میں ڈھل گئی۔ بچے کی جدائی کی کسک کو سوچ کر ہی اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اوہو ماتا جی۔ کچھ نہیں ہوتا۔ میں ٹھیک رہوں گا، کام بھی کروں گا۔ وہ پہلی دفعہ ضد میں آ گیا۔ کچھ نہیں ہوگا تو بس جانے دے۔ تیرے لئے پیسے کما کر لاؤں گا۔ وہ ماں کے گھٹنے پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بہت سے وسوسے ماں کے دل میں پھیلنے لگے۔ ماں دیکھوں تو سہی۔ وہ بضد رہا۔ بات باپو کے کان تک پہنچی تو پہلے وہ حیرت زدہ رہا کہ سورج مغرب سے کیسے نکل آیا۔ پھر وہ کافی دیر سوچتا رہا۔ ایک ہی تو اس کی اولاد تھی۔ بیشک وہ جیسا بھی تھا، گھر میں تو تھا۔ وہ یوں دور چلا جائے ایسا تو اُنھوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اب دونوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ باپو نے بھی منع کیا۔ کوئی ضرورت نہیں جانے کی۔ وہ جو سارا وقت اُسے ڈانٹنے میں لگا رہتا تھا۔ اب یکدم ہی نرم دل باپ بن گیا۔ ماں تو رونے ہی لگی تھی۔ نہ دیوراج۔ تجھے کچھ ہو گیا تو۔ کتنے ہی دن یہ مسئلہ چلتا رہا۔ بات ہمسائیوں تک بھی پہنچی۔ گاؤں کے بڑوں نے بھی سمجھایا۔ مگر یہاں تو دیوراج پر کوئی بھوت ہی سوار ہو گیا تھا۔ ایسی پکی ہٹ کہ ٹوٹے نہ ٹوٹی۔ اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح چمکتی تھیں۔ چہرے کی مسکان گہری ہو گئی۔ عجیب سی مستی اُس کے انگ انگ سے پھوٹنے لگی۔ اُس کی ساری سُستی کاہلی کہیں کافور ہو چکی تھی۔ اک ان دیکھی خوشی تھی۔ اُسے ایسے لگنے لگا۔ جیسے اُسے کوئی اپنی طرف بلاتا ہو۔ وہ جلد سے جلد دیوی کے چرنوں میں سر ٹیکنا چاہتا تھا۔ وہ اُسی کے ان دیکھے ماورائی حسن کی کشش میں ڈوب چکا تھا۔ یک طرفہ عشق کی شدت نے اُسے مدہوش کر رکھا تھا۔ مدتوں بعد ماتا اور پتا نے اُسے چست اور بھاگتا دوڑتا دیکھا۔ وہ تو بدل کے رہ گیا تھا۔ دیوی کے چرنوں میں جانا تھا۔ وہ خود کو بہت صاف ستھرا رکھنے لگا۔ روز اشنان کرتا۔ صاف کپڑے پہنتا۔ اچھے سے بال بناتا۔ آنکھوں میں سُرمہ لگاتا۔ وہ روز بروز

نکھرنے لگا تھا۔ ماں تو ہر روز مرچوں سے اُس کی نظر اُتارتی۔ ہائے۔ میرا دیوراج اتنا سوہنا ہے۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔ ہائے اتنا سوہنا دیوی کے چرنوں میں کیسے ارپن کر دوں۔ کیسے اُس کا بلیدان دے دوں۔ ہائے رام میں تو مر ہی جاؤں گی۔ میں نے تو اس کا بیاہ کرنا تھا۔ جیسے جیسے اُس کے جانے کا ارادہ پختہ ہو رہا تھا، ماں باپو کا دل ڈوب رہا تھا۔ ہائے میری قسمت کب میرے منہ سے سُندری دیوی کا نام نکلا۔ پاپ ہو گیا پاپ۔ دیوی نے سُن لیا۔ اُس نے دیوراج کو بلوا لیا۔ اس کا دل پلٹ دیا۔ ہائے رام میں کیا کروں گی۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اُس کو تسلی دیتیں۔ کچھ نہیں ہوگا تو جا کر مل آیا کرنا۔ بہت لوگ وہاں جاتے ہیں۔ ان باتوں نے ماں کی ڈھارس بندھائی۔ شنیوار کو وہ خوب بن ٹھن کر اپنے بیل پر بیٹھا۔ بیل کو وہ مندر میں بھینٹ کرنا چاہتا تھا۔ دو جوڑے کپڑے، چپل، کچھ پیسے اور ایک کھیس لے کر چل پڑا۔ ماں نے راستے میں کھانے کے لئے کچھ سبزیاں اور روٹیاں بنا دی تھیں۔ روئے جاتی تھی۔ جیسے بیٹی کو وداع کر رہی ہو۔ پتہ نہیں۔ پھر کب دیکھوں گی؟ کرشنا ماتا گاؤں کے باہر تک اُسے چھوڑنے آئی۔ ماں بیٹا ملے۔ باپو تو صبح ہی کھیتوں کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ دیر تک جاتا ہوا اُسے دیکھتی رہی۔ کتنا خوش لگ رہا تھا۔ جا میرا دیوا۔ خوش رہ۔ میں جلد ہی ملنے آؤں گی۔ دیوی کرپا کرے۔ دیوی میرے بچے کے پاپ شما کر دینا۔ وہ دل ہی دل میں بدبدائی۔ گاؤں کی عورتوں نے اُسے بڑی تسلی دی۔ پھر اس نے خود کو گھر کے کاموں میں مصروف کر لیا۔ کیا کرتی۔ کوئی بس بھی تو نہیں چلتا تھا۔ رو دھو کر چپ ہو رہی۔

دیوراج چلتا رہا۔ ایک جگہ رُک کر اُس نے خود بھی جل پان کیا اور بیل کو بھی گھاس کھلائی۔ کچھ آرام کیا اور پھر چل پڑا۔ سارا دن چلتا رہا تھا۔ تھک کر چور ہو گیا۔ مگر دیوی کے چرن چھونے کی لگن نے اُسے مست کر رکھا تھا۔ گاؤں کے قریب پہنچ کر اُس نے گاؤں والوں سے مندر کا راستہ پوچھا۔ کچھ لوگوں نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ کچھ نے راستہ بھی بتایا۔ ایک بڑھیا گزرتے ہوئے رُک گئی۔ ارے بیٹا۔ رات ہو گئی۔ آج رات رُک جا۔ کل صبح جانا۔ اس وقت جانا ٹھیک نہیں۔ وہ مندر کافی ویران رہتا ہے۔ کیڑے مکوڑے، سانپ سپولے بہت ہیں۔ دن کی روشنی میں جانا۔ تاکہ اپنی حفاظت کر سکو۔ چل آ۔ میرے ساتھ میرے گھر۔ کھانا وغیرہ کھا۔ ضد نہ کرنا مجھی پڑے

گی۔ چل آ میرے پیچھے۔ اور وہ کچھ سوچتا ہوا غیر ارادی طور پر بوڑھیا کے پیچھے چل پڑا۔ وہ اب تھکن بھی کافی محسوس کر رہا تھا۔ واقعی اُسے دیوی کے چرنوں میں جانے کے لئے مکمل طور پر درست ہونا چاہیے۔ بوڑھی عورت کا گھر گاؤں میں ایک طرف الگ تھلگ تھا۔ وہ غالباً اکیلی ہی تھی۔ دیوراج اُس کی چھوٹی سی کٹیا میں پہنچا۔ آ جا بیٹا۔ گھبرا نہ آ جا۔ بوڑھی عورت نے پیار سے پکارا۔ تو وہ جھجکتا ہوا اندر چلا گیا۔ اپنی چادر پرال پر ڈال کر لیٹ گیا۔ بوڑھی عورت نے اُسے دال چاول کھانے کو دیئے۔ اُس نے بیل کو صحن میں باندھ کر چارہ ڈال دیا تھا۔ اور اپنے کپڑوں کی پوٹلی سنبھال کر رکھی۔ بیٹا ایک بات تو بتا۔ بوڑھی عورت پاس آ کر بیٹھ گئی۔ تو اچھا خاصا گھبرو ہے۔ اچھے گھر کا لگتا ہے۔ قد کاٹھ، رنگ روپ سب اچھا ہے۔ پھر یہ تیرے دل میں کیا سمائی کہ سُندری کے مندر کو جائے۔ مائی کیا تو سُندری دیوی کے بارے کچھ جانتی ہے تو بتا۔ اُس نے اشتیاق سے پوچھا۔ بس لڑکے رہنے دے۔ وہ جوان لڑکوں کو مار ڈالتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ تو وہاں نہ جا۔ ورنہ مارا جائے گا۔ مائی چھوڑ اس بات کو۔ تُو تو جانتی ہوگی، کچھ بتا اُس کے بارے میں۔ باقی میں فیصلہ کر چکا ہوں۔ چاہے کچھ بھی ہو میں وہاں جا کر رہوں گا۔ میں دیوی سے پوچھوں گا کہ وہ لڑکوں کو کیوں مار دیتی ہے۔ بیٹے اس کے پیچھے بھی ایک کہانی ہے۔ کہتے ہیں صدیوں پہلے اس گاؤں میں ایک غریب کسان رہتا تھا۔ اُس کے گھر اولاد نہیں تھی۔ وہ بہت افسردہ رہتا۔ ایک دن وہ اس مندر میں آیا۔ اور اُس نے ماتھا ٹیکا اور اولاد کے لئے دُعا کی۔ اس کی آرزو پوری ہوئی۔ اُسے ایک چاند سی بیٹی ملی۔ اُس کسان نے اُس اپنی بیٹی کا نام سُندری دیوی رکھا۔ وہ تھی ہے اتنی سُندر جیسے چاند کا ٹکڑا۔ اُس کے سنہرے بال سورج کی کرنوں جیسے تھے۔ اور آنکھیں تو کسی نیلی جھیل جیسی۔ وہ اتنی پیاری تھی کہ سب اُسے دیکھتے رہ جاتے۔ کسان اور اُس کی بیوی تو بس اُس کی ایک ایک جھلک دیکھ کر ہی جیتے تھے۔ پھر وہ جوان ہونے لگی تو دونوں میاں بیوی ڈرنے لگے۔ لوگ ان کے گھر میں اس چندرما کو دیکھ کر حیران ہو جاتے۔ سُندر دیوی جوان ہو گئی تو ایسے جیسے اس گھر میں کوئی پری اُتری ہو۔ بوڑھے ماں باپ تو بس ڈرے رہتے کہ اُسے کہاں چھپائیں۔ اُس کے حُسن کے نور سے سارے گھر میں جیسے اُجالا سا رہتا تھا۔ پھر اس کی روشنی دور دور تک پھیل گئی۔ یہ بات

گاؤں کے مکھیا تک بھی پہنچ گئی۔ بس اس مکھیا کا دل کیا کہ اُس کو دیکھے۔ ایک دن اُس نے کسان اور اس کی بیٹی کو اپنے دوارے بُلا بھیجا۔ کسان تو گڑگڑانے لگا۔ سُندری کی ماں بھی رونے لگی۔ مگر سُندری دیوی تو بہت دلیر تھی۔ باپو نہ ڈر تو چل میرے ساتھ۔ نہ پُتری وہ مکھیا بہت ظالم آدمی ہے۔ وہ تجھے ہمارے پاس نہیں رہنے دے گا۔ کسان کی آنکھیں چھم چھم برسنے لگیں۔ سُندری دیوی کا دل بہت دُکھ گیا۔ باپو میری طرف دیکھ۔ کسان نے بیٹی کی طرف دیکھا۔ اُس کی حسین نیلی آنکھوں میں جیسے آگ جلتی تھی۔ کچھ دیر کو اُسے لگا۔ جیسے وہ سچ مچ میں کوئی دیوی، کوئی اوتار ہو۔ اُس نے فوراً نظریں جھکا لیں۔ بس چل تو دلیر بن میں دیکھ لوں گی۔ مجھے اپنی حفاظت کرنی آتی ہے۔ وہ تینوں مکھیا رام لال کی حویلی پہنچے۔ سُندری نے اپنا چہرہ ڈوپٹے سے چھپا لیا تھا۔ ہاں رام دیو! سُنا ہے تیری بیٹی بہت سُندر ہے۔ دکھا تو ذرا۔ نہ مکھیا جی۔ میری بیٹی بہت نازک اور معصوم ہے۔ بہت پوتر ہے۔ کبھی کسی میلی نظر نے بھی نہیں چھوا۔ آپ اُسے دیکھ کر گنہگار نہ ہوں۔ ہمیں جانے دیں۔ ارے میں نے کیا کہا۔ جاؤ تم۔ بیٹی کو چھوڑ جاؤ۔ تیرے پاس اس کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ وہ مکروہ ہنسی ہنسا۔ نہ مائی باپ ہمیں جانے دو۔ آپکے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ سب کچھ آپ کا ہی ہے۔ پر، میری بیٹی مجھ سے نہ چھینو۔ وہ گڑگڑانے لگا۔ اے چل اُٹھ بھاگ جا۔ مکھیا کے بدمعاش بیٹے نے کسان کو دھکا دیا۔ سُندری دیوی نے جلدی سے باپ کو تھام لیا۔ اس بھاگ دوڑ میں اس کا ڈوپٹہ سرک گیا۔ مکھیا اور اُس کا بیٹا تو اُسے دیکھ کر جیسے پاگل ہو گئے۔ ان کے گاؤں میں اتنی سُندر لڑکی اور اُنھیں پتہ نہیں۔ یکدم مکھیا اُٹھا۔ اُس نے کسان کو پیچھے دھکیلا اور لڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ تم کہاں تھی سُندری۔ ہماری حویلی میں تمہاری ہی تو کمی تھی۔ او منشی۔ کسان کو پوری قیمت ادا کر۔ اُس نے یکدم ہی لڑکی کو اپنے بازوؤں میں بھرا اور حویلی کے اندر چلا گیا۔ کسان گڑگڑایا۔ چھوڑ دو میری بیٹی کو۔ بھگوان کے واسطے چھوڑ دو۔ وہ دہائی دینے لگا۔ کسان کی بیوی تو بے ہوش ہی ہو گئی۔ مکھیا کے نوکروں نے دونوں کو اُٹھا کر حویلی سے باہر پھینک دیا۔ سُندر دیوی۔ ظالم مکھیا کو اپنا اصلی رُوپ دکھا۔ میں جانتا ہوں۔ میں جانتا ہوں تو سچ مچ کی دیوی ہے۔ وہ تیرے ساتھ ظلم نہیں کر سکتے۔ تو پاک رہے گی۔ اپنی عزت کی حفاظت کر۔

سُندر دیوی کو ایسے لگا جیسے اُس کے باپ کے الفاظ اُسے سنائی دے رہے ہوں- پھر پتہ نہیں کیا ہوا؟ مکھیا کی حویلی کو آگ لگ گئی- مکھیا، اُس کا بیٹا اور سُندر دیوی سب جل گئے - کسان اور اُس کی بیوی بیٹی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے آگ کی نظر ہو گئے- سارا گاؤں ڈر گیا- مکھیا کے خاندان کے سارے جوان لڑکے مر گئے- عجیب سی تباہی آ گئی تھی- گاؤں سے باہر صدیوں سے قائم اس مندر میں یکدم روشنی ہونے لگی- لوگ بھاگے آئے- معافیاں مانگنے اور بھینٹ نظر کرنے لگے- مندر آباد ہو گیا- اکثر لوگ دعویٰ کرنے لگے کہ انھوں نے سُندر دیوی کو مندر کے اندر دیکھا ہے- کچھ لوگوں نے اس کا حل سوچا- انھوں نے سُندر دیوی کی ایک بہت حسین مورتی بنا کر اس مندر کے ایک نیم تاریک کمرے میں رکھ دی- وہ مورتی بہت حسین تھی- بالکل سُندر دیوی کے جیسی- اس پر ایک سفید دوپٹہ ڈال دیا گیا- وہ اس کی بے گناہی اور پاکیزگی کی نشانی تھا- لوگ اس کے قدموں میں کھانے پینے کی چیزیں اور روپے پیسے رکھنے لگے- چیزوں کے ڈھیر لگ گئے- اب وہ سُندر دیوی کا مندر تھا- کچھ مردوں نے یہاں کا نظام سنبھالنے کی کوشش کی مگر وہ دیوی کے قہر سے نہ بچ سکے- اب کیا کیا جائے- پھر مندر کے پروہت کی بیٹی نے مندر کی ذمہ داری سنبھالی- دیوی مردوں کو نہیں چھوڑے گی- وہ لڑکیوں کو کچھ نہیں کہے گی- آج سے یہ سُندر دیوی کا مندر ہے- اور ہم اس کی داسیاں- آج سے ہم مندر کی خدمت کریں گی- دیوی ہماری حفاظت کرے گی- پروہت نے ڈرتے ڈرتے اجازت دے دی- لڑکیاں مندر میں آئیں- تو مندر میں بڑی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی- جیسے لاکھوں پھول مہک رہے ہوں- وہ اندر کمرے میں بھی چلی جاتیں- ایسے لگتا جیسے سُندر دیوی اُنھیں دیکھ رہی ہو- وہ مندر میں دیپ جلانے لگیں اور صاف کپڑوں سے دیوی کے کمرے کی صفائی کرتیں- خوشبو جلاتیں- دیوی کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتیں- اُس کے قدموں میں پھول ڈالتیں- اُنھیں یوں لگتا تھا- جیسے وہاں کوئی سانس لیتا ہو- سُندر دیوی کی مورتی اُنھیں زندہ لگتی تھی- وہ بہت دیر دیوی سے باتیں کرتیں رہتیں- پھر باہر آ کر احتیاط سے دروازہ بند کیا- ایسے لگتا جیسے کمرے کے اندر کوئی خوشدلی سے ہنستا ہو- آہستہ آہستہ ان کا خوف دُور ہو گیا- یوں صرف کنواری لڑکیوں کو ہی مندر کے اندر

جا کر تپسیا کرنے کی اجازت تھی۔ سارا سامان غریبوں میں بانٹ دیا جاتا۔ لوگ دُور دُور سے دُعا مانگنے آتے۔ چڑھاوے چڑھاتے۔ اور اُن کی من کی مرادیں پوری ہونے لگیں۔ بس مرد اور جوان لڑکے وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ کچھ لوگوں نے کوشش کی تھی۔ مگر اُن کی لاشیں بھی نہ ملیں۔

وہ ششدرہ بیٹھا یہ کتھا سُنتا رہا۔ اشتیاق اُس کے اندر اور جوش مارنے لگا۔ مائی تم نے ایک بات سوچی ہے۔ وہ بڑے گمبھیر اور فلسفیانہ انداز میں گویا ہوا۔ اس کی آنکھیں تاریکی میں کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ مائی ہو سکتا ہے ان مردوں نے کچھ ایسا بُرا کیا ہو کہ وہ اُس سب کا بدلہ مردوں سے لے رہی ہے۔ بیٹا جو اُسے اُٹھا کر لے گئے تو بڑے کام کا آغاز تو ہو گیا ناں۔ تو ماتا جب بھی کوئی بُری نیت سے مندر میں جاتا ہے۔ تو وہ مارا جاتا ہے۔ ورنہ اس گاؤں کے سارے مرد مر چکے ہوتے۔ ہاں پُتر! یہ بات تو مجھے سوجھی ہی نہیں۔ بس مائی۔ تو پھر سمجھ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔ اس لئے کہ میری نیت میں کوئی کھوٹ نہیں۔ میں تو اس کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ دل و جان سے اور بس ایک بار اس کا دیدار۔ چاہے موت ہی آ جائے۔ ہائے پُتر۔ کیا بول رہا ہے۔ دیکھ تو نے اب ارادہ کر لیا ہے۔ تو تجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ پر اُس سے معافی مانگ لیو۔ اُس کا قہر ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا سو جا اب۔ وہ اپنے کھیس میں گھس تو گیا۔ مگر اُس کی آنکھوں میں اک نامعلوم سی چمک تھی۔ وہ خیالوں کو جمع کر رہا تھا۔ تا کہ سُندر دیوی کی مورت کھوج سکے۔ یونہی صبح کا سویرا پھیلنے لگا تو وہ اُٹھ بیٹھا۔ کھیس اور کپڑے سمیٹ کر بیل کو چارہ ڈالا۔ مائی نجانے کہاں تھی۔ اُس نے انتظار تو کیا مگر وہ بوڑھی عورت اُسے کہیں دکھائی نہ دی۔ اُس نے گھڑونچی سے پانی پیا۔ رات کے بچے ہوئے چاول کھائے اور بیل کو لے کر مندر کی طرف چل پڑا۔ راستہ بہت اوبڑ کھابڑ تھا۔ روڑے، پتھر، کنکر، جھاڑیاں اور کانٹے۔ بکھری ہوئی شاخیں اور خزاں زدہ پتوں کے ڈھیر جو یہاں سے وہاں اُڑتے پھرتے تھے۔ پتہ نہیں لوگ یہاں صفائی کیوں نہیں کرتے۔ راستے کتنے خراب ہیں۔ کچھ ہی دور اُسے ویران مندر کے کھنڈرات نظر آنے لگے۔ کبھی وہ چمکتا ہوا کلس ہو گا جو اب آفات زمانہ سے زنگ آلود ہو چکا تھا۔ جگہ جگہ کائی اور خود رو بوٹیاں اور جھاڑیاں۔ سیلن نے سب دیواروں کو کھوکھلا کر رکھا تھا۔ باہری دیوار بھی ٹوٹ پھوٹ چکی تھی۔ پتوں کے ڈھیر حشرات الارض کے بسیرے کتنے ہی سرسراتے ہوئے اپنی تھوتھنیاں نکالے اس نئے مہمان کو قہر آلود

آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ نہ بندہ نہ بندے کی ذات۔ بیل خوفزدہ ہو رہا تھا۔ رسی تڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ چاروں طرف کا جائزہ لے ہی رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے وہی بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکتی ہوئی نظر آئی۔ دیوراج کسی دوسرے انسان کو دیکھ کر خوش ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہاں تو کوئی ذی روح نہیں تھا۔ پہلے تو اُس کے قدم ڈگمگائے تھے۔ ایسے مندر میں سُندر دیوی کیسے رہ سکتی ہے۔ شائد لوگوں نے عرصے سے یہاں آنا چھوڑ دیا ہے۔ تم نے میرا انتظار بھی نہیں کیا۔ مائی تم وہاں نہیں تھیں۔ میں نے دیکھا تھا۔ میں نے سوچا سورج کے اُگنے سے پہلے یہاں آجاؤں۔ اب کیا کرو گے۔ پہلے تو اس جگہ کی صفائی کروں گا۔ پھر اپنے رہنے کی جگہ بناؤں گا۔ پھر دھیرے دھیرے اس جگہ کو ٹھیک کروں گا۔ وہ بڑی آسانی سے بول رہا تھا جیسے کوئی آسان سا کام ہو۔ اچھا چلو ٹھیک ہے۔ جب تک کام مکمل نہ کر لو۔ رات کو میری کُٹیا میں آجانا۔ ابھی رات اکیلے گزارنا مشکل ہو گا۔ اچھا مائی۔ میں جا کر تیرے لئے کھانا بناتی ہوں۔ وہ واپس مڑ گئی۔ اب کافی دھوپ نکل آئی تھی۔ ماحول قدرے بہتر نظر آنے لگا۔ اُس نے جھاڑیاں اور تنکے جمع کر کے ایک جھاڑو بنایا اور مندر کے راستے اور سیڑھیوں کی صفائی کرنے لگا۔ وہ پوری لگن سے کام کر رہا تھا۔ صفائی ہوتی جا رہی تھی۔ مندر کا روپ بدلتا جا رہا تھا۔ اُس نے ساری جھاڑیاں اور کانٹے اُٹھا کر ایک جگہ جمع کئے۔ صحن کو صاف کیا۔ سیڑھیوں کو صاف کیا۔ کنواں تو بند پڑا تھا۔ اُسے کھلوانا پڑے گا تا کہ پانی کا انتظام ہو سکے۔ شام ہونے لگی تھی۔ دیوراج جس نے کبھی کچھ نہ کیا تھا۔ پتہ نہیں۔ یہ کیسا جذبہ تھا کہ ایک ہی دن میں اُس نے مندر کے راستے اور سیڑھیوں کی کایا پلٹ دی۔ اس سے پہلے کہ سورج غروب ہو جائے وہ چیزیں سمیٹ کر واپس مڑا تو اُسے ایسے لگا جیسے سرد ہوا کا جھونکا اس کے قریب سے گزرا ہو۔ وہ تھرا کر رہ گیا۔ کچھ خوفزدہ بھی ہوا مگر جلد ہی اُس کا اعتماد لوٹ آیا۔ سُندر دیوی زندہ باد۔ وہ بیل پر بیٹھ کر آہستہ آہستہ واپس کُٹیا کی جانب چل پڑا۔ چہرے پر عجیب سی شانتی اور سکون تھا۔ اُسے لگا اُس نے پہلا پڑاؤ پار کر لیا ہے۔ دیوی نے اُسے کچھ نہیں کہا۔ بھلا دیویاں بھی کبھی مرتی ہیں۔ وہ زندہ ہے۔ اب بھی زندہ ہے۔ وہ ضرور مجھے ملے گی۔ اسی بارے سوچتا وہ کُٹیا میں پہنچا۔ بیل کو باندھا اور کُٹیا کے پرال پر کھیس بچھا کر لیٹ گیا۔ وہ آج کے دن کے سارے کام کو سوچنا چاہتا تھا۔ دیوراج خود پر بھی حیران تھا۔ کبھی خود اُٹھ کر پانی تک نہ پینے والا آج سارا دن مندر کی صفائی کرتا

رہا۔ دیوی مجھ سے خوش ہے۔ تارا مائی اُس کے لئے روٹی سبزی لے آئی۔ تھک گیا ہے۔ پر تو پہلا مرد ہے جو اتنا نڈر نکلا۔ ورنہ تو لوگ دو کوس دُور ہی گزرتے ہیں مندر سے۔ مدتوں سے کسی نے دیا نہیں جلایا۔ تارا مائی تم نے بھی کبھی نہیں جلایا۔ میں کیسے! وہ گڑبڑا گئی۔ میں وہاں کیسے جاؤں بوڑھی عورت۔ آج تو تم کو دیکھنے چلی گئی تھی۔ مجھے تمھاری فکر تھی۔ دیوراج نے کھانا کھایا اور سُندر دیوی کے سپنوں میں کھو گیا۔ عجیب سی خوشبو اس کے اردگرد پھیلی رہی۔ ایک روشنی کا ہالہ گھومتا رہا۔ کوئی اپنے ہاتھوں سے اس کی تھکن اُتارتا رہا۔ عجیب سی آسودگی اُس کے تن بدن میں اُتری تھی۔ روح بھی سرشار تھی۔ اگلے دن پھر پرعزم ہو کر نکلا۔ تارا مائی کنواں چالو کرنا ہے۔ مدد کرو۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پوچھتی ہوں کسی سے۔ لوگ ڈرتے ہوئے جاتے نہیں ادھر۔ مائی اُنھیں بتا کہ میں وہاں ہوں۔ سری رام گاؤں سے آیا ہوں۔ گھبرائیں ناں۔ اُنھیں کچھ نہیں ہوگا۔ وقت گزرتا گیا۔ مندر اور اس کے اردگرد کا علاقہ صاف ہوتا گیا۔ مندر کے دروازے اُس نے خود کھولے۔ روشن دان کھولے۔ دھوپ نے واس کیا تو اندر کا ماحول بدلنے لگا۔ صاف صفائی کے لئے بہت سی لڑکیاں اور خواتین آ گئیں۔ مندر کے باہر کا علاقہ بھی صاف کر دیا گیا۔ دیواریں بن گئیں۔ بنجر زمین لہلہانے لگی۔ مندر کا کلس چمکنے لگا۔ سارے مندر پر چونا پھیرا گیا۔ دیے جلنے لگے۔ بھگوان کی مورتیوں کو صاف ستھرا کیا گیا۔ لوگ پھر ڈرتے ڈرتے چڑھاوے چڑھانے اور منتیں ماننے لگے۔ ایک دن ایک پروہت کہیں سے آ نکلا۔ کیا تم براہمن ہو؟ نہیں پجاری جی۔ تو پھر تم اس مندر کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ اچانک پجاری اپنا گلا پکڑ لیا۔ جیسے کوئی اس کا نرخرہ دبا رہا ہو۔ معاف کر دو دیوی جی۔ ہم سے پاپ ہو گیا۔ سنو پجاری جی۔ بچنا ہے تو بھاگ جاؤ۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ اس براہمن پجاری نے ایسا ہی کیا۔ دیوراج کے منہ سے لفظ کیا نکلے۔ جیسے یکدم کسی ان دیکھی چیز نے جھٹ سے اُس کا گلا چھوڑ دیا۔ وہ دھوتی سنبھالتا بھاگتا چلا گیا۔ رام رام بچ گیا۔ وہ بھاگتے بھاگتے ایک درخت کے نیچے سانس لینے کو رُکا۔ لگتا ہے دیوی جی جندہ ہیں ابھی۔ پر ایک بات سمجھ نہیں آئی۔ وہ اپنی موٹی ٹنڈ پر ہاتھ مار کر بولا۔ یہ نیا پجاری جندہ کیسے ہے؟ پتہ کرنا پڑے گا۔ کچھ دیر کو وہ جاسوس بن گیا۔ مگر ایک بات وہ جانتا تھا کہ مندر سالوں سے بند تھا۔ اب یہ آباد بھی ہو گیا ہے۔ تو اس نئے چھوکرے کے ساتھ کوئی تو بات ہے۔ پر وشواس نہیں ہوتا کسی نے میرا گلا دبایا۔ اس نے

یکدم اپنا گلا پکڑ لیا اور پھر اُس کے کہنے پر چھوڑ بھی دیا۔ رام رام کچھ تو ہے۔ اچھا ہمیں کیا۔ دیوی کی کرپا ہے اس پر تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ناں بابا۔ ہمیں مرنا نہیں۔ وہ گھر کی اور چل دیا۔

دیوراج تو مندر اور اپنے نواس کا اتنا عادی ہو گیا جیسے صدیوں سے وہ یہیں رہتا رہا ہے۔ عجیب سی شانتی تھی۔ من میں کوئی خوف نہیں، جلدی نہیں۔ پہلے تو وہ اپنا کھانا خود پکاتا تھا۔ اب تو گھروں سے مزے مزے کا پکا پکایا آ جاتا۔ لوگ پجاری کو ماننے لگے تھے۔ دیوراج تو تھا بھی کافی جوان اور سوہنا۔ اور اب تو وہ اور خوب صورت ہو گیا تھا۔ دیوی کی سنگت نے اُس پر بڑا اثر ڈالا تھا۔ سارا دن وہ کسی ترنگ میں رہتا۔ دیوی کے نواس کے باہر بیٹھا وہ یہی سوچتا رہتا۔ سُندر دیوی کب درشن دے گی۔ دنیا میں دیوی کے درشن سے اہم کام اس کے لئے اور کوئی نہیں تھا۔ ایک دن چار پانچ کنواریاں ہنستی کھیلتی مندر میں پوجا کرنے آئیں۔ تو ایک شوخ و چنچل حسینہ نے دیوراج کو ذرا چھیڑا۔ اے پجاری جی۔ صدیوں پرانی دیوی کے انتظار میں رہو گے۔ ہم بھی تو سامنے ہیں۔ کسی کو پسند کر لو اپنے لئے۔ ابھی اس کے منہ سے یہ جملہ ادا ہی ہوا تھا کہ لڑکی کو اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ لڑکی سخت اذیت میں تھی۔ دیوی شما کر دو۔ پھر نہیں کہوں گی۔ یکدم جیسے کوئی ہوا سی ادھر سے گذر گئی۔ رام رام۔ ایسے شبد نہ بولا کرو۔ میں اب صرف سُندر دیوی کا پجاری ہوں۔ اُس کے علاوہ کوئی میرے جیون میں نہیں۔ وہ بند آنکھوں سے مسکرانے لگا تھا۔ عشق نے اُس کو بدل کر رکھ دیا تھا۔ ساری لڑکیاں ڈر کر بھاگ گئیں۔ وہ اپنی دھوتی کُرتا سنبھالتا جلدی سے دیوی کے کلکش تک پہنچا اور پریم سے دروازے پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے دیوی کے بدن کو چھو رہا ہو۔ دیوی میں تمہارا ہوں۔ تم نے دیکھا۔ بغیر بغیر تمہیں دیکھے، تم سے ملے، تمہارے عشق کی آگ میں جل کر بھسم ہو گیا ہوں۔ لوگوں کو ڈرایا نہ کرو۔ تمہیں میری سوگندھ۔ اُسے یوں لگا جیسے دیوی کے کلکش سے مدھری ہنسی کی آواز آئی ہو۔ اُسے ماتا اور باپو کی بھی کبھی یاد نہ آئی۔ ایک دن ماتا پتا خود آ براجے۔ وہ مندر کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ دیوا! یہ سب تو نے کیا ہے۔ ماتا کرشنا دیوی نے حیرت سے دیکھا۔ ہاں ماتا یہ سب کام میں نے کیا۔ تو تو بہت سوہنا لگ رہا ہے میرے لال۔ ماں کی آنکھوں کو نور مل گیا۔ ماتا پتا کے پیروں میں ایک ایک پھول، پتہ نہیں کہاں سے آیا۔ ارے یہ پھول۔ سُندر دیوی نے نمستے کیا ماتا۔ اچھا اچھا۔ کاش وہ زندہ ہوتی تو میں اُسے اپنی بہو بنا لیتی۔ اندر

کہیں دور سے ہنسنے کی آواز آئی۔ چل ماتا۔ آرام کر لے۔ پھر تجھے تیری دیوی کے درشن کراتا ہوں۔ ماتا پتا سارا دن اُس کے ساتھ رہے۔ گاؤں والوں کے بھیجے ہوئے مزے مزے کے بھوجن کھائے۔ ماں نے سُندر دیوی کو دیکھا تو دیکھتی رہ گئی۔ ہائے کتنی سُندر ہے۔ اُس نے ایک گوٹے کناری والا ڈوپٹہ نکال کر دیوی کے سر پر ڈال دیا۔ دیوی میرا بچہ میرا لال تیری امان میں ہے۔ اس کی حفاظت کرنا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دیوی کی سسکیاں سُنائی دینے لگیں۔ چل ماں۔ شام ہو رہی ہے۔ باپو دور ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔۔ باپو دیکھ لے تیرا ست اور نکما بیٹا نیک کام پر لگ گیا ہے۔ وہ دیکھو ساتھ میں ایک بڑا سا گھر بنا رہے ہیں۔ غریبوں اور بے سہاروں کے لئے دیوی کی کرپا سے۔ اب دیوی لوگوں سے پریم کرتی ہے۔ میرا لال نیک کام کرتے رہو۔ تاکہ دیوی خوش رہے۔ میرا نمستے کہنا اُسے۔ ہاں ٹھیک ہے ماں۔ سب لوگ جا چکے تھے۔ مندر کے ایک کمرے میں جو دیوی کے کمرے کے قریب تھا، راج دیو سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ فرش پر لگے ہوئے بستر پر وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ دیا مدھم روشنی دے رہا تھا۔ بند آنکھوں میں دن بھر کی تھکن اُتری تھی۔ یوں لگا جیسے اس کے بالوں میں کوئی نرم انگلیاں پھیر رہا ہو۔ کسی نے اُس کے چہرے کو چھوا۔ گرم سانسوں کی مہک اُس کی سانسوں کو معطر کر رہی تھی۔ اُس کا سارا بدن پسینے میں نہا گیا تھا۔ جیسے سو میل کی دوڑ لگا کر آیا ہو۔ دیوی کے غیر مرئی وجود کی مہک اُس کے اپنے وجود سے اُٹھ رہی تھی۔ سُندری تم کہاں ہو؟ کہاں ہو تم۔ میرے پاس آؤ۔ پتہ نہیں خواب تھا کہ حقیقت۔ اچانک اُس کی آنکھ کھلی تھی۔ اندھیرے میں کوئی دوسرا تو تھا۔ اُسے جسمانی اختلاط کا احساس ہوا۔ کوئی وجود اس کے بازوؤں میں سرسراتا رہا۔ کتنی ہی دیر وہ گم صم لیٹا ہانپتا رہا۔ سُندری۔ تو کیا سچ مچ سُندری آئی تھی۔ سُندری اُس کے لبوں سے پھسلا۔ دور کہیں مدھر ہنسی کی آواز اُس کے کانوں میں گونجی۔ سُندری آج تو انتہا کر دی۔ کاش کبھی سامنے آؤ۔ نظروں کے سامنے۔ باہر ملگجا اندھیرا اچھل رہا تھا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر کنویں پر پہنچا۔ پانی نکالا۔ اشنان کر کے پوجا کے لئے تیار ہوا۔ بہت خوش تھا۔ مگر ایک میٹھی تھکن اور کسلمندی بھی تھی۔ دیوی مجھے معاف کر دو شائد کسی نے مدھرا پلا دی ہو۔ وہ یہ سب سمجھنے سے قاصر تھا۔ پوجا پاٹ شروع ہو گیا لوگ پوجا کو آنے لگے۔ وہ رام رام کرتا مندر کے دیگر کاموں میں مصروف رہا۔ دیوا اُسے ملنا ضروری تھا آج۔ مندر کے

داس اِدھر اُدھر ہوئے تو وہ سُندری کے کلکش میں چلا گیا۔ کتنی ہی دیر اُس کی نیلی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔ کانچ کے جیسی چمکتی آنکھیں۔ دیوراج کا دل دھڑک رہا تھا۔ اُسے پہلی بار اپنے بھرپور جوان مرد ہونے کا احساس ہوا۔ جنسی کمالات اور لذتوں سے بھرپور۔ اُس نے دیوی کے پتھریلے مرمریں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھے۔ تو ایک سسکاری سُنائی دی۔ سُندری تم نے میرا پریم قبول کرلیا۔ دھن واد۔ بس میری حماقتوں کو معاف کر دیا کرو۔ اُس نے پہلی مرتبہ دیوی کے مرمریں ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اِک سکون بھری لذت اُس کے وجود میں پھیل گئی۔ تیرے پاس ہی ہوں فکر نہ کر۔ ابھی لڑکیاں آکر تجھے اشنان کراتی ہیں۔ وہ باہر چلا گیا تو داسیاں آکر اُس کی خدمت کرنے لگیں۔

سارا دن وہ ان دیکھی مستی میں گم رہا۔ اُسے رات کا انتظار تھا اور اپنی سُندری کا۔ وہ خیالوں میں آکر اُس کے وجود سے زندگی کا رس کشید کرلے۔ اُسے خالی کردے۔ اُسے پُرسکون کردے۔ بس وہ کسی اَن دیکھی آگ میں جلنے لگا تھا۔ یہ سب کیا تھا۔ اُس نے تو کبھی یہ سب کچھ سوچا بھی نہیں تھا۔ دیئے جل اُٹھے تھے۔ سارا مندر جگ مگ کر رہا تھا۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ درختوں کے سائے لمبے ہو گئے۔ سورج کا تھال اپنی دور اُفق تک پھیلی لالی سمیٹ رہا تھا۔ فضاؤں میں اک سکون سا بکھر گیا۔ کتنی حسین شام تھی۔ دیوراج کی آنکھوں میں انتظار چمک رہا تھا۔۔ داس اور داسیاں اپنے اپنے حجروں میں جا چکے تھے۔ چولہے ٹھنڈے ہوئے۔ دھواں نکلنا بند ہو چکا تھا۔ مگر دیوراج کے بدن میں لگی آگ دھیرے دھیرے دھواں دینے لگی تھی۔ وہ شدت سے خواہش مند تھا کہ دیوی اُسے اپنا دیدار کرادے۔ شام سے رات اُتر آئی۔ رات گہری ہوئی مگر آج نیند دیوراج کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ تڑپتا رہا۔ سلگتا رہا مگر دیوی نے نہ آنا تھا نہ آئی۔ وہ بے قرار ہو کر ہوکتا رہا۔ رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ عجیب سی کسلمندی تھی۔ رات نیند نہ آنے کا عکس اُس کی آنکھوں میں رقص کر رہا تھا۔ اشنان کے بعد اُس نے پوجا کی تیاری شروع کردی۔ یوں جیسے آج وہ دیوی سے روٹھا رہا۔ دیوی کے سامنے آیا۔ مجھے شما کردو۔ تم نے بس مجھے پاگل کر دیا ہے۔ وہ اُداس ہو کر باہر جانے لگا۔ اُسے سسکیاں سُنائی دے رہی تھیں۔ جیسے کوئی اُسے روک رہا ہو۔ وہ اپنے حجرے میں جا کر لیٹ گیا۔ عجیب سی خوشبو

اس کے اردگرد بے قرار پھرتی رہی۔ دیوی کی سسکیوں میں آنسو گھلے ہوئے تھے۔

کتنے ہی دن گزر گئے۔ وقت اپنی چال چلتا رہا۔ بے قرار بڑھتی جا رہی تھی۔ کھانا پینا بھی کم ہوگیا۔ عجیب سی اُداسی نے دیوراج کے اندر واس کر لیا تھا۔ دیوی کے قرب نے اُسے دیوانہ بنا دیا تھا۔

وہ دیوی کی روح سے نہیں بلکہ اس کے جسم سے ملنا چاہتا تھا۔ اُسے محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ زندگی عجیب سے دوراہے پر آ کر اٹک گئی تھی۔ پتھر کی مورتی سے محبت نے ایسا اثر شروع کر دیا تھا۔ اُسے لگتا تھا کہ کسی دن یہ مورتی انسانی شکل میں اُس سے ضرور بات کرے گی۔ چاہے وہ اُس کی زندگی کا آخری دن ہی کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے یقین کو مجسم صورت میں دیکھنے کو ترسنے لگا۔ گھنٹوں مورتی کے آگے کھڑا رہتا۔ اُسے وہ مورتی انسانوں کی طرح زندہ لگتی۔ زندگی اُس سے روٹھ رہی تھی۔ اب تو گویا اُس نے بھرت رکھ لیا تھا۔ داس اور داسیاں پجاری کو سنبھالنے کے لاکھ جتن کرتے۔ وہ سب جان گئے تھے کہ دیوراج سُندر دیوی کے عشق کی ساری حدیں پار کر چکا تھا۔ اُس کی نیت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ آج وہ صبح ہی سے غنودگی میں تھا۔ اپنے بستر پر لیٹے لیٹے اُس نے بمشکل آنکھیں کھولیں۔ اُس کے ساتھ ہی سُندر دیوی کی مورت پڑی تھی۔ اُس نے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا۔ سُندری! وہ اُٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر نقاہت کے مارے ہل بھی نہ سکا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سُندر دیوی اپنے سارے حسین روپ کے ساتھ اُس کے سامنے تھی۔ میں ہار گئی دیوراج۔ تمھاری محبت نے مجھے ہرا دیا۔ تمھاری خواہش کے آگے ہار گئی۔ بس کچھ پل کے لئے یہ زندہ روپ صرف تمہارے لئے ملا ہے۔ اس کے بعد میں ابدی مقام میں چلی جاؤں گی۔ میں بھی دیوی تمھارے حُسن کی تاب نہیں لا سکتا۔ میں تمھیں چھو نہیں سکتا۔ تم بہت پوتر ہو۔ بس تمھارا دھن واد سُندری۔ تم نے بلا آخر میری اس خواہش کو پورا کیا۔ تم نے عشق کی لاج رکھی۔ دیوی آگے بڑھی اور اپنے لب دیوراج کے کانپتے لبوں پر رکھ دیئے۔ دن گزر گیا۔ داسی نے دیکھا اور چیخ مار کر بھاگی۔ سب دیوراج کے حجرے کے باہر جمع تھے۔ وہ زندگی کی سرحد پار کر چکا تھا۔ اُس دن سے سُندر دیوی کی مورتی غائب ہے۔ لوگ اب مورتی کی جگہ دیوداس کی سمادھی پر پھول چڑھاتے اور دیئے جلاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

خاموشی کی زباں

ہال کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہر عمر، ہر طبقے، ہر جنس سے تعلق رکھنے والے افراد کی موجودگی آج کے دن کو خاص بنا رہی تھی۔ تقریب اس شخص کے اعزاز میں تھی، جو برسوں سے دلوں پر لفظوں سے حکومت کرتا آیا تھا۔ آج جب وہ اسٹیج پر تھا تو ہر آنکھ اس پر مرکوز تھی، اور ہر دل دھڑک رہا تھا کہ کب وہ اُن لفظوں کو زبان دے گا جن سے وہ محبت کرتے ہیں۔

وہ اپنے چاہنے والوں کی بھیڑ میں مسکراتا ہوا کبھی کسی سے مصافحہ کرتا، کبھی کسی کو آٹوگراف دیتا، کبھی کسی کے ساتھ تصویر کھنچواتا۔ اس کے چہرے پر وہی مانوس سی مسکراہٹ تھی جسے دیکھ کر قاری خود کو اہم محسوس کرتے۔ لیکن وہی قاری اگر اس کے اندر جھانکتے تو شاید جان جاتے کہ وہ مسکراہٹ، کبھی کبھی ایک دکھ کی چادر میں لپٹی مجبوری بھی ہوتی ہے۔

تقریب کے اختتام پر سوال و جواب کا سلسلہ ہوا۔ کچھ سوالات اس کی نئی تصنیف پر تھے، کچھ اس کی زندگی کے نشیب و فراز پر۔ اور کچھ ایسے بھی تھے جن میں ذاتیات کی دیوار پھلانگنے کی جسارت تھی۔ وہ ہر سوال کا جواب اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں دیتا رہا۔ لیکن اس کی آنکھیں... وہ کچھ اور کہہ رہی تھیں۔

دور ہال کے ایک گوشے دو آنکھیں نے مسلسل اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ لبوں پر دھیمی مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمکتے جگنو اس بات کے گواہ تھے کہ آج اس کی بھی دلی خواہش پوری ہوئی ہے۔

آنکھوں میں آئی نمی کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے اس نے اپنے بیگ سے ڈائری اور پین نکالا اور رش ختم ہونے کے انتظار میں وہیں اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

تقریب کا شور اب مدھم ہو چکا تھا۔ ہال میں چند لوگ باقی رہ گئے تھے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھی۔ ہاتھ میں ڈائری اور پین تھا۔ آنکھوں میں احترام، اور قدموں میں ہچکچاہٹ۔ وہ آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھی، جو اب تھکن سے چور، لیکن بدستور مسکراتا، اسٹیج سے نیچے رکھے تحائف کو دیکھ رہا تھا۔

''السلام علیکم! اگر آپ کے پاس تھوڑا وقت ہو تو میں کچھ کہنا چاہتی ہوں'' قریب ہی وہ لڑکی، جو تقریب کے آغاز سے اب تک خاموش تماشائی بنی ہوئی تھی اب اس کی جانب بڑھی۔

''جی، ضرور'' لکھاری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میں نے آج آپ کے لفظ نہیں، آپ کے چہرے پہ درج وہ درد پڑھا ہے جسے چھپاتے چھپاتے شاید آپ تھک رہے ہیں'' اس لڑکی

طوبیٰ صدیقی

نے اپنی بات کہی تو لکھاری نے چونکتے ہوئے اسے دیکھا۔

لوگ سوال کر رہے تھے، اور آپ اپنے مخصوص ٹھہرے ہوئے انداز میں جواب دے رہے تھے لیکن آپ کی آنکھیں کچھ اور کہہ رہی تھیں"، اس لڑکی نے نرمی سے اپنی بات کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو اب لبوں پر دھیمی مسکراہٹ لیے اسے سن رہا تھا۔

"کبھی کبھار، سوال لفظوں کے نہیں ہوتے، حد سے بڑھتے تجسس کے ہوتے ہیں"، لکھاری نے اس کے انداز ے پہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو کیا میں اس موضوع پر لکھ سکتی ہوں"، اس لڑکی نے اجازت لیتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور لیکن آپ کا تعارف؟" اس کے کہنے کی بات پہ چونکتے ہوئے اس نے استفسار کیا۔

"میرا نام زویا ابراہیم ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ میں ایک لکھاری ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کی مداح بھی ہوں۔ آپ کو پڑھا ہے اور ہر چاہنے والے کی طرح آپ کے بارے میں جاننے کا تجسس بھی رہا ہے لیکن آج . . "، اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے اس نے اس کی طرف دیکھا جو اپنے ازلی مسکراتے چہرے کے ساتھ اس کی بات مکمل ہونے کا منتظر تھا۔

"آج معلوم ہوا ہے، تجسس بھی ایک حد تک ہونا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں نا ہر چیز اعتدال میں اچھی لگتی ہے۔ اور یہی بات میں اپنی تحریر کے ذریعے پڑھنے والوں کو بتانا چاہتی ہوں"، اس نے اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے اپنا مدعا بیان کیا۔

"کیا میں جان سکتا ہوں مس زویا کہ آپ اس موضوع پر کیوں لکھنا چاہتی ہیں؟" سامنے بیٹھے شخص نے اس کی آنکھوں میں لکھی اک ان کہی داستان دیکھی تو اس سے پوچھ بیٹھا۔

"مجھے وقت نے سکھایا ہے کہ اگر ہم واقعی کسی پبلک فگر سے محبت کرتے ہیں، تو سب سے پہلی چیز جو ہمیں دینی چاہیے وہ احترام اور آزادی ہے۔ جس سے ہم بالکل ناواقف ہے"، اس لڑکی نے آنکھیں بند کر کے کھولتے ہوئے کہا۔ سماعتوں میں چند سال پہلے کسی کے جملے کی بازگشت سنائی دی۔

"بالکل درست، مجھے خوشی ہوئی یہ جان کر کہ آپ کا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ احترام اور آزادی جتنا ایک عورت کا حق ہے اتنا ہی کسی مرد کا بھی"، اس کی بات پہ متفق ہوتے ہوئے اس نے اپنی رائے دی۔

"میں اپنے تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر ہی ہر طبقے کے مرد و عورت کو یہ بات پیغام دینا چاہتی ہوں جسے سمجھنے میں مجھے بہت وقت لگا ہے"، آنکھوں میں آتی نمی کو صاف کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں اس لڑکی کو کافی دیر سے دیکھ رہی تھی جو آٹوگراف کے بہانے تو کبھی سیلفی لینے کی غرض سے آپ کے ساتھ لگ رہی تھی اور آپ کی آنکھوں میں چھائی ناگواری مجھے تکلیف دے رہی تھی"، اس نے دھیمی انداز

میں سر جھکاتے ہوئے کہا۔
"جی وہ کوئی قاری تھیں"، اس کی بات کی نفی یا کوئی منفی بات کہنے بجائے اس نے نرمی سے کہا۔
"آپ جانتے ہیں... آج اس لڑکی کو دیکھ کر میرے ماضی کا ایک باب کھل گیا۔ ایک باب جو شاید میں کبھی بند ہی نہ کر پاتی اگر آج وہ منظر نہ دیکھتی۔ کبھی میں بھی ایسی ہی تھی۔ ایک فنکار... بہت مشہور مصور، میری پسند بن گیا تھا۔ میں اس کے کام سے محبت کرتی تھی، اس کے رنگوں میں کھو جاتی، اس کی ہر نمائش میں، ہر تقریب میں، بلا جھجک پہنچ جاتی۔ پہلے پہل وہ مسکرا کر دیکھتا، آٹوگراف دیتا، لیکن پھر ایک دن... میں نے اس کی آنکھوں میں وہی تھکن، وہی ناگواری دیکھی جو آج آپ کی آنکھوں میں جھلک رہی تھی"، لکھاری نے گہری سانس لی، جیسے کوئی ان کہی بات سننے کے لیے خود کو تیار کیا ہو۔
"وہ میری محبت نہیں تھی، نہ کوئی وعدہ، بس پسند جیسے ضد بن گئی تھی۔ مجھے لگا میری محبت اسے قائل کر لے گی، لیکن میری زور زبردستی اسے مجھ سے مزید دور کر رہی تھی اور پھر وہ حقیقتاً مجھ سے بہت دور چلا گیا۔ بہت تلاش کے بعد بھی مجھے اس کا کوئی سراغ نہیں ملا"، زویا کی آواز میں نمی اتر آئی تھی، اور لکھاری خاموشی سے سن رہا تھا، بغیر کوئی مداخلت کیے۔
"آج اس مصور کی آنکھوں میں کبھی دکھائی دینے والی بے زاری، آپ کی آنکھوں میں نظر آئی اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میری ماضی کی پرانی کوتاہیوں کا کوئی حساب مانگا جا رہا ہو"، اس نے تکلیف سے کہتے ہوئے اس کی طرف دیکھا جو بغور اسے سن رہا تھا۔
"جو اپنے ماضی کی غلطیوں سے سیکھتا ہے، وہی اصل میں ایک اچھا انسان ہوتا ہے"، لکھاری نے بغیر کوئی تبصرہ کیے مسکراتے ہوئے اس کی ڈائری پہ آٹوگراف لکھ کے ڈائری اس کی جانب بڑھائی اور اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا۔
ہال میں اب وہ تنہا بیٹھی اپنی ڈائری میں لکھی ان دو سطروں پر مشتمل آٹوگراف کو دیکھا اور دھیمی مسکراہٹ لیے اپنی آنکھوں کو بند کیا جہاں آج بھی اس مصور کی بھوری آنکھوں کا عکس نقش تھا۔
ڈائری بند کرتے کرتے اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے چند صفحات پلٹے، اور ایک پرانے صفحے پر نظر پڑی۔ یہ تاریخ تین سال پرانی تھی۔ زاویار کے دستخط کے ساتھ اس کا آخری آٹوگراف بھی موجود تھا۔
"محبت جب زبردستی دروازہ کھٹکھٹانے لگے، تو خاموشی سے کھڑکی بند کر دینا بہتر ہوتا ہے"، تب وہ ان الفاظ پر خفا ہوئی تھی۔ اسے لگا تھا زاویار اسے ٹھکرا رہا ہے مگر آج... آج پہلی بار وہ اس جملے کا مفہوم سمجھی تھی۔
"مجھے معاف کر دینا، زاویار"، آنسو، جو کبھی شکوے بن کر نکلتے تھے، آج ندامت اور شکر کے احساس میں بہہ رہے تھے۔ پھر ایک عزم سے آنکھیں کھولیں، ڈائری بند کی اور دھیرے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ماضی کو پیچھے چھوڑ کر، بہتر انسان بننے کے سفر کا آغاز کرنے کے لیے۔

☆☆☆☆☆

”امی کی چادر“

بارش آہستہ آہستہ کچے صحن کی زمین پر گرتے ہوئے اداس دھن بجا رہی تھی۔ دھن اداس تھی یا سماعت؟ اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانکتی لڑکی اندازہ نہ لگا سکی۔ کچن سے چھن سے کچھ گرنے کی آواز آنے پر فری نے چونک کر کھڑکی سے نظریں ہٹائیں۔ اب امی اسے کچن دروازہ کھلا چھوڑ دینے پر کوسیں گی۔

”فری!

او فری۔۔۔!

کچن کا دروازہ پھر بند نہیں کیا؟ دیکھ بلی پھر سب بکھیر گئی ہوگی۔“

غسل خانے سے کمرے تک امی کی آواز گونج رہی تھی۔

”بھول گئی تھی امی۔۔۔ کام کر رہی تھی نا۔“

فری نے کچن کا دروازہ بند کرتے ہوئے اونچی آواز میں امی کو جواب دیا۔

”ارے جل کر راکھ کیوں نہیں ہو جاتے یہ فون۔ کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کرنے دیتے۔“

کچن سے باہر کھڑی وہ امی کی ڈانٹ سن رہی تھی۔

”روز تو بند کرتی ہوں امی!

آپ کو تو بس مجھے سنانے کا موقع چاہیے۔“

وہ تڑخ کر بولتی کمرے میں واپس چلی گئی۔

”میں باہر آ کر کاٹتی ہوں تیری زبان، رک جا ایک منٹ!“

امی نے غصے سے کپڑے نچوڑتے ہوئے اسے دھمکی لگائی۔

”ارے تیرے پر ہی گئی ہے اس کی زبان۔ تیری ماں نے تیری کاٹ دی ہوتی تو بہت سو کا بھلا ہو جاتا۔“

چھت سے نیچے آتے ابا ناگوار لہجے میں بولے۔

امی کا غصہ سوا نیزے پر پہنچا۔ کپڑے بالٹی میں پھینکے اور غصے سے ہانپتے ہوئے باہر نکلیں۔

”میں نے کتنی بار منع کیا ہے ذوالفقار، میرے اور فری کے درمیان نہ بولا کر۔ تیری وجہ سے میری ساری تربیت خاک ہو گئی۔“

غصے سے آواز پھٹنے لگی تو امی کی آنکھوں میں نمی اترتی دکھائی دی۔

ابا بڑبڑاتے ہوئے گھر سے باہر نکل گئے۔

فری امی ابا کی آوازیں سنتی پریشانی سے باہر آئی۔ امی صحن کے بیچ کھڑی، دوپٹہ منہ پہ رکھے سسک رہی تھیں۔

فری کے دل میں ٹیس سی اٹھی۔ تڑپ کر امی کی طرف بڑھی۔

”امی! میری پیاری امی“

صفورا پرویز

اس نے پیار سے پچکارتے ہوئے امی کو گلے سے لگایا۔

امی اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔

”امی!“

اب کے فری نے پریشانی سے ان کے ہاتھ چہرے سے ہٹانے کی کوشش کی۔

لیکن امی نے اس کے ہاتھ جھٹک دیے۔

”چھوڑ مجھے۔

تو بھی اپنے باپ جیسی ہے۔

بے حس... بدتمیز

”میں نے سوچا تھا شوہر نہ سہی، اولاد سے تو عزت نصیب ہوگی لیکن نہیں۔ خون تو اسی آدمی کا ہے... جس نے نہ کبھی عزت کی نہ کروائی...“

روتے، بولتے ہچکیاں بڑھتے امی کچن کی کنڈی کھول رہی تھیں۔

فری نم آنکھوں سے انھیں دیکھ رہی تھی۔

امی نے پانی کا گلاس بھرا اور باہر کرسی پہ بیٹھ کر پینے لگیں۔

فری امی کے پاس گئی اور ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھی۔

”امی! میں تو آپ کی عزت کرتی ہوں۔“

امی نے غصے سے اس کے ہاتھ اپنے گھٹنوں سے ہٹاؤ۔

”جانتی ہوں تمھاری عزتیں۔

جب تک تمھارے مزاج کی بات ہو تو امی اچھی--- جب ذرا جو ڈانٹ دو تو کون ماں؟ اور کیسی عزت۔؟“

دکھ سے کہتی وہ پھر سے غسل خانے جانے لگیں تو فری نے ان کا بازو پکڑتے ہوئے انھیں روک دیا۔

”بس کریں امی، باقی کے میں دھو لیتی ہوں۔“

”کوئی ضرورت نہیں، میں کرلوں گی۔“

روٹھے انداز میں کہتی امی بازو چھڑواتے غسل خانے کی جانب بڑھیں۔

فری ان کے پیچھے پیچھے غسل خانے کے دروازے پہ آرکی۔

فری امی کو دو ٹبوں کے درمیان کپڑے نچوڑتے اور دوسرے ٹب میں ڈالتے دیکھا۔ گرمی اور تھکن کے آثار امی کے چہرے پر نمایاں تھے۔

”میرا کام چل جائے گا نا امی، تو آپ کو کوئی کام نہیں کرنا پڑے گا۔ کپڑے بھی دلوا لیں گے، صفائی بھی اور ضرورت پڑی تو برتن بھی۔“

وہ امی کو دیکھتے ہوئے بول رہی تھی۔

کپڑے ٹب میں ڈالنے سے پانی کی بوندیں فری کی طرف چھلکیں تو امی کی نظروں میں اس کے پیر آئے۔

”باہر چل جا فری، پیر خراب ہو جائیں گے تیرے۔“

امی فکرمندی سے بولیں۔

آواز اب بھی بھرائی ہوئی تھی۔

فری کا دل بھاری ہوا۔ آنکھوں میں نمی چمکی۔

”آپ کے بھی تو ہو رہے ہیں۔“

وہ امی کو دیکھتے ہوئے دکھ سے بولی۔

”میری جلد تیری جیسی نازک تھوڑی ہے؟

جو دو بوندوں سے ہی سوج جائے؟ جا، شاباش، باہر جا۔ میرے لیے یہ کافی ہے کہ تو میری فرمانبرداری کرے، میرے آگے زبان نہ چلائے۔ کاموں کا کیا ہے، جب تک زندگی ہے کرتے رہنا ہے۔“

امی سادہ سے انداز میں بول رہی تھیں، پر فری کا دل ہر لفظ کے ساتھ بھاری ہوتا جا رہا تھا۔

رات تک کپڑے چھت پر چلتی ہواؤں کے ساتھ جھول رہے تھے۔

بینگن کے بھرتے کی خوشبو ہوا میں رچ بس گئی تھی۔

”جا فری، ابا سے کہہ روٹیاں لے آئیں، میرے میں روٹیاں پکانے کی ہمت نہیں۔“

امی تھکان زدہ آواز میں بولیں۔

”میں بنا دوں؟“

فری نے پانی کی بوتل بند کرتے ہوئے امی سے پوچھا۔

”نہیں، رہنے دے۔ سارا دن تو کام میں لگی رہتی ہے۔ ایک دن بازار سے آ جائے گی روٹی۔ جا ابا سے کہہ لے کر آئیں۔“

امی نے رائتہ ڈھکتے ہوئے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

فری اثبات میں سر ہلایا اور کچن سے باہر نکلی۔

ابا! کھانا تیار ہے، روٹیاں تو لے آئیں۔“

ٹی وی دیکھتے ابا کے ماتھے پر سلوٹیں پڑیں۔

”کیوں؟ آٹا نہیں ہے کیا؟“

ابا ترخ کر بولے تو فری کے خون میں ابال اٹھا۔

سارا دن امی کا کام کرنا، ان کا تھکان زدہ وجود ذہن کی سکرین پر گھوما، تو غصے میں شدت آئی۔

”آپ اتنے لاپرواہ کیوں ہیں، ابا؟“

ابا نے حیرانی سے اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھا۔

اس نے کبھی ان سے ایسے بات نہیں کی تھی۔

”میں تو بس پوچھ رہا تھا میرے بچے۔“

ابا کا سارا غصہ امی کے لیے تھا، فری کو تو انہوں نے کبھی اُف تک نہیں کہا تھا۔

”امی صبح سے کام کر رہی ہیں، آپ کو خود کہنا چاہیے تھا کہ روٹیاں نہ بنائیں!“

وہ اسی لہجے میں بولی تو ابا اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔

”میری غلطی ہے پتر، میں لے آتا ہوں۔“

وہ اس کا سر تھپتھپاتے باہر نکلے تو امی کو پریشانی سے اپنی طرف دیکھتے پایا۔

فری نے امی کو دیکھا تو دل مزید پسیجا۔

جانے کیسی عورت تھیں اس کی امی!

ابا کے ذرا سے دکھ پر اپنا غم بھول جاتی تھیں، اور ابا کو کبھی اپنے کہے سخت لفظ کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

چاند کی ٹھنڈی روشنی اس کے چہرے پر پڑتے اس کے نقوش واضح کر رہی تھی۔

امی نے کروٹ بدلی تو نظر اس کے چہرے پر پڑی۔ آنکھوں میں ویرانی اور چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔

امی کو دکھ ہوا۔

وہ اٹھ کر بیٹھیں تو فری کی نظر ان پر پڑی۔
"آپ سوئی نہیں؟"
فری امی کو اٹھ کر بیٹھتے دیکھ بولی۔
"تو کیوں نہیں سو رہی؟"
امی نے سوال کے بدلے سوال کیا تو وہ بھی اٹھ بیٹھی۔
"ایسے ہی۔۔۔"
"تہجد کا وقت ہو رہا ہے، آجا نفل پڑھ لے۔"
امی نے چارپائی سے اٹھتے کہا۔ ابا دوسری چارپائی پہ لیٹے خراٹے لے رہے تھے۔
فری نے ایک نظر انہیں دیکھا اور امی کے پیچھے پیچھے نیچے چلی گئی۔
"تم بس اپنے کام پر دھیان دیا کرو فری، ہماری لڑائیوں کو اتنا مت سوچا کرو۔"
دعا سے فارغ ہوتے امی جانماز پر نظریں ٹکائے بولیں۔
"مجھ میں آپ جتنا حوصلہ نہیں ہے، امی۔"
فری جانماز پر بیٹھے، سر جھکائے، نم آواز میں بولی۔
امی نے اس کی نم آواز پر سر موڑ کر اسے دیکھا۔
وہ حساس تھی مگر کبھی روتی نہیں تھی۔
امی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اپنے ساتھ لگایا۔
سکون، طمانیت اور ناقابلِ بیان احساس،
فری کی روح تک اتر گیا۔
"مجھے پیار جتانے کا ڈھنگ نہیں فری،
پر میں تجھے روتا نہیں دیکھ سکتی۔
میں نے تیری خاطر سب برداشت کیا، کیا تو میری خاطر خوش بھی نہیں رہ سکتی؟"
ہموار لہجے میں بولتے آخر میں امی کی آواز نم ہو گئی تھی۔
فری نے امی کی چادر کو زور سے تھام لیا۔
جیسے وہ اس لمحے کو روک لینا چاہتی ہو۔
یوں جیسے اسے اس لمحے کے گزر جانے کا خوف ہو۔
"میری خوشی آپ کے سکون میں ہے، امی!"
فری امی کے گلے لگے نم لہجے میں بولی تو امی نے اس کو خود سے الگ کیا۔
اس کا گیلا چہرہ سامنے آیا۔
امی نے نرمی سے اس کی آنکھیں صاف کیں۔
فری کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اگرچہ امی اتنی اظہار والی نہیں تھیں۔ پر آج لگ رہی تھیں۔
"میرا ہر وہ دن سکون میں گزرتا ہے جب تو مسکراتے ہوئے مجھے اپنی کہانیاں سناتی ہے۔
میری زندگی کی خوشی، سکون تجھ سے ہے فری۔ اپنا خیال رکھا کر۔"
امی فرطِ جذبات سے بولیں۔
فری کو اس وقت اندازہ ہوا کہ محبت کا اظہار کتنا ضروری ہوتا ہے۔
الفاظ کتنے خوبصورت ہوتے ہیں،
ماں کتنی گہری ہوتی ہے،
جذبات کتنے پیارے ہوتے ہیں۔
اس نے زور سے امی کو گلے لگایا۔
ہر سو چاندنی بکھرتی محسوس ہو رہی تھی۔
سکون رگوں سے روح تک پھیل رہا تھا۔

امی فری کی اور فری امی کی خوشبو محسوس
کرتے پرسکون ہو رہی تھی۔
اسی پل امی نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ فری کو روز
گلے لگایا کریں گی، پیار جتایا کریں گی۔
جانے کیوں، اس کے ہوش سنبھالتے ہی
انھوں نے اس سے پیار جتانا چھوڑ ہی دیا تھا۔
زندگی کی ستم ظریفی تھی یا گھر کا گھٹن زدہ ماحول
جس نے انھیں ایک خول میں بند کر دیا تھا۔
پر اب اور نہیں۔
انھوں نے دیکھا تھا کہ فری ان کے محبت
بھرے الفاظ سن کیسے کھل اٹھی تھی۔
امی!''
سورج کی گرمی نے فری کو آنکھ کھولنے پر
مجبور کیا، تو فری نے امی کو آواز لگائی۔
روز آنکھ کھولتے ہی روشنی کے ساتھ اسے امی
کا چہرہ دکھائی دیتا تھا،
پر آج امی نے اسے نہیں اٹھایا تھا۔
''امی!''
فری نے ذرا سا اٹھتے امی کو ہلایا، تو وہ ڈھیلی
پڑتے ایک طرف ہو گئیں۔
امی ساکت تھیں۔
جیسے رات کی ٹھنڈک نے ان کی سانسیں چرا
لی ہوں۔
جسم برف کی طرح ٹھنڈا، پر چہرہ ویسے ہی پرسکون۔
فری کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہوئی۔
آواز حلق میں دبی،
منظر دھندلا گیا،
سماعت جواب دے گئی۔
نہ کچھ سنائی دیا نہ دکھائی دیا۔
امی کو نہیں اُٹھنا تھا۔
امی نہیں اُٹھیں تھیں۔
رات کے پہر برآمدے میں بیٹھی وہ دونوں
ماں بیٹی یہ نہیں جانتی تھیں کہ
ان کی قربت آخری قربت تھی،
وہ اظہار آخری اظہار تھا۔
قلم سے فرمان صدیوں پہلے محفوظ کر دیا گیا تھا،
اب وہ جاری ہو چکا تھا۔
امی کے جانے کے بعد سے بارش نہیں رکی تھی،
اور فری کی زندگی اسی ایک رات میں رک گئی تھی۔
''فری!
پتر، کچن کا دروازہ بند نہیں کیا؟''
کھڑکی سے باہر دیکھتی اپنے خیالوں میں گم
فری ابا کی آواز پر چونکی۔ اس نے سر گھمایا اور
نظریں دروازے پر مرکوز کیں۔
ابا جامن کا تھیلا ہاتھ میں لیے اس کی طرف
دیکھ رہے تھے۔
چہرے پر زندگی کے آثار نظر ہی نہیں آتے تھے۔
ابا کو اسے دیکھ کر تکلیف ہوئی۔
تھیلا کرسی پر رکھتے وہ اس کی طرف بڑھے تو
ابا اور فری کی سماعت میں ایک ساتھ امی کی
آواز گونجی:
''وچھاڑ پر داغ لگ جائے گا، ذوالفقار!''
ابا نے اچانک تھیلا کرسی سے اٹھایا تو فری نم
آنکھوں سے کھلکھلائی۔

وہ ہنستے ہوئے روئی یا روتے ہوئے ہنسی، ابا
اندازہ نہیں لگا سکے۔
اس نے دھندلے ہوتے منظر سے ابا کو
جامن کا تھیلا باہر لے جاتے ہوئے دیکھا۔
ابا کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔
وہ جتاتے نہیں تھے، بتاتے نہیں تھے۔
پر فری محسوس کرتی تھی۔
امی کی وفات نے ان پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔
سارا ناز نخرہ بیوی کے ساتھ دفن ہو گیا تھا۔
بارش کی اداس دھن اب تک بج رہی تھی۔
فری نے موبائل کی چمکتی سکرین کو دیکھا،
اسے کوئی میسج موصول ہوا تھا۔
امی کی انجانے میں لی گئی ہنستی ہوئی تصویر
نظروں میں آئی تو دل کا بوجھ کچھ کم ہوا۔
''ماں سب سکھا دیتی ہے۔''
اس نے کھڑکی سے باہر ٹپکتی بارش کو دیکھتے
ہوئے کہا۔
گلے میں آنسوؤں کا گولا اٹکا۔
''بس اپنے بغیر جینا نہیں سکھاتی---''
اب کے اس نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی،
تو آنسو قطار سے لڑیوں کی صورت بہتے
ہوئے نظر آئے۔
''امی نے کہا تھا وہ مجھے روتے ہوئے نہیں
دیکھ سکتی---
لیکن وہ---''
اس نے ہچکی لی۔
''وہ مجھے ہنستا دیکھنے کے لیے رکی ہی نہیں،
کاش میں ان کے ساتھ کچھ اور وقت گزار
سکتی---
کاش میں ان سے کبھی تلخ کلامی نہ کرتی---
کاش میں خود ان کے گلے لگنے میں پہل کر
لیتی---''
پچھتاوا بہت جان لیوا ہوتا ہے، یا رب---
یہ صرف لمحے نہیں کھاتا، انسان بھی کھا جاتا ہے۔
ماؤں کو نہیں مرنا چاہیے---
ماؤں کے بغیر زندگی، زندگی نہیں لگتی---
سکون، سکون نہیں لگتا---
کامیابی، کامیابی نہیں لگتی---
ہر رنگ بے رنگ، ہر خوشی غمزدہ۔
وہ بھرائی آواز میں ایک نقطے پر نظریں
جمائے بولے جا رہی تھی۔
بارش کی بوندیں، آسمان کے بادل، اس کے
نزدیک موجود ہر شے
اس کے دکھ میں شریک لگتی تھی۔
ہر شے سن رہی تھی۔
ہر بات کا اختتام اب بس یہی تھا:
ماں ہوتی تو یہ کہتی---
ماں ہوتی تو یہ ہوتا---
پر مسئلہ یہی تھا: ماں نہیں تھی---
لیکن ماں ہر جگہ تھی---
ہر سانس میں،
ہر یاد میں،
ہر دعا میں۔

☆☆☆☆☆

کاغذات

وہ تو مغرب کی اذان کے ساتھ ہی رخصت لے کر چلا گیا کہ باجماعت نماز قضا نہ ہو جائے مگر میں ابھی تک گھمبیر سوچوں میں گم ہوں۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ ہماری یہ ملاقات یوں اختتام پذیر ہوگی۔ ان کا متانت بھرا پُرنور چہرہ، بے بسی اور لاچاری میں ڈھل جائے گا ان کی آنکھوں میں یوں گھٹا اُمڈ آئے گی اور وہ معصوم بچوں یا کسی بے سہارا بیوہ کی طرح منت سماجت پر اُتر آئے گا۔ اب بھی ان کا چہرہ شکست درماندگی اور بے بسی کی تصویر بن کر بار بار میرے ذہن میں ابھرتا ہے اور ان کا بار بار میرے ٹھوڑی کو ہاتھ لگانا اور منت سماجت کرنا۔

صاحب! تم بڑے آدمی ہو۔ بڑے بڑے لوگوں تک آپ کی رسائی ہے۔ لوگ تمہاری بات توجہ سے سنتے ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ تمہارا کہا نہیں ٹالیں گے۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔ میرے کاغذات ٹھیک کردو، میں کیا میرے گھر والے، میرے بال بچے تمھیں تاحیات دعائیں دیں گے۔ میں بہت غریب مجبور اور بے بس ہوں...... ان کی ان کی بے چارگی، بے بسی آنسو بن کر ان کی آنکھوں میں موتیوں کی طرح جھلملانے لگے مگر ان کو کیا معلوم کہ میں تو خود ان کی طرح ایک غریب مجبور، قلم کا مزدور تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ چھولوں کا ٹھیلہ لگا کر روزی کماتا تھا اور میں قلم گھسیٹتا تھا۔ کبھی ایک اخبار کے دفتر میں اور کبھی دوسرے اخبار کے دفتر۔ ایک متوسط درجے سے کم صحافی جو اپنی حیثیت واوقات سے بخوبی آگاہ ہے۔ مجھے تو ابھی یہ سوچ کر ہول آنے لگتا ہے یہ تو شکر ہے کہ اذان ہوئی اور وہ خود رخصت لے کر چلا گیا ورنہ میں اُسے کیسے اور کیونکر رخصت کرتا مگر خدا نے میری لاج رکھی اور بھرم قائم رہا۔

میں نیا نیا جب اس اخبار میں آیا تھا تو میرا خیال تھا کہ یہ کوئی افغان مہاجر ہے کیونکہ ان کے سر پر بھاری پگڑی تھی۔ ڈھیلا ڈھالا لباس، سوکھا لٹکتا ہوا قد، عمر کوئی پچاس پچپن برس سفید سرخ رنگت چہرے پر پژمردگی کی دبیز تہہ چھائی ہوئی۔ کسی سمندر کی طرح خاموش، جس کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ خاموش طوفان کے گزرنے کے بعد کی ہے یا طوفان اُمنڈنے سے قبل کا سکون ہے۔ فارغ اوقات وہ عموماً اپنے

شیریں زادہ خدوخیل

جیکٹ کے جیبوں میں ہاتھ ڈالے نظر آتا تھا یا اپنی چھوٹی خشخشی ڈاڑھی اور مونچھوں کو ایک ہاتھ سے سہلاتا جس کے بیشتر بال سفید ہو چکے تھے۔ مگر دفتر کے چپڑاسی نے بتایا کہ وزیرستان کا مقامی مہاجر ہے اور نقل مکانی کرکے آج کل میرے پڑوس میں مقیم ہے۔

لوگ اسے وزیرستانی چاچا کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ بہت اچھا آدمی ہے میری سفارش پر ایڈیٹر صاحب نے اسے دفتر کے سامنے ٹھیلہ لگانے کی اجازت دی ہے۔

چونکہ ہمارا اخبار ایک علاقائی اخبار ہے، جس کی اشاعت، آمدن اور عملہ محدود ہے اور پورا دفتر تین چار کمروں پر مشتمل ہے اور کینٹین کا متحمل نہیں اس لیے یہ ٹھیلہ ایک طرح ہمارے لیے عارضی کینٹین کا کام دینے لگا۔ ان کے گاہک زیادہ تر راہ چلتے عام لوگ ہیں۔ جو اس سے چھولے لیا کرتے ہیں چونکہ وہ صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ اس لیے ہمارے دفتری عملے کے علاوہ آس پاس کے پلازوں کے دکاندار بھی ان کے مستقل گاہک ہیں۔ میں بھی کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ان سے چھولے منگوایا کرتا ہوں جب بھی ایڈیٹر صاحب یا دفتری عملہ اپنے لیے یا اپنے کسی مہمان کی خاطر تواضع کے لیے چھولے منگواتے ہیں تو پلیٹ نہ صرف بڑے اور پُر ہوتے ہیں بلکہ ان پر نمک، مرچ، مصالحہ جات، چٹنی اور لیموں کے تراشوں کا اہتمام کرتے ہیں اور پلیٹ ٹرے میں سجا کر بھیجتا یا خود سیڑھیاں چڑھ کر لاتا اور رفتہ رفتہ اس میل جول سے ایک طرح کا تعلق بنا اور اب ہم اسے دفتر کا ایک ساتھی تصور کرنے لگے ہیں اخباری دفتر کے سایہ عاطفت ہونے کی وجہ سے بلدیہ، پولیس اور دیگر لفنگے بھی ان سے زیادہ چھیڑ چھاڑ سے گریز کرتے ہیں۔

یہ کل کی بات ہے جب میں دفتر آیا تو میرے میز پر اخروٹوں کا ایک شاپر کسی نے رکھا تھا۔ اس میں تھوڑا بہت ونداسہ بھی تھا۔ میرا خیال تھا کہ کسی نئے لکھنے والے یا اخباری بیان بازی کے کسی شوقین کا تحفہ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارا ابھی بڑے ہوٹلوں کے ملازمین کی طرح کم تنخواہوں اور اس قسم کے ٹپس پر زیادہ گزر بسر ہوتی ہے۔ میں نے چپڑاسی سے اس کی بابت پوچھا تو انھوں نے کہا۔

یہ وزیرستانی چاچا کا تحفہ ہے۔ کل پرسوں گاؤں سے کوئی ان کے لیے بوری بھر لایا ہے۔ سب کے لیے انھوں نے کلو کلو کے شاپر دیے ہیں۔ مجھے بھی شاپر دیا ہے۔ ہاں! ایڈیٹر صاحب کا شاپر کچھ زیادہ تھا۔

اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ چلو کسی وقت ان کا شکریہ ادا کر لیں گے کہ انھوں نے ہمیں یاد رکھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ

طرح لگا کہ کیوں نہ اس کا انٹرویو جنوبی اضلاع کی بگڑتی ہوئی صورتحال پر سنڈے ایڈیشن کے لیے لیا جائے اور سیاست عسکریت سے قطع نظر ان مسائل پر بات کی جائے جو عام آدمی کو درپیش ہیں، جس کی وجہ سے وہ مصائب اور صعوبتوں کا بُری طرح شکار ہیں اور وطن چھوڑنے پر مجبور ہے۔ میں نے ایڈیٹر سے بات کی تو انھوں نے بھی میرے آئیڈیا کو سراہا۔ تاہم انھوں نے محتاط لفظوں، نرم اور ملائم لہجہ اپنانے کی تاکید کی بلکہ کہا کہ اشاعت سے قبل ان کی نظروں سے گزارا جائے تو بہتر ہوگا۔ کیونکہ ایڈیٹر اشہارات کی بندش کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ مجھے خود بھی بخوبی اندازہ تھا کہ ہمارے روزنامہ کی مالی حیثیت اس قدر مضبوط نہیں کہ اس قسم کی چھیڑ خانی کا متحمل ہو سکے۔ ہمیں تنخواہیں بھی مشکل سے بروقت ملا کرتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر بھی ان سفارشات کو نظر انداز کرنے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا تھا جو ایک طرح واضح احکامات ہیں جن کا ہر ہفتے نزول ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ میرے لیے دوسرے اخبارات کے دروازے بھی خمیازے کے طور پر بند ہو سکتے ہیں۔ ایڈیٹر سے منظوری کے بعد میں نے چپڑاسی کے ذریعے ان کو پیغام بھیجا کہ کل چھولے ختم ہونے کے بعد سیدھا گھر نہ جائے بلکہ کچھ دیر کے لیے دفتر آ کر مجھ سے ملے تو بہتر ہوگا۔

اس وقت وہ میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ شام قریب تھی۔ وہ بہت تھکا ماندہ نظر آ رہا تھا اگرچہ گرمی تھی مگر اس کے باوجود اس نے جیکٹ پہنا ہوا تھا جس کی جیبوں میں کچھ نہ کچھ ٹھونسا ہوا تھا جبکہ سر پہ بھاری پگڑی تھی۔ اس گرمی میں اس کی جیکٹ اور دستار دیکھ کر مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہونے لگا مگر وہ اپنے اس لباس میں شاید کوئی گھٹن محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اُس نے دونوں ہاتھ اپنے رانوں پر رکھے تھے اور بار بار اسے دبا رہا تھا جو غالباً دن بھر کھڑے ہونے کی وجہ سے دکھ رہے تھے۔ میں نے رسمی بات چیت کے بعد اس سے پوچھا؟

چاچا! وطن تو ماں ہوتی ہے تو اپنی ماں کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلا آیا۔ میرے اس سوال پر وہ بھونچکا ہو کر مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔

صاحب! ہم ہندوؤں کی طرح وطن کو ماں نہیں سمجھتے۔ اگر وطن کو ماں سمجھو گے تو اس کے لیے باپ بھی ڈھونڈنا پڑے گا۔ ویسے ہم وطن کو جان سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ وطن ہماری عزت ہے۔ ناموس ہے، وقار ہے، پہچان ہے۔ ہم پختون لوگ چھوٹی چھوٹی قطعہ اراضی پر اپنے سگے بھائیوں اور عزیزوں کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے، پھر وطن تو بہت بڑی چیز ہے۔ وطن پہ جان قربان مگر معاف کیجیے ہم اسے ماں نہیں سمجھتے اور نہ کہتے ہیں۔

اس کا یہ جواب سن کر مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ یہ سیدھا سادہ پٹھان کتنی بڑی بات کس آسانی سے کہہ گیا جبکہ ہم وہی نصابی رٹے رٹائے جملے ہر جگہ دہراتے ہیں۔ شاید اس میں زیادہ اثر ہندی میڈیا اور کلچر کا بھی ہے جو مادر وطن اور دھرتی ماتا کا راگ عموماً الاپتے ہیں۔ میں نے ان کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا ایک ہی بات ہے۔ آپ نے نقل مکانی کیوں کی۔ یہ بتائیں میرا مقصد یہ جاننا ہے آپ مجھے تفصیل سے بتا دیں۔ میں آپ کا انٹرویو آئندہ سنڈے ایڈیشن میں خوب مرچ، مصالحہ لگا کر شائع کروں گا۔ آپ کی بڑی شہرت ہو جائے گی۔ آپ کی آواز مقتدرہ حلقوں تک پہنچ جائے گی۔ شاید آپ کی مدد بھی کی جائے...... میری بات پر وہ بوکھلا گیا۔

جی...... آپ نے مجھے اس لیے بلوایا ہے! جناب خدا کے لیے ایسا نہ کریں مجھے اس لپڑے میں نہ ڈالیں۔ آپ کیوں میرے کاغذات خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں جو کہ پہلے سے خراب ہیں۔

کاغذات...... کونسے کاغذات۔ میں نے استفہامیہ طلب نظروں سے انھیں دیکھا۔ مجھے جواب دینے کے بجائے اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی شاید اُسے مغرب کی نماز قضا ہونے کا خدشہ تھا چونکہ مغرب میں وقت تھا اس لیے اُس نے اطمینان کی سانس لی اور کہنے لگا۔

بس صاحب! ہمارا کیا پوچھتے ہو۔ ہماری بھی عجب زندگی ہے۔ چکی کے دو پاٹوں کے درمیان...... یا...... ایک طرف شیر اور دوسری طرف کھائی...... ہر وقت جان اور آن پر بنی ہی ہے۔

آپ کاغذات کی بات کر رہے تھے۔ میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

آ رہا ہوں اسی بات کی طرف آ رہا ہوں۔ آپ کو تو معلوم ہوگا کہ ہمارا گاؤں بارڈر پر ہے۔ میرا شمار گاؤں کے سفید پوشوں میں ہوا کرتا تھا۔ بس ایک دن رات گئے چند آدمیوں نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا یوں سمجھو بدنصیبی نے دستک دی۔ میں باہر نکلا تو تین چار اسلحہ بردار تھے جو کہ ہمارے ہاں عموماً عام ہوتے ہیں۔ انھوں نے کہا ہم مہمان ہیں۔ روٹی چائے پانی کا بندوبست اگر کر سکو تو مہربانی ہوگی۔ میں ٹھہرا پختون اپنی روایات کا پابند، مہمان کو خدا کی رحمت سمجھنے والا خیر جوان کا نصیبہ تھا ان کو ملا وہ رخصت ہوئے پھر دوسری صبح یہ رحمت ہمارے لیے زحمت کا سبب بنا۔

وہ کیسے؟ میں نے پوچھا

بس! ایسے کہ صبح ہماری کیمپ میں طلبی ہوئی۔ صاحبان کے سامنے پیشی ہوئی۔ الزام لگا کر خوارج کے ہمدردوں میں سے ہو۔ لاکھ قسمیں

اُٹھائیں۔ بڑی سفارشیں کی۔ وہ میری زندگی کے بدترین دنوں میں سے ایک دن تھا۔ خیر دوسرے دن اس شرط پر جان چھوٹی کہ اگر یہ ”رحمت“ پھر آئے تو انھیں گرفتار کرنا ہوگا یا فوری طور پر اطلاع دینی ہوگی۔ ورنہ آپ کے کاغذات خراب...... خیر ایک ہفتہ تو خیریت سے گزرا دوسرے ہفتہ میں پھر رات دو مہمان آئے۔ ہمیں تو پہلے ہی کھٹکا لگا ہوا تھا۔ چائے پانی کے بعد اچانک موقع پا کر ہم نے ان کو غیر مسلح کیا۔ وہ بہت چیخے، چلائے انھوں نے دھمکیاں دیں مگر ہم نے ایک نہ سنی انھیں اپنے حجرے میں بند کیا اور کہا کہ صبح بات کریں گے۔ اگر بھاگنے کی کوشش کی تو اپنی جان کی ذمہ داری تم پر خود عائد ہوگی۔ خیر بات سمیٹ لیتا ہوں۔ اسی وقت بیٹے کو کیمپ دوڑایا...... بدنصیبی کسی سے پوچھ کر نہیں آتی۔ انھوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ بس صاحب قسمت ہی پھوٹی تھی۔ صبح کیمپ والے آئے تو لینے کے دینے پڑ گئے۔

کیا مطلب! میں نے جلدی سے پوچھا۔

مطلب یہ کہ وہ کیمپ والوں کے بندے نکلے۔ کاغذ اکمل طور پر خراب......

اچھا پھر کیا ہوا؟

ہوں! کیا ہوا! بھلا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ وطن جسے تم ”ماں“ کہتے ہو، پھر ہمارے لیے سوتیلی ہو گئی یا ہم ان کے سوتیلے ہو گئے...... بس نقل مکانی میں عافیت تھی۔ کیونکہ اب ہمارے کاغذات پورے طور پر خراب ہو چکے تھے۔ انھوں نے تاسف بھرے انداز میں سر سے اپنی دستار اتاری، جس سے مجھے ایک گونہ راحت ہوئی۔ انھوں نے اپنے سر کے بالوں میں جو زیادہ تر سفید ہو چکے تھے۔ ہاتھ پھیرا اور پھر مجھ سے ملتجیانہ کہنے لگا۔

صاحب! آپ کی رسائی تو بڑے بڑے لوگوں تک ہے۔ میرے لیے کوشش کریں کہ میرے کاغذات صاف ہو جائیں...... میں ایک غریب دیہاتی گاؤں کی آزاد فضاؤں کا پلا، اب شہر کے پنجرے میں پڑا ہوا ہوں۔ میرے لیے کچھ کریں تاکہ مجھے پھر اپنی آزاد فضاؤں میں سانس لینے کا موقع ملے...... ورنہ اس شہر کے پنجرے میں پڑا پڑا مر جاؤں گا۔

دوسرے دن یہ کہانی میں نے ایڈیٹر صاحب کو پیش کی کہانی پڑھنے کے بعد وہ کچھ دیر سوچتے رہے پھر انھوں نے اس پر ایک نوٹ لکھا: ”کہانی بہت اچھی ہے۔ اسے کسی خاص ایڈیشن یا موقع پر شائع کیا جائے گا۔“ اب یہ اہم موقع کب آئے گا اور یہ خاص ایڈیشن کب شائع ہوگا۔ اس کے بارے میں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

☆☆☆☆☆

عالمی لافقا ایوارڈز فرام چین دے پنڈوں

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک نامعلوم قسم کے گاؤں میں چند ووڈ قسم کے مشتبہ افراد نے یہ فیصلہ کیا کہ اس دنیا میں ابھی تک جن لوگوں نے کسی بھی شعبے میں عزت دار طریقے سے اعلیٰ قسم کی بدمعاشی کر رکھی ہو۔ ان کو کوئی ایوارڈ یا اعزاز دیا جائے۔ تاکہ ان کے گاؤں کا نام بھی چند فسانوں کی بلیک لسٹ میں آ سکے۔

رفتہ رفتہ یہ بات دوسرے علاقوں میں بھی پہنچ گئی اور لوگوں نے اس ایوارڈ میں شامل ہونے کے لیے اپنے اپنے نام اور کوائف جمع کروانے شروع کر دیئے۔ منتظمین نے سوشل میڈیا پر موسٹ وانٹڈ کے زمرے میں ان کی تصاویر بھی شائع کر دیں۔ ساتھ یہ بھی لکھ دیا کہ ''وقت کم ہے اور مقابلہ سخت'' تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آئے۔

اس ایوارڈ کی اجتماعی حرامزدگی کی وجہ سے حاملہ لوگوں کے نام کچھ یوں ہیں:

شف شف سرکار کیٹگری ''پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا''

نیم حکیم حافظ دم: کیٹگری ''نوبیل آپ کے قدموں میں''

فلمسٹار بھیڑا: کیٹگری ''موئے ہو تم کہاں''

ڈرونلڈ پمپ: فلم ''سیز فائر'' کیٹگری وچولا

شیطن یاہو: کیٹگری ''انا مارے انی نوں تھسن وجے تھمی نوں''

شمالی کوریا ''مجھے کام بتاؤ میں کیا کروں میں کس کو کھاؤں:۔ کیٹگری زہریات''

نکاہت فتح علی خان۔ ''پنج تر پچی واجیاں تاں کیٹگری: بدو بدی''

رافیل: کیٹگری ''آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر''

رانو پھنڈے باز: ہنٹر میں یان لگی آں پھنڈا: کیٹگری: شاباش ہنٹر جلدی لبھو میرا ابا

دادا کی پوتی: زبروتی خدمت: کیٹگری: واں واں واں

میجر گوروں کی عالیہ: جھوٹ کا بازار گرم سا کرنا کیٹگری: بڑبولی ان میرڈ ہمشیر

صورتحال یہ تھی کہ ہر کوئی خود کو اس دیت نام قسم کے ایوارڈ فرام چین دے پنڈوں میں اول انعام کا پورا حقدار سمجھتا تھا۔ کوائف کے ساتھ ہی شریک کار معززین نے ایک رقعہ بھی بھیجا جس پر جلی اور سنہرے حروف میں درج تھا کہ ''اول انعام مجھے ہی ملنا چاہیے ورنہ---- سنگین نتائج بھگتنے ہوں گے۔ علاوہ ازیں شروعات آپ نے کی لیکن اختتام ہم کریں گے''۔

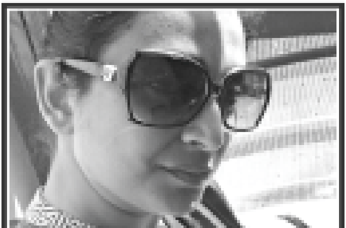

سیدہ آمنہ ریاض

جس کو پڑھتے ہی خوف سے منتظمین کا پاؤ بھاری ہو گیا۔ خیر اب مرتے کیا نہ کرتے پنگا جو لے بیٹھے تھے کے مطابق پروگرام کا سلسلہ جاری رکھا۔

جب تمام کیٹگریز مکمل ہو گئیں تو گاوں کی وڈ برادری نے منصفین میں ذلیل اعلیٰ قسم کے لوگوں کو مدعو کرنے کا فیصلہ کیا۔ بہت سال سر کھپانے کے بعد بھی کوئی بھوکاٹ قسم کا شخص نہ ملا جو حد درجہ کمینگی پر پورا اترتا ہو۔

خیر ''کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے'' کے مصداق مشہور زمانہ فلم'' ہاں میں ہی پاگل ہوں'' کے مصنف '' ایویں ای پھنے خان'' سے رابطہ کیا گیا جنہوں نے فوری طور پر اپنی منکوحہ و غیر منکوحہ جائیداد بنانے کی خاطر سولہ کروڑ پانچ سو روپے کا مطالبہ کر ڈالا۔

جس پر نامعلوم گاوں کی وڈ برادری نے روتے ہوئے کہا ''کوئی پیار محبت''

وڈ برادری کا یہ کہنا تھا کہ مشہور زمانہ فلم ڈائریکٹر پانچ سو روپے پر ہی مان گیا۔

منتظمین کی جانب سے اس بات کو یقینی بنایا گیا کہ اول انعام کے حقدار کو گدھے پر بٹھا کروا کر گن سیلیوٹ بھی پیش کیا جائے گا۔

وقت مقررہ پر پنڈال کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔

اس پاک محفل میں پوری دنیا سے مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے بڑی تعداد میں شرکت کی۔ پروگرام کی شان بڑھانے کے لیے افریقہ کے سڑے ہوئے جنگلات سے ''فیر کہندے ہو تا گالاں کڈھدے'' اور ''عقل دریا گل وہ گئی اے'' کو بطور مہمان خصوصی مدعو کیا گیا۔ علاوہ ازیں پروگرام کو چار چاند لگانے کے لیے ''مولوی وڈ کھانے'' کو بھی محفل کی زینت بنایا گیا۔

جبکہ پروگرام میں ٹھشکا لگانے کے لیے ایٹم نمبر گانے ''آج کی رات نزع'' اور چسکا لگانے کے لیے پچھاپھڑی کو بھی شامل کیا گیا۔

پروگرام کی شروعات مشہور زمانہ سنگر ''لیڈی خدا کے لیے نہ گا'' کے کلام ''میں پچھاں خراٹے مار کے اج تیرے نال فنکشن تے'' سے ہوئی۔

ابھی تک کسی قسم کی بدنظمی دیکھنے میں نہ آئی۔

لیکن معاملہ تب خراب ہونا شروع ہوا جب سٹیج پر یکے بعد دیگرے مختلف کیٹگریز کا اعلان کیا گیا اور ان کی پوزیشنز بتائی گئیں۔

پہلا ہنگامہ تب برپا ہوا جب تیسری پوزیشن کا اعلان کیا گیا جس کو سن کر بہت سے لوگ شادیانے بجانے لگے جبکہ بہت سے لوگوں پر ونڈل پڑنے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ پروگرام کے اسی درجے میں شرکین میں ایک دوسرے کی وراچھیں پھاڑنے کے مناظر بھی دیکھے گئے۔

دوسری پوزیشن کے اعلان سے پہلے ہی ایک ایسی لڑائی شروع ہو گئی جسے چوتھی کہا جاتا ہے اس لڑائی کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں بچی مار کے بھی بتایا جاتا ہے۔

اس سے پہلے کہ یہ لاکفا ایوارڈز فرام چین وے پنڈوں تیسری عالمی جنگ میں تبدیل ہو جاتا بہت سے پردھان منتری ممالک کی بیک وقت مداخلت سے اس تقریب کو فی الوقت ملتوی کر دیا گیا اور آئندہ توبۃ النصوح کی گئی کہ ایسا خطرناک ایٹمی میزائل مارکہ پروگرام اب کبھی نہیں ہوگا۔

☆☆☆☆☆

پاپولر فگر

میں۔ اس وقت ایک ٹی وی چینل پر سینئر پروڈیوسر تھی جب ایک روز میرے آفس میں ایک لڑکی پورے آداب کے ساتھ اجازت لے کر داخل ہوئی۔ دراز قد، نمکین رنگت اور قدرے شرمیلی ---- میں نے اسے کرسی پر بیٹھنے کا کہا۔ اور آنے کا مقصد پوچھا تو وہ بولی

میم، مجھے نیوز کاسٹنگ کا بہت شوق ہے۔ میں نے گریجویشن کی ہے اور مختلف زبانیں جانتی ہوں۔

اس نے قدرے شرماتے ہوئے بتایا

آپ کے شوق کا سن کر خوشی ہوئی لیکن نیوز کاسٹنگ کے لیے دیگر کوالیفیکیشنز ان خوبیوں سے زیادہ ضروری ہیں۔

اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا

خبریں پڑھنے اور حالات حاضرہ کے پروگرام کرنے کے لیے خود اعتمادی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان پر گرفت، تلفظ اور قومی و بین الاقوامی سطح کی معلومات بھی بہت اہم ہوتی ہیں،

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ آنکھوں میں ایک عجیب سی معصومیت اور مایوسی در آئی۔

ایک لمحے کے لیے مجھے اس کی کیفیت پر پیار آ گیا۔

اور مزید ہمدردی اس وقت ہو گئی جب اس نے پرنم آنکھوں کے ساتھ بتایا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے ماں باپ ضعیف اور بیمار ہیں-- گھر کی چکی میں صرف باپ کی پینشن پستی ہے--- اور لڑکی خود اپنی گلی کے ایک سکول میں ٹیچر ہے۔

فرخندہ شمیم

میں نے اس پر واضح کیا کہ ٹی وی سکرین سے شوق تو پورا ہو سکتا ہے ، پیٹ نہیں بھر سکتا۔

اس کی آنکھوں میں معلومات اُمڈ آئی گویا وہ تمام حقائق کے گوشوارے اپنے بیگ میں رکھتی ہو۔

میں نے اسے چانس دینے کا ارادہ کر لیا۔ نیوز کاسٹنگ کے تھوڑے بہت جراثیم اس میں تھے، میں نے ان کو اجالنے کا ذمہ لے لیا۔۔ میں اس سے روزانہ دو تین بار بلیٹن سکرپٹ مشق، لب و لہجہ سنوارتی ، تلفظ درست کرواتی، سکرین ٹیسٹ کرتی اور زندگی کا اعتماد سکھاتی، نیوز کاسٹنگ کی باڈی لینگویج سے آشنا کرتی۔

وہ بھی کام کی شوقین تھی۔۔۔ لگاتار محنت سے نہیں گھبراتی تھی - - - ایک دن اس کی ایک ساتھی ٹیچر بھی مجھ سے ملنے آئی اور بے ساختہ کہنے لگی۔

میم، آپ جیسے ٹیلنٹ ہنٹ اگر سب ہی پروفیشنل ہو جائیں تو وطن کا ہر شعبہ بنا سفارش ہنر سے بھر جائے۔

میں مسکرا دی تھی

وہ لڑکی ٹریننگ کرتے کرتے خوب منجھ گئی اور قومی نشریاتی ہک اپ پر خبر نامہ پڑھنے پہلی بار نمودار ہوئی تو پورے دفتر نے میری محنت اور بہترین تربیت کی تعریف کی۔ لڑکی پھولے نہیں سما رہی تھی، شدت ممنونیت کے ساتھ اس نے جھک کر میرے قدم چوم لیے تھے۔

آہستہ آہستہ اس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ اس کے مداح اس سے آٹو گراف لینے لگے۔۔۔ میں دیکھ رہی تھی سوشل میڈیا پر اس کی دھوم ہو رہی ہے اور اس کے فالوورز دن بدن بڑھ رہے ہیں۔۔۔ ایک گمنام اور خام دھات کو چمکتا دیکھ کر مجھے خود پر بھی فخر ہوتا کہ میری رات۔ دن کی مشقت بے کار نہیں گئی۔

پھر ایک ایسا روز بھی آیا اسے نیوز کاسٹنگ کے شعبے میں بہترین نیوز کاسٹر کے لیے نامزد کیا گیا۔ ایک اعلیٰ سطحی ایوارڈ لینے کے بعد اخباری نمائندوں کو انٹرویو دیتے ہوئے اس نے کہا:

”میں ایک جنگل کا خود رو پودا تھی جو اپنی محنت سے تناور درخت بن گئی - - - مجھے پروان چڑھانے میں کسی کا حصہ نہیں ہے

☆☆☆☆☆

بے معنویت کا دائرہ [مائیکرو فکشن]

ایک دن ایک شخص نے صبح جاگتے ہی خود کو ایک ایسے دائرے کے وسط میں پایا جو نہ ختم ہوتا تھا اور نہ شروع۔ دائرہ سفید تھا، بے حد سفید، جیسے کسی نے کائنات سے ہر رنگ چوس لیا ہو۔

''یہ کہاں ہوں میں؟'' اس نے خود سے پوچھا، مگر جواب دینے والا کوئی نہیں تھا۔

اس نے قدم بڑھایا۔ دائرہ نرم تھا، جیسے روئی پر چل رہا ہو مگر جیسے ہی وہ آگے بڑھا، اُسے لگا کہ وہ وہیں کھڑا ہے۔

''شاید میں غلط سمت میں جا رہا ہوں۔'' اس نے سوچا اور مڑ کر چلنے لگا مگر نتیجہ وہی تھا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟'' وہ بولا، مگر الفاظ ہوا میں تحلیل ہو گئے جیسے کبھی کہے ہی نہ گئے ہوں۔

تھک کر وہ بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی جیب ٹٹولی، شاید کوئی چیز مل جائے۔ مگر وہاں صرف ایک چھوٹا سا کاغذ تھا جس پر لکھا تھا:

''تم یہاں کیوں ہو؟''

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں!'' وہ چلا اٹھا۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔

اس نے کاغذ کو دوبارہ دیکھا اور تحریر بدل چکی تھی:

''یہ سوال خود سے کرو۔''

اس کا ذہن الجھ گیا۔ ''یہ کیسا مذاق ہے؟ میں کون ہوں؟ یہ جگہ کیا ہے؟''

کاغذ پر ایک نئی عبارت نمودار ہوئی:

''یہ جگہ تمہاری حقیقت ہے۔ تم یہاں صرف اس لیے ہو کیونکہ تم نے کسی اور جگہ کے بارے میں نہیں سوچا۔''

''یہ بے معنی ہے!'' وہ غصے سے چلا اٹھا۔

کاغذ نے جواب دیا:

''ہاں، اور تم بھی۔''

وہ شخص کاغذ کو پھینک کر بھاگنے لگا مگر ہر بار وہی دائرہ وہی بے رنگ خالی پن۔ وقت گزرنے کے ساتھ وہ خود بھی سفید ہونے لگا۔ پہلے اس کے کپڑے پھر اس کی جلد اور پھر اس کے خیالات۔

آخر میں وہ خود دائرے کا حصہ بن گیا اور کوئی دوسرا جاگا، ایک اور سفید دائرے کے وسط میں۔

اور بے معنویت کا کھیل پھر سے شروع ہوا۔

☆☆☆☆☆

عمار نعیمی

وقت کا ضیاع [افسانچہ]

سیّد عبداللہ نصر

آج وہ بیالیس سال سروس کرنے کے بعد باس کی انا کے بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ کمپنی کے ان اولین ملازمین میں سے آخری ملازم تھے جن کی محنت اور لگن کے باعث یہ کمپنی آج نہ صرف ملکی بل کہ بین الاقوامی فوڈ پروڈکشن کی کمپنیوں میں صف اول کی کمپنی شمار ہوتی تھی۔

ایک چھوٹی سی کوتاہی کے باعث انھیں پورے سٹاف کے سامنے بے عزت کرنے کے بعد نکل جانے کا کہا گیا۔ اس وقت ان کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ جب وہ اپنے دفتر نما چیمبر سے اپنا سامان سمیٹ کر نکل رہے تھے تو میں ان کے پیچھے گیا۔ دفتر کی عمارت سے باہر نکل کر میں نے انھیں جا لیا اور پوچھا ”سر! یہ کیا تھا؟؟؟“

”جو بھی تھا بہت ضروری اور بہت اچھا تھا۔“

انھوں نے گمبھیرتا سے ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ میں خاموش نگاہوں سے بہت دیر تک انھیں تکتا رہا یہاں تک کہ میرا تکنا گھورنے میں بدل گیا اور میری نگاہوں میں 12 برس پہلے کا وہ منظر گھوم گیا جب میں نیا نیا اس کمپنی میں آیا تھا اور ٹارگٹس پورے نہ کر پانے کے باعث ان سے کھچائی ہوا کرتی اور وہ ہمیشہ کہا کرتے۔

”جو تم کر رہے ہو وہ وقت کا ضیاع ہے۔ خود کو بہتر کرو اور اپنی عزت بناؤ۔ اگر ایسے ہی یہاں سے نکالے گئے تو کہیں بھی کامیاب نہ ہو پاؤ گے اور اگر اس کمپنی سے کچھ نہ سیکھ پائے تو مارکیٹ کا اعتبار کھو دو گے۔ اب تمھاری مرضی ہے چاہے تو خود کو وقت کا بنا لو یا پھر خود اور وقت دونوں کو ضائع کر دو۔“

آج میں ان کے بارے یہی سوچ رہا تھا کہ انھوں نے وقت ضائع کیا یا خود کو؟؟؟

☆☆☆☆☆

''منافق لوگ'' [افسانچہ]

چوہدری ظہیر عباس کا نام سن کر لوگ نظریں جھکا لیتے تھے۔ ایک ایسا نام جو دلوں میں خوف اور زبانوں پر خاموشی طاری کر دیتا۔ بڑے عہدے پر فائز اس شخص کے دفتر کی دیواریں بھی شاید اس کی تلخ گوئی اور بدعنوانیوں کے قصے سن سن کر بے رنگ ہو چکی تھیں۔ وہ سرکاری کرسی پر ایسے جم کر بیٹھا تھا جیسے اقتدار اس کا موروثی حق ہو۔ اس کے لہجے میں سختی، آنکھوں میں تمسخر اور زبان پر وہ زہر تھا جو چاپلوسیوں کی کوکھ میں پلنے والوں کو میٹھا لگتا تھا۔

لوگوں کا حال کچھ یوں تھا کہ چوہدری کے نام سے بھی پرہیز کرتے۔ اس کی موجودگی میں اس کے ساتھ بات کرنا تو درکنار اس کی طرف دیکھنا بھی جرات کا تقاضا کرتا تھا۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود میں، ایک عام سا سرکاری ملازم، اس کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں اس دفتر کا سب سے بڑا منافق ملازم تھا۔ لوگوں کی باتوں میں ہاں سے ہاں ملانا ہر ایک بات کی تائید کرنا، میرا وطیرہ تھا۔ یہ میں نہیں بلکہ لوگ کہتے تھے۔

ایک دن کسی کام کے سلسلے میں اس نے مجھے اپنے آفس بلایا۔ جب میں اس کے آفس پہنچا تو دفتر کے کمرے میں دھیمی روشنی اور گھٹن کا احساس تھا۔ دیوار پر لگی تصاویر میں وہ خود اپنی کامیابیوں کے تمغے سجائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ کچھ دیر ادھر اُدھر کی رسمی باتوں کے بعد اس نے ذرا بے تکلفی سے پوچھا:

خالد نذیر

"چائے پیو گے؟"

میں نے نیم رضامندی سے گردن ہلائی اور اس کے خاص خادم اللہ داد کو تلاش کرنے لگا۔ وہ میرے اشارے کو سمجھ گیا اور ہنس کر بولا، "یعنی تم چائے پیو گے؟"

میں بھی ہنس دیا۔ ایک لمحے کے لیے فضا میں غیر متوقع ہلکا پن آ گیا، جیسے خزاں کے پتوں کے بیچ کوئی خوشبو گزر گئی ہو۔ پھر اس نے بلند آواز میں اللہ داد کو بلایا:

"اللہ داد! صاحب کے لیے چائے لاؤ۔"

چائے کا دور ختم ہوا اور اس کے بلانے کا مقصد پورا ہوا تو میں نے قدرے سنجیدگی سے بات چھیڑ دی۔

"چوہدری صاحب! آپ تو آفس میں ہی رہتے ہیں، باہر لوگ عجیب عجیب باتیں کرتے ہیں آپ کے بارے میں۔"

وہ چونک گیا۔ جیسے کسی نے اچانک آئینہ سامنے رکھ دیا ہو۔ کمر سیدھی کی، انگوٹھی گھمانا شروع کی، اور پھر اپنی مخصوص سخت زبان میں پوچھا:

"لوگ کیا کہتے ہیں؟"

میں نے تھوڑا جھجک کر مگر سچائی سے کہا:

"بس وہی جو سب کہتے ہیں، کہ آپ بدتمیز ہیں، بدعنوان ہیں، اور بے لحاظ بھی۔"

وہ خاموشی سے انگوٹھی کو گھماتا رہا، جیسے سچائی کا بوجھ اس کے ہاتھ میں بند ایک دائرے میں قید ہو۔ پھر اس کا چہرہ سرخ ہونے لگا، آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے، اور وہ غصے سے بولا:

"لوگوں کی ایسی کی تیسی! میرے سامنے آ کر بات کریں تو پتہ چلے، ڈرپوک کہیں کے! یہ لوگ جاہل اور منافق ہیں۔ پیٹھ پیچھے باتیں کرنے والے، سامنے کچھ کہنے کی ہمت نہیں۔ عزت دار خاندانی ہوتے تو منہ پر بات کرتے، یوں پیچھے سے وار نہ کرتے۔" "کمینے کہیں کے----"

میں نے خاموشی سے چائے کا آخری گھونٹ پیا۔ اس کی آنکھوں میں آگ، لہجے میں زہر اور لفظوں میں نفرت تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور دل میں کہا: "میں تو سامنے بیٹھ کر یہی باتیں کر رہا ہوں، پھر یہ "منافق لوگ" کون ہیں؟

☆☆☆☆☆

”زیتون کا درخت“

”جب زمین پر جبر لکھا جاتا ہے اور آسمان سے آگ برستی ہے، تب کہیں ایک بچی کہانی لکھتی ہے... نہ قلم ہوتا ہے، نہ کاغذ، بس دل ہوتا ہے زخمی!

غزہ کی گلیاں جیسے ایک مسلسل جنازہ گاہ محسوس ہوتی تھیں - مکان ملبے کا ڈھیر، درو دیوار سسکیاں بھر رہے تھے۔ اور ان سب کے بیچ، ایک بچی زینب، اپنے بوسیدہ گدے پر لیٹی، چھت کے سوراخ سے آسمان کو تک رہی تھی۔ وہ جانتی تھی ستارے وہاں نہیں تھے یا شاید بموں کی روشنی نے انہیں ڈرا دیا تھا۔

زینب کی ماں ”ام زینب“ ہر رات سوتے وقت دعاؤں میں آنسو بہاتی اور بیٹی کے بالوں کو سہلاتی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔

زینب نے ایک روز پوچھا:

”ماں، ہم اتنے چھوٹے کیوں ہیں کہ ہمیں مارا جا سکتا ہے لیکن اتنے بڑے نہیں کہ ہم سے پوچھا جائے؟“

ماں نے صرف ماتھا چوم کر کہا:

”بیٹی، فلسطینی بچے جلد بڑے ہو جاتے ہیں... یہ سرزمین ان سے قیمت مانگتی ہے۔“

زیتون کا درخت زینب کے گھر کے آنگن میں موجود آخری یادگار تھا۔ اس درخت نے اس کے والد کو جوانی میں سایہ دیا تھا، اور زینب کو بچپن میں جھولا۔ بابا اکثر کہتے:

”جب زیتون کا درخت جلتا ہے، وہ چیختا نہیں... بس صبر کرتا ہے۔ جیسے ہم۔“

پھر ایک صبح، درخت نہیں رہا۔ میزائل نے اسے چیر دیا تھا اور اس کے ساتھ بابا کو بھی۔ زینب نے اس دن کچھ نہیں بولا، لیکن پہلی بار اس نے زبان سے نہیں، دل سے احتجاج کیا۔ گھر اب صرف ایک کمرہ تھا، باقی ملبہ۔ ماں اور بیٹی اس میں چھپ کر دنیا سے لڑتی تھیں۔ کبھی کھانے کے لیے کچھ نہ ہوتا، کبھی پانی تین دن بعد ملتا۔ زینب نے ایک دن دیوار پر کوئلہ لے کر لکھا:

”ہم زندہ ہیں، اور یہی ہماری مزاحمت

کومل شہزادی

ہے۔"

اس کے الفاظ کبھی سادہ نہ تھے۔ وہ ہنستی کم تھی مگر دیکھتی بہت تھی۔ وہ ہر ماتم، ہر چیخ، ہر لاش میں کچھ نوٹ کر لیتی جیسے وہ تاریخ کی خاموش مورخ ہو۔

پھر ایک رات آئی جو کسی قیامت سے کم نہ تھی۔

ماں نے زینب کو گود میں چھپایا۔

دروازہ زور سے بجا۔

روشنی چمکی، پھر دھواں چھایا۔

جب زینب نے آنکھیں کھولیں، ماں بے جان تھی۔

زینب کی آنکھوں سے آنسو نہیں نکلے۔

وہ پتھر ہو چکی تھی۔

بس اٹھ کر ماں کا دوپٹہ لیا، اس کی قبر خود کھودی اور ایک کاغذ پر لکھا:

"میری ماں شہید ہوئی ہے، وہ دہشتگرد نہیں تھی صرف فلسطینی تھی۔"

زینب اب پناہ گزین کیمپ میں تھی۔ وہاں ہر خیمہ ایک کہانی تھا۔ کوئی ماں اپنے تین بچوں کو دفن کر چکی تھی، کوئی بوڑھا اپنی نسل کی تلاش میں تھا۔ مگر زینب کچھ الگ تھی۔

وہ بچوں کو سبق دیتی، انہیں کہانیاں سناتی۔

وہ زیتون کے پتے جمع کرتی، ان پر لکھتی:

"میں زینب ہوں۔ میں ختم نہیں ہوئی۔ میں کہانی ہوں۔۔۔ تمہیں سنانے کے لیے۔"

کئی سال گزر گئے۔۔۔۔!

زینب اب جوان ہو چکی تھی۔

ایک عالمی ادارے میں اسے بلایا گیا۔ اس نے وہاں صرف ایک جملہ کہا:

"اگر تم واقعی سننا چاہتے ہو، تو بندوق نیچے رکھو اور میرے دل کو سنو۔"

اس کی تقریر دنیا بھر میں پھیل گئی۔

لیکن وہ خود اب بھی ہر صبح ایک زیتون کا پتا جیب میں رکھتی ہے۔

اس امید کے ساتھ کہ ایک دن، غزہ کے ملبے پر ایک نیا درخت اُگے گا... اور بچے اس کے نیچے بم سے نہیں، بارش سے ڈریں گے۔

یہ کہانی ختم نہیں ہوتی۔۔۔۔

یہ زینب کی نہیں، یہ ہر اس بچے کی ہے جو ظلم سہتا ہے لیکن جھکتا نہیں۔

زیتون کا درخت اب بھی ہر فلسطینی دل میں زندہ ہے۔

وہ جلتا ہے، مگر مٹتا نہیں۔۔۔۔!

☆☆☆☆☆

”غم ورثہ ہے“ [ناولٹ]

دردانہ نوشین خان

ابھی میٹرک کا امتحان دیا تھا کہ ثمینہ کی شادی طے ہو گئی - اتنی جلدی اور اچانک؟ چہ میگوئیاں ہونے لگیں- آخر سبب سامنے آ گیا-

ثمینہ کے ابا نے کسی لڑکے کو ثمینہ کو گلی میں رسالہ دیتے دیکھ لیا تھا (بل کہ رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا) حالانکہ وہ لڑکا اصرار سے جبراً رسالہ تھما رہا تھا- ابا کو دیکھ کر ثمینہ گلی میں دوڑتی ہوئی اپنے گھر میں گھس گئی-

کپڑے دھوتی ماں حواس باختہ بیٹی کو دیکھ کر ابھی کچھ پوچھ بھی نہ پائی تھی کہ پیچھے نذر محمد (ابا) داخل ہو گیا- داخل ہوتے ہی ثمینہ پر جھپٹا- امتحانی گتا اور رسالہ اُس سے کھینچا- آؤ دیکھا نہ تاؤ- گتا ثمینہ کے سر اور چہرے پر مارتا چلا گیا-

”آوارہ......کمینی......اُلو کی پٹھی......کون تھا وہ؟“

جوان بچی کی درگت دیکھ کر ماں نے دھلی ہوئی قمیض فرش پر پٹخی، آگے بڑھی (اگرچہ اکیس سالہ شادی شدہ زندگی میں ملک نذر محمد سے اونچی آواز میں بات کرنے کی ہمت نہ کی تھی) ثمینہ کو اپنے پیچھے دھکیل کر پوچھا ”کیا کیا ہے اس نے؟ کیوں جوان بچی پہ

شروع ہو گئے ہو"

"جوان بچی سے جوانی سنبھالی نہیں جا رہی۔ شروع تو میں اب ہو کے دکھاؤں گا۔ اس سے پہلے کہ..... میری عزت غیرت کا جنازہ نکلے" رسالہ پھینک کر وہ ادھر اُدھر مارنے کے لیے کچھ تلاش کرنے لگا۔ غصّے سے نتھنے پُھنکار رہے تھے۔ ماں نے جانا کہ آج ثمینہ نہیں بچتی ۔ اُسے دھکا دے کر کہا

"کمرے میں بھاگ جا۔"

سترہ سالہ لڑکی سکول کے کالے عبائیہ میں کمرے کی طرف بھاگی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ چودہ سالہ ثانیہ برآمدے میں کھڑی تھی، جس کی آنکھوں میں باپ کے لیے نفرت کا طوفان تھا۔

نذر محمد نے بند کمرے کے کواڑ نہیں پیٹے (راحت (بیوی) کو کچھ نہیں کہا۔ وہ یک دم باہر نکل گیا۔ ثانیہ اور ثمینہ نے سکھ کا سانس لیا مگر راحت کا خوف ماسوا ہو گیا۔ خدا جانے کیا سوچ رہا تھا۔

"کون کم بخت تھا؟ تُو نے رسالہ پکڑا کیوں؟"

"امّی..... مجھے نہیں پتا" زار و قطار روتی ثمینہ کے پاس ثانیہ نے پانی کا گلاس لا کر رکھا۔

"تُو مجھے بتاتی....."

"پہلے کبھی نہیں دیکھا امّی"

"رسالہ میں کیا تھا..... خط تھا؟"

"امّی..... مجھے نہیں پتا" ثمینہ کا تو روتے روتے سانس نہیں سنبھلتا تھا۔

"خط بھی ہو تو ثمینہ باجی کا کیا قصور..... رسالہ وہ دے رہا تھا۔ اتنا تو اندھا بھی سوچ سکتا ہے" ثانیہ نے لفظوں کے چھیتڑے نابود باپ پر مارے۔

"اندھا سوچ سکتا ہے تمھارا باپ نہیں، آج خدا خیر کرے، کہیں اُس کو مار پیٹ نہ آئے"

ملک نذر محمد تب کا گیا رات کو گھر میں داخل ہوا خاموشی سے کھانا کھایا کھانے کے بعد بیوی سے کہہ کر چائے بنوائی۔ وہ چائے کا کپ لائی تو کہا

"بیٹھو میرے پاس"

(یاالٰہی خیر) راحت دل کی دھڑکن کو سنبھالتی بیٹھ رہی۔

"میں نے ثمینہ کا رشتہ طے کر دیا ہے"

"ک..... کیا؟"

"وہ لوگ کل آئیں گے"

"کون لوگ"

"میری برادری کے ہیں۔ خیر پور جنوبی میں رہتے ہیں۔ زمین ہے۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ اپنا کماتے کھاتے ہیں۔ لڑکا دوحاجو ہے نہ بڈھا مناسب عمر کا مناسب رشتہ ہے۔"

"ہماری ثمینہ...... بہت چھوٹی ہے ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے...... دیہات...... دُور" ماں کی زبان پر الفاظ غلط ملط ہو رہے تھے۔

"جتنی چھوٹی ہے اُتنی کافی ہے...... شادی جلدی ہو جائے اچھا ہے"

"پھر...... بھی...... میں کہتی ہوں"

"یہ سلسلہ کب سے ہوگا، دو ٹکے کا کبوتر باز رسالہ دے رہا ہے...... اللہ نے بچا لیا آج میری نظر پڑ گئی" ماں کی "اگر...... مگر...... توقع کے عین مطابق بیکار جا رہی تھی۔ ابا نے کہا۔

"رہی بات دیہات اور دُور کی...... تم بھی تو کی سے بیاہ کر کوٹ ادو آئی تھی۔ تب کوٹ ادو دیہات ہی تھا۔ دیہاتی میں بھی تھا۔ "نذر محمد ٹانگیں پسار کر لیٹنے لگا۔ راحت بی بی چائے کے برتن اُٹھاتے ہوئے کچھ کہنے والی تھی کہ وہ بولا

"کھانے کا انتظام کر لینا۔ وہ کل آ رہے ہیں۔ جو لینا ہو بتا دینا۔"

"کیوں آ رہے ہیں؟" ماں تو بالکل ناقص العقل ہو رہی تھی۔

"مجید، اُس کے ماں باپ اور چند لوگ ہوں گے۔ ثمینہ کا مجید سے نکاح ہے ایک ہفتہ تیاری کر کے اگلے جمعہ رخصتی کر دوں گا۔"

فیصلے کا یہ پتھر سب کے کانوں میں بجا تھا۔ بھائیوں نے (اظہر ثمینہ سے بڑا اور مظہر چھوٹا تھا) کان بند کر لیے۔ ثمینہ حیرت زدہ رہ گئی۔ لرزتی ٹانگوں اُٹھ گئی۔ "میں ابا سے...... معافی مانگ...... لیتی ہوں۔"

ثانیہ کی آنکھوں میں تھا کس بات کی معافی مگر مصلحتاً ساتھ ہو گئی

"ہاں...... چلتے ہیں"

وہ دونوں اندر سے نکل کر لاؤنج میں آئیں۔ پھیکے بلب کی نیم اندھیری روشنی میں ابا کی گھورتی آنکھیں شیر کی طرح چمکیں۔ ثمینہ کی ہمت کمزور پڑتے محسوس کر کے ثانیہ بول پڑی۔

"ابا...... ثمینہ باجی کو معاف کر دیں۔"

"ابا...... میری کوئی غلطی نہیں...... مجھے......"

"خبردار جو مجھے ابا کہا...... ہٹ جا میرے سامنے سے......"

"آپ اس کی بات تو سُن لیں" ماں نے ہمت پکڑی

"ثانی...... اسے لے جا یہاں سے، میں اسے جہنم میں نہیں ڈال رہا۔ ہر لڑکی کی شادی ہوتی ہے مگر عشق معشوقی مجھے برداشت نہیں...... برتن اُٹھاؤ۔ تکیہ لاؤ۔ میرے سر میں درد ہو رہا ہے"

"ابا...... آپ ثمینہ باجی کو بات کرنے کا موقع تو دیں" یہ جملہ ابھی پورا نہ ہوا تھا کہ ابا دہاڑے۔

"دفعہ ہو...... پرے مرو"

ثانیہ کا مُنہ لال سرخ ہو گیا وہ ثمینہ کو دیکھ رہی تھی کہ انکار کر دو پر جو ہوگا ہوتا رہے گا۔“

ثمینہ پتھر کی ہو گئی تھی، ماں نے اُسے بازو سے پکڑا وہ بے جان چیز کی طرح گھسٹتی چلی گئی۔ دونوں بل کر تینوں ہیولے غائب ہو گئے۔

”جیوے نیڑا عمراں ساریاں“

مراثن ڈھولک کے ساتھ گلا پھاڑ رہی تھی۔

”اور مر گئی نری عمراں ساریاں“ لاک پھولدار لمبے فراک والی مراثن ناچ کے ٹوٹے پھوٹے سٹپ لیتی لہراتی کبھی ادھر والی سے کبھی اُدھر والی سے دس/ بیس کے نوٹ پکڑتی اور زور سے آواز لگاتی۔

”ویل......ویل......گھوٹ دی بوا دی ویل“

”ویل......ویل......گھوٹ دی لتاں دی ویل“

جہاں اُس کے گھنگھرو والے پاؤں گھومتے نیچے بچھی پتلی لال دری سمٹ کر سلوٹیں پاتی۔

نذر محمد کے گھر کے صحن میں ناکافی پنکھے اور گرمی تھی۔ خیر پور جنوبی سے آئی ہوئی بارات ایک بس پر مشتمل تھی۔ چند گاڑیاں اور موٹر سائیکل جو نذر محمد کے مہمانوں کے تھے کُھلی گلی میں بس کے ساتھ تھے۔ مردانہ انتظام قریبی خالی مکان میں تھا۔ جہاں میزیں کُرسیاں، کچی وائر سے مُہیا کی گئی بجلی سے چلتے پنکھے تھے۔ قناعت کی اوٹ میں دیگیں رکھی تھیں۔

وان کی چارپائی پر ڈھلی ہوئی سٹیل کی پلیٹیں، چمچ اور تھال اوندھائے ہوئے تھے۔ عجلت میں کی گئی بے دلی کی تیاری مُنہ بولتی تھی۔ ملک نذر محمد کے حساب سے یہ شادی غریبانہ مگر بارات والوں کی توقع سے بڑھ کر امیرانہ تھی۔ کھانا وافر تھا۔ برف والا پانی اور ٹھنڈی بوتلیں تھیں۔ بجلی بند نہ ہوتی تھی۔ پنکھے مسلسل چل رہے تھے اور کیا ہوتا۔

دولہے (مجید) کی ماں اپنا تمیں سالہ پرانا مسکا ہوا عروسی جوڑا پہنے، لال پراندہ ڈالے اٹھلاتی پھرتی تھی۔ دونوں ہاتھ لال مہندی سے رچے ہوئے اور کلائیوں میں موٹی سبز سرخ کانچ کی چوڑیاں چڑھی تھیں۔

ثمینہ کے کمرے میں قیامت صغریٰ بپا تھی۔ دو دفعہ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ بدن پر بروکیڈ کے سرخ جوڑا کا چڑھا وا تھا، گھٹن اور گرمی بے پناہ تھی ثانیہ کمرے سے لڑکیوں کو نکالتی پنکھا تیز کرتی ہلکان ہو رہی تھی۔ ماں نے ہمت کر لی کہ چمکیلا چبھنے والا سوٹ اُتروا کر لان کا سرخ سوٹ پہنایا۔

”اتنے لمبے سفر اور گرمی کا یہ کپڑا نہیں“

”میرا رتیوں والا جوڑا تھا۔ سو ماسی بڑبڑانے لگی۔

”ثمینہ باجی کے بازوؤں پر خراشیں پڑ

گئی تھیں۔“

ثانیہ کے بولنے پر جوماسی نے اُسے غور سے دیکھا۔ بیچاری بہن کی رو رو کر آنکھیں سوُج رہی تھیں۔ گھر کے عام کپڑوں میں تھی۔

”بی بی.....توُں تاں نہ رو۔ ہک وار شودی رو ویندی بس نی کریندی“

(بی بی،تم نہ روؤ،ایک تو دُلہن بیچاری روتے بس نہیں کرتی) رخصتی یوں کی گئی کہ چادر اوڑھا کر تاڑنے والی نظروں سے ثمینہ کا چہرہ چھپا کر بھائیوں نے تقریباً اُٹھا کر بس میں چڑھایا تھا۔ کاجل پھیل چکا تا۔ لپ اسٹک اُس نے چادر سے رگڑ کر مٹادی تھی۔

اور ثمینہ رخصت ہوگئی۔

ثانیہ اب نہیں رو رہی تھی۔ وہ شعلہ بار نظروں سے باپ بھائیوں کو گھور رہی تھی۔ ثانیہ کے پاس محلہ دار لڑکی رملہ نے آکر کہا تھا

”دولہا ذرا بھی اچھا نہیں۔ کالا اور گنوار، نوکروں جیسا“

”تمھیں کیا“

”لگتا ہے آنٹی انکل نے بھی یہی سوچا...... ہمیں کیا.....“ اُس کا جواب دل میں تیر کی طرح لگا۔ وہ بھاگتی ہوئی گھر کے اندر ثمینہ کے چھوڑے ہوئے کمرے میں یوں گئی جیسے ثمینہ کو وہاں بیٹھا ہوا پالے گی، مگر مضطرب ہوکر باہر نکل آئی۔

امّی اب دوپٹے سے ناک پونچھتی کھانا سنبھلوا رہی تھیں۔

”ابا کو رج کے کھانا دیں۔ تھال بھر دیں میں دے آؤں۔“ بھائیوں کو بھی رجوا دیں.....آپ بھی کھائیں.....شکر منائیں“

”اور.....تم“

”آپ کو کیا......؟“ وہ پھر سے اندر جا رہی تھی۔

تین گھنٹے کی مسافت طے کرکے بارات خیرپور جنوبی پہنچی۔ سڑک سے اُتر کر کچا پکا راستہ طے کرتی بس ایک میدان میں جا کر رُکی۔ رات کے نو بج رہے تھے اور وہاں کے معمول کے مطابق بجلی جا چکی تھی۔ بس سے اُترنے والوں کی آوازیں اس کی تصدیق کر رہی تھیں۔

”بجلی چلی گئی...... نو بج گئے“ ”اوے موبائل جلاؤ“

سامنے ایک دروازے پر جھنڈیاں لٹک رہی تھیں۔ یہ ہی شادی والا گھر تھا۔ بس کے اندر بیٹھی مراثنوں نے جمائیاں لیں۔ ڈھولک پر تین بار سوٹی مار کر ڈھم ڈھم کی۔ ثمینہ جو اونگھ گئی تھی ہڑبڑا کر جاگی، دل اُچھل کر حلق میں آیا۔ یاد آیا میں دُلہن ہوں۔ یہ میری بارات ہے۔ صحن میں جب چارپائی پر کھیس

بچھا تھا وہاں دُلہن کو لاکر بٹھایا گیا۔ ایک گاؤ تکیہ لا کے رکھا گیا۔ اُس بیچاری گرمی کی ماری کی چادر اُتار کر گھونگھٹ اُٹھا دیا گیا۔
نیم اندھیارے صحن میں بچوں کی چیخ و پکار۔ عورتوں کا ہنستا بولنا مردوں کی آوازوں کا شور پھیل گیا تھا مراثین اپنی گونجتی آواز میں پیس کم ہونے کی تکرار کر رہی تھیں۔ یہ تکرار اور بے ہودہ مذاق اُسی مرد سے ہو رہے تھے جو دُلہن کی چارپائی پر بیٹھا تھا اور اس گرمی میں اُس کی گردن میں نوٹوں کا ہار تھا۔ وہ اندھیرے میں اُسے کہیں رکھ کر نقصان نہیں کروانا چاہتا تھا۔ اُن دونوں کے درمیان ایک رنگین چھابی میں ٹھنڈے نان، بڑی سی تھالی میں بوٹیوں سے بھرا سالن لا کر رکھ گیا۔ (یہ اُسی دیگ کا سالن تھا جو ثمینہ کے ابا نے ساتھ دی تھی) دولہا دُلہن کی چارپائی کے پاس لالٹین رکھ کر اعزاز بخشا گیا۔ باقی لوگ چاند کی چاندنی میں کھا رہے تھے۔ دو نیم ٹھنڈی پیپسی کی بوتلیں دی گئیں۔ ثمینہ نے آدھی بوتل گلاس میں ڈال کر اس میں ٹھنڈا پانی ملایا اور گھونٹ گھونٹ کرکے پیتی رہی۔ مجید اُسے "کھاؤ، کھاؤ" کہہ دیتا اور کھاتا رہا۔ ایک گھنٹے بعد بجلی آ گئی۔ خوشی کے نعرے لگے۔ بجلی آنے کے بعد دُلہن کے کمرے میں جہیز کا سامان پہنچایا گیا۔ پلنگ پر چادریں بچھائی گئیں۔ اُس اثنا میں مزید ایک گھنٹہ وہ اُسی چارپائی پر زیارت گاہ بنی بیٹھی رہی۔ حتیٰ کہ اُس کا منہ تکنے والی عورتیں اور اوچھے بدتمیز بچے اُسے دیکھ دیکھ کر رَج گئے۔
کمرے میں جاتے ہی ثمینہ نے زیور اُتارے۔ پچھلے دروازے کے ساتھ سٹور تھا وہاں سے نکل کر منہ ہاتھ دھویا۔ جہیز میں دیا گیا چھت کا پنکھا ابھی ڈبے میں بند تھا۔ جہیز کا پیڈسٹل کمرے میں چل رہا تھا۔
مجید کی بول چال، شکل صورت، اُٹھک بیٹھک کچھ بھی ثمینہ کو ایک آنکھ نہ بھا رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ اگر وہ کوئی خوبرو افسر بھی ہوتا تو اس وقت اُس ناگوار گزرتا۔ مجید جیسے اکھڑ پینڈو کو برداشت کرتے من کے روڑ کو کچلتے کچلتے وہ نیم مُردہ ہو گئی۔
جس کم سن بچی کو ناپسندیدہ رشتے سے حکمیہ جوڑا گیا تھا۔ اُس کو ملنے اور چھٹی کی رسم کرنے بھی والدین سات دن بعد آئے۔
یقیناً یہ بھی ابا کا حکم ہوگا۔ ان سات دنوں کی مشقت اور راتوں کی ہیبت نے اُس کا حلیہ بگاڑ دیا تھا۔ کیسی دُلہن اور کہاں کی دُلہن، تیسرے دن اُسے اُس کے کام بتا دیئے گئے۔ کالی ہانڈیاں مانجھنے سے ناخن ٹوٹ گئے، تندور میں روٹیاں پھینکنے چلانے بازو

جھلسانے کے بعد شدید گرمی میں توے پہ بیس بیس روٹیاں پکانے سے رنگت مدھم ہو گئی۔ گرمی دانے نکل آئے وہ کس کے بال باندھے دوپٹہ کمر سے باندھے صحن میں جھاڑو دے رہی تھی جب اُس کے اُجلے امّی ابا ویڑے میں داخل ہوئے وہ شدت سے چونک گئی، شدت سے دل مچلا کہ ماں کے سینے سے لگ کر روئے جیسے وہ گم ہو گئی تھی، مگر جھاڑو پکڑے اُٹھ کر کھڑی ہوئی اور دُور سے سلام کیا۔ سجو ماسی آؤ بھگت کرتے ہوئے اُنھیں ثمینہ کے کمرے میں لائی۔ ماں بہت تحفے لائی تھی۔ کمرہ بھر گیا تھا۔ کھانے پینے کا سامان پھل مٹھائی کے علاوہ مجید، نوید اُس کی بہن عائشہ - ساس سُسر کے جوڑے سجو ماسی کی تو آنکھیں کھل گئیں۔ ثمینہ چائے بنا کر لائی تو پیار سے بولی

”یہاں سے چیزیں لے جاتی۔ کیسی چاء بنا لائی ہو دُلہن۔“

”جیسی چائے یہاں پیتے ہیں، اپنے والی چائے تو روز پیتے ہوں گے“

گاؤں کی دکان سے منگائی گئی برفی اور ٹھنڈے پکوڑے اُس نے آگے رکھ دیئے۔

عائشہ (ثمینہ کی نند) آٹھویں جماعت میں پڑھتی تھی مگر ثمینہ کی ہم عمر تھی۔ اُس نے حال ہی میں اپنا نام عائشہ سے علیشا رکھ لیا تھا۔ وہ بہت تیز لڑکی تھی۔ ثمینہ کے ابا کو ”چاچو...... چاچو“ کرتی آگے پیچھے پھرتی سجو ماسی بھی مسکراتی رہتی۔

والدین رسم کے مطابق بیٹی کو لینے آئے تھے۔ وہ کپڑے بدل کر چپ چاپ چل دی۔ مگر اب اُس کے اندر ”واپس نہیں جاؤں گی“ کی تکرار تھی۔

بیٹی کی ظاہری و باطنی ٹوٹ پھوٹ سے انجان ابا نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر باپ کی پگ کی لاج رکھنے پہ شاباش دی جس کے ہر لفظ کا مطلب یہ تھا کہ اب یہی تری آخری منزل ہے اور یہ کہ ہم تمھاری مدد کرتے رہیں گے۔ پھر وہ راحت بی بی کو مشورہ دینے لگے کہ علیشا آگے پڑھنا چاہتی ہے ادھر ہائی سکول نہیں ہے اُسے اپنے یہاں لے آتے ہیں۔ یہ وہی سورما تھا جس نے اپنی بیٹی کے آگے پڑھنے کے خواب لمحوں میں نوچ ڈالے تھے۔

باورچی خانے میں کھانا بناتی ماں کے کندھے سے لگی وہ بدنصیب بتائے جاتی تھی...... امّی مجھے مجید سے گھن آتی ہے۔ وہ دانت صاف نہیں کرتا ہے۔ رات کو کھانے میں پیاز کھاتا ہے، گالی منڈے اور اوے توے“ کر کے بات کرتا ہے“

”بیٹی...... خاوند کا حق ہوتا ہے اُسے شریعت

قانون کوئی نہیں روک سکتا۔ عورت گزارہ کرتی ہے بیٹی" ماں کے ٹھنڈے جواب
"میں اُس زبردستی کے نکاح کا خاوند نہیں مانتی ...... میں کیوں گزارہ کروں، میری دو وقت کی روٹی بھاری ہے۔ امی میں کسی کوٹھی میں جھاڑو پوچا کرلوں گی، کسی بھی طرح اپنی روٹی کما لوں گی...... مجھے سر چھپانے کی چھت دے دیں۔ اچھا چھت بھی نہ دیں۔ بس طلاق دلوا دیں۔"
"میری جند کا ٹکڑا...... شروع میں لڑکیوں کا دل نہیں لگتا، مرد بھی بدل کر ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ میں مجید کی ماں کو سمجھا آئی ہوں تمھیں آگے تعلیم سے نہیں روکیں گے۔ ہیلتھ ڈپلومہ علی پور سے کر کے صحت کے محکمے میں نوکری مل جائے گی"
"ماسی بجو مان گئی ہے؟"
"ہاں...... اُن کا کیا نقصان ہے تم اپنا کماؤ کھاؤ گی"
"میں علی پور کیسے جاؤں گی"
"نوید کالج جاتا ہے تمھیں لیتا جائے گا"
"امی ...... پھر بھی مجید سے جان چھوٹے کسی طرح"
"کچھ صبر بھی کرتے ہیں بیٹی"
"اللہ کرے مر جائے مجید، میں بیوہ ہو جاؤں نفل پڑھوں گی"

پانچ دن گزر گئے۔ چھٹے دن مجید آگیا۔ علیشا اُس کے ساتھ تھی۔ ابا خوش ہو گیا۔ رسماً کہا ثمینہ کا، خیال رکھا کرو۔ یہ اتنے کام کاج کی عادی نہیں ہے، ثمینہ اس "بناوٹی" محبت کو جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔
پس خشت اوّل یہ رکھ دی گئی۔ ثمینہ میکے جائے تو بھر کر تحفے لائے وہاں سے کوئی آئے تو بھر کر تحفے لائے۔ دیدہ دلیری سے اشیاء بتائی جاتیں کہ اب یہ یہ لانا ہے، کبھی کسی چیز کی قیمت پوچھی گئی نہ احسان مندی کا کوئی تاثر ہوتا۔
سزا تو نذر محمد کو بھی مل رہی تھی مگر یہ سزا بہت ہلکی تھی۔
پہلے پہل وہ مجید کو کھانا دے کر اپنا کھانا نکال کر دوسری جگہ بیٹھ کر کھانے لگتی مجید کمرے سے کبھی آواز لگا کر نمک مانگتا، کبھی کچی ہری مرچ مانگتا کبھی پاس رکھا گلاس اُٹھا کے دینے کو بلاتا۔ اُسے اپنی پلیٹ چھوڑ کر بار بار اُٹھنا پڑتا۔ بجو ماسی نے اُسے ڈپٹ دیا۔
"اپنی تھالی بھرنے کی جلدی ہوتی ہے مرد کھا پی کر فارغ ہو تو بعد میں کھایا کر، وہیں بیٹھی رہا کر۔"
"چنانچہ اُسے "مت" آگئی۔ وہ خاوند کے سامنے کھانا رکھ کر تابعداری سے مناسب فاصلے پر دم سادھے موجود رہتی۔ برتن بھانڈے خالی ہونے پر لے جاتی۔ چائے

سگریٹ کا حکم پورا کر کے اپنی تھالی اُٹھانے کی روادار ہوتی۔

شادی کے ایک سال بعد بیٹا پیدا ہو گیا۔ زچگی میکے میں ہوئی۔ سارا خرچہ میکے نے اُٹھایا۔ دوران چِلّہ ثمینہ کو ڈپلومے کے امتحان کی خاطر واپس آنا پڑا۔ جو گھی، مکھن، شہد وہ لائی تھی مجید اور ماسی جیو نے دب کر کھایا۔

ثمینہ کو اب قریبی دیہی مرکز صحت میں نوکری مل گئی تھی۔ نوکری بھی ابا نے سفارش سے لگوا دی تھی۔ وہ ڈیوٹی پر چلی جاتی۔ بچہ دن بھر مٹی میں رُلتا، مٹی کھاتا، بیمار رہتا۔

نوکری کے کسی کام کے سلسلے میں ثمینہ کو ڈسٹرکٹ ہسپتال جانا تھا۔ ہاں سے فارغ ہو کر وہ اچانک والدین کے گھر گئی تو سب پریشان ہو گئے۔ سب کو لگا وہ لڑ کر نکالی گئی ہے یا نکل آئی ہے۔ امی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگی علیشا ”کیا ہوا“ کی گردان کرنے لگی۔

”سب خیریت ہے DHQ کام تھا“ یہ سن کر سب کی جان میں جان آئی سب ایک دم شیریں گفتار ہو گئے۔ اُس روز ثمینہ کو بہت دُور تک حقائق صاف نظر آئے۔

وہ اپنے گھر کو غور سے دیکھتی رہی۔ ثانیہ میٹرک سائنس کے پرچے دے چکی تھی وہ ایف ایس سی فرسٹ ایئر کی ٹیوشن پڑھنے جاتی تھی۔ علیشا بھی کالج داخلہ لینے والی تھی۔ اظہر کو ابا نے نیا موٹر سائیکل دلوایا تھا۔ ابا نے بھی چھوٹی گاڑی خرید لی تھی۔ امی، علیشا اور ثانیہ کو دیکھ کر لگا وہ کہیں جانے والی ہیں۔ کہیں سے آئی ہیں۔ سب کے کپڑے نئے نئے اور ٹائلش لگ رہے تھے۔ صاف ستھرا گھر تھا۔ ڈھول مٹی سے مُبرا ٹائلوں والا صحن، ایل ڈی پر خبریں آ رہی تھیں ہر خبر نئی تھی۔ علیشا اُجلے ہاتھ پاؤں والی گوری شہری لڑکی تھی انگلش کے لفظ ملا کر بولتی، مقبول عام ڈراموں، ٹک ٹاک، انسٹا کی باتیں کرتی۔ اظہر بھائی کے ساتھ بے تکلفانہ بولتی دونوں ہنس بول رہے ہوتے اور یہ سب ابا کے سامنے حلال تھا۔

اب ثمینہ خود کو یہاں کہیں نہیں پاتی تھی۔ ہاں یہ درست ہے امی نے ثمینہ کے بالوں میں مساج کیا۔ اُس کو اپنا خیال نہ رکھنے پہ سمجھایا۔ اُسے کریمیں اور کپڑے لے دیے مگر ثمینہ ویگن میں واپسی کا سفر کر رہی تھی اور اُس کے لبو میں ”ہائے او ربا نہیں لگدا دل میرا“ کا نوحہ تھا۔ وہ میکے جا کر اب خوش نہیں ہوتی تھی۔ شادی شدہ لڑکیوں کی بیٹری میکے جا کر چارج ہو جاتی ہے اُس کے دل کی بیٹری ختم ہو چکی تھی۔

ثمینہ کی ماں نے بالآخر فیصلہ کر لیا کہ ثمینہ کا بچہ وہ رکھ لیتے ہیں۔ اچھا کھلائیں پلائیں گے اچھی تعلیم و تربیت دیں گے۔ ابا نے اس فیصلے کی تائید کر دی۔ مجید اور جیو ماسی نے

اوپری سا انکار کر کے اجازت دے دی۔
ثمینہ کو تسلی ہوئی کہ عفان اچھے ماحول میں محفوظ ہوگا کچھ مہینے گزرے کہ سجو ماسی نے ثمینہ کو "چھڑی چھانٹ" ہونے کے طعنے دینے شروع کر دیے۔ پوتے کی یاد میں ٹسوے بہانے لگی قسمت سے ثمینہ کے ہاں دوسرے بچے کے آثار ہوئے تو سجو ماسی کی زبان بند ہوئی۔ دوسری زچگی کے دن قریب آئے ثمینہ نے مجید کو میکے چھوڑ آنے کو کہا۔
"اب کیا سارے چھلے ماں کے گھر ہوں گے، سجو ماسی بنا پوچھے اُن کے کمرے میں آدھمکی۔
اس طرح آجانا اُس کی روٹین تھی۔
وہ "سمجھدار تجربہ کار" نسیمو مائی (دائی) کا بتانے لگی۔
ثمینہ تو اب زچہ بچہ ہیلتھ سنٹر میں تھی۔ نسیمو مائی کو جانتی تھی۔
"پتا ہے مجھے، نسیمو کے بگڑے کیس ہمارے سنٹر آتے ہیں۔"
"تو کیا نسیمو سے بچے جنوانے والیاں ساری مرگئی ہیں؟ ترے چاچے دلبر کی نوں (بہو) ترنم...... اور اُس کی بہن تبسم" سجو ماسی ابھی مزید نام سوچ رہی تھی کہ ثمینہ نے جل کر کہا۔
"ترنم، تبسم نے تحصیل جا کر ڈیلوری کرائی تھی۔ نسیمو خدمت کرنے بعد میں جاتی تھی۔ نسیمو کے کام کو اچھی طرح جانتی ہوں۔
"اچھا اچھا وڈی ٹو سیانی...... نسیمو تیس سال سے کام کر رہی"
مجید نے اُس کی مخالفت کرنی تھی سو کی۔ ظاہری بک بک جھک جھک کے بعد انھوں نے کہہ دیا "اچھا جیسے تری مرضی۔" ماں بیٹا کے سر سے فرض ٹلا، خرچہ بچا تھے الگ وصول ہوں گے۔
ثمینہ تار پر بیٹھے کوے کو کوسنے لگی تو اُس کی امّی نے حیران ہو کر کہا۔
"ثمینہ، تمھاری زبان کیسی ہوگئی ہے، کبھی بلی کو گالی تو کبھی کوے کو مندا...... تم ایسے کب سے بولنے لگی"
"امّی! آپ نے سنا نہیں خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" جواب تلخ تھا۔
"خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑنا ہوتا تو میں نے پکڑ لیا ہوتا، تمھارا باپ غصے میں کم نہ تھا"
'ایک ہوتا ہے گرم غصہ، ایک ہوتا ہے بے شرم غصہ، میری زندگی ان دونوں میں پس کر برباد ہوئی۔"
اُنھی دنوں ایک دن بیٹھے بٹھائے بولی
"پیاری ماں...... تم بتا رہی تھی رسالے والے کبوتر باز کی شادی ہوگئی میرا تو محبوب ہرجائی نکلا۔ اب تو میری سزا سے جان چھڑا دو"
"تم اب بھی ایسا سوچتی ہو ثمینہ باجی"

[جاری ہے۔]

[حبیب جالب کے لیے]

ہم سے تو کسی شام کنارے نہ لگا دن
ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح ڈوب گیا دن

اے روشنیٔ طبع! چراغِ رخِ زیبا!
گل ہو کہ ہمیں بھی تو لگے ، بیت چکا دن

ہر روز یہی شام ، یہی صبح نما شام
ہر صبح وہی دھوپ ، وہی دھوپ بھرا دن

کیا جانیے ہر رات تھی کس دھوپ سے جل تھل
برسات کے بادل کی طرح آن گھرا دن

یہ طاق کسی داغ سے روشن نہیں ہوتے
اے شمعِ شبستاں بڑی مشکل سے ہوا دن

اک قریۂ غربت تھا کہ دن بھر جسے ماپا
آرے کی طرح رات بھر اس دل پہ چلا دن

اک رات پلک تک نہیں جھپکی گئی خالد
اک آن حدِ چشم سے باہر نہ گیا دن

خالد احمد

نظم

عرضِ امان کی خیر

غزہ و جموں و لاہور و
اصفہان کی خیر

دفاعِ ملت بیضا کے
ہر نشان کی خیر

ہوا ہے نشہ قوت میں
باؤلا طاغوت
ہو اہلِ خیر کے
ہر باغ و آشیان کی خیر

بنا رکھا ہے جنہیں
اہلِ شر نے اپنا ہدف
جمالِ رحمتِ عالم کے
عاشقان کی خیر

بلند رکھے ہوئے ہے
جو پرچمِ تہذیب
زمیں پہ امن و محبت کے
کاروان کی خیر

گزر رہے ہیں
عجب امتحاں سے
شام و سحر
گرفتِ قہر میں آئے ہوئے
زمان کی خیر

کہیں یہ مرحلہ
سب کچھ لپیٹنے کا نہ ہو
خدا سے مانگیے
بھٹکے ہوئے جہان کی خیر

درِ حرا سے بھی عالی
سنی یہ دل نے صدا
لہو سے لکھ گئی
عرضِ امان کی خیر

جلیل عالی

ہو ضمیرِ بے غرض میں ذکرِ ہُو

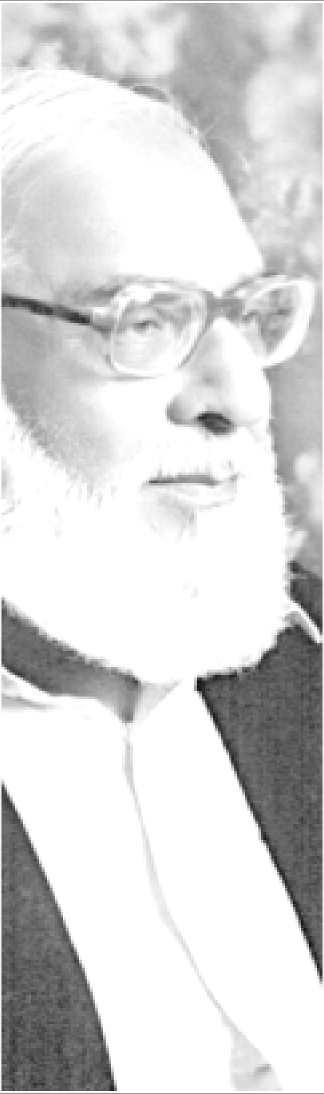

ہو شفا یاب اعضا تازہ لہو
دامنِ صد چاک ہو جس سے رفو

چہچہاتی چل پڑے بادِ شمال
کھلکھلائے بند کلیوں کی نمو

حسنِ فطرت کے مناظر کھل اٹھیں
زرد رو کی صورتیں ہوں سرخ رو

ہو تہی دامن محیطِ سرکشی
مہر و الفت سے بھریں جام و سبو

خندہ پیشانی بھی نور افزا رہے
مات کھائیں ظلمت آسا زشت خو

گلستانِ خلق پہ جوبن رہے
صحت افزا ہو بہارِ آبرو

ہو ریاضِ دل بشاشت آشنا
ہو ضمیرِ بے غرض میں ذکرِ ہُو

سید ریاض حسین زیدی

مرے آقاؐ

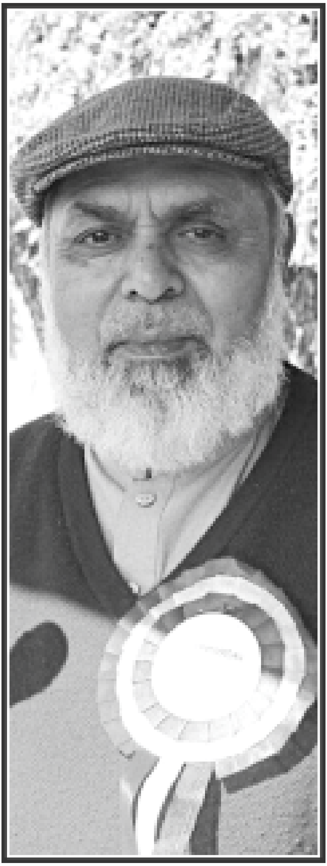

کیا کیجیے ، اِک عشقِ بہم ہے مرے آقاؐ!
گھیراؤ میں دیوارِ حرم ہے مرے آقاؐ!

ہر آنکھ یہاں گنبدِ خضرا پہ لگی ہے
جو اُمّتِ عاصی کا بھرم ہے مرے آقاؐ!

دولت ہے ، فقط آپؐ کے دیدار کی دولت
کیا دولتِ دینار و دِرَم ہے مرے آقاؐ؟

توفیقِ ثناء نعت نگاری ، گُلِ مدحت
واللہ ! عنایت ہے ، کرم ہے مرے آقاؐ!

جو آپؐ کے اوصاف رقم کرتا چلا جائے
مطلوب وہ حسّانیؓ قلم ہے مرے آقاؐ

اے والیءِ کونین ، انیسؔ دل و جاناں
سر آپؐ کی دہلیز پہ خم ہے مرے آقاؐ!

محمد انیس انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعت منظور

دنیا پر سایہ ، رحمت نے ڈالا
دن سا پیغمبرؐ ، سانچے میں ڈالا

ارشد شریف کے نام

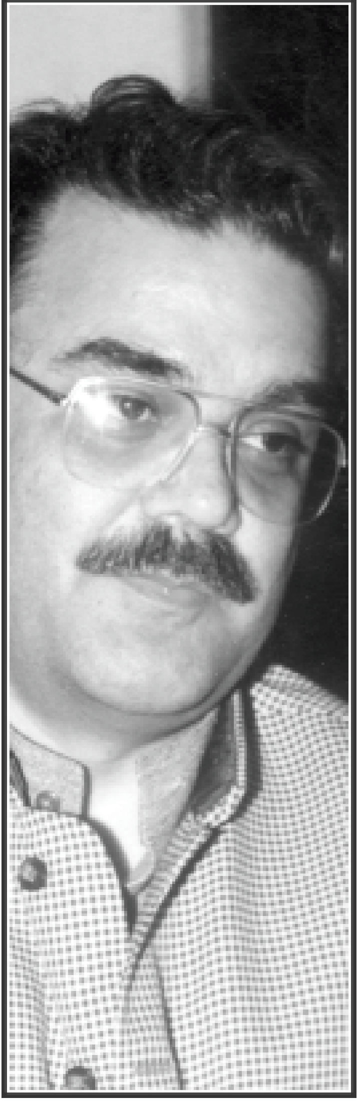

سچ ہے، تیری موت سبق ہے
تیرا دشمن سچ کہتا ہے
ظلم سے ڈرنا ہی بہتر ہے
سچ سے بچنا ہی اچھا ہے
بزدل ہونا ہی احسن ہے
بے غیرت زندہ رہتے ہیں
اور منہ پر گولی کھا کر عبرت بن جاتے ہیں
تیرے دشمن نے یہ سچی بات کہی ہے
یا پھر اس سے نکل گئی ہے
اسی لئے شاید وہ اس کو واپس لے لے
اور سچ بولنے پر شائد معافی بھی مانگے
ہم اس کو معافی دیدیں گے
پھر بھی اصلی بات یہی ہے
سچ کو سوچ سمجھ کر بولنا پڑتا ہے
فائدے اور نقصان کو تولنا پڑتا ہے
طاقتور کی عزت کرنا پڑتی ہے
زبردست کے آگے جھکنا ہوتا ہے
لوگوں کو اب چاہیے اس سے عبرت پکڑیں
جان اگر پیاری ہے بالکل سچ ناں بولیں
سچ بیکار ہے
سچ خطرہ ہے
سچ جھوٹا ہے---

شاہنواز زیدی

پتنگ

حقیر سا پتنگ ہوں   بس ایک پیچ و تاب ہے
مزاج کا ملنگ ہوں   بس ایک اضطراب ہے

فضاؤں میں مرا گزر   کہ اس نظامِ کار میں
کبھی اِدھر کبھی ادھر   حیات کے مدار میں

ہوں بادلوں کا ہم سفر   یہ میری اپنی ڈور بھی
مری نظر میں سر بہ سر   نہ میرے ہاتھ میں رہی

یہ بستیوں کا جال بھی
یہ پستیوں کا حال بھی

بکھیرتا ہوں راحتیں
محبتیں ، رفاقتیں

یہی خوشی کا راز ہے
نہ حرص ہے نہ آز ہے

ہوں مطمئن سرشت سے
ملی ہوئی بہشت سے

منظور ثاقب

یوم آزادی

پیارے پاکستان پر سب کچھ لٹانا چاہیے
یومِ آزادی کبھی یوں بھی منانا چاہیے

جس خدا نے ایٹمی قوت عطا کی ہے ہمیں
بس اُسی کی بارگہ میں سر جھکانا چاہیے

یہ وطن قائم ہوا ہے مصطفیٰؐ کے نام پر
مصطفیٰؐ کا دین اس میں پھیل جانا چاہیے

یہ بھی پاکستان کی خدمت کا ایک انداز ہے
اپنا اپنا فرض محنت سے نبھانا چاہیے

قول سے تو دعویٰ حُبِّ وطن کرتے ہیں ہم
فعل میں بھی عکس کچھ اس کا در آنا چاہیے

وار دینی چاہیے ہر شے وطن کے نام پر
بعد اس کے نعرۂ ملت لگانا چاہیے

ہو چکیں باتیں بہت اب تو عمل کا وقت ہے
بہرِ ارضِ پاک کچھ کر کے دکھانا چاہیے

توڑ کر فیضان خود غرضی کے سب لات و منات
بعد میں قومی ترانہ گنگنانا چاہیے

فیض رسول فیضان

وطن کی خاک ہی سے معتبر ہے

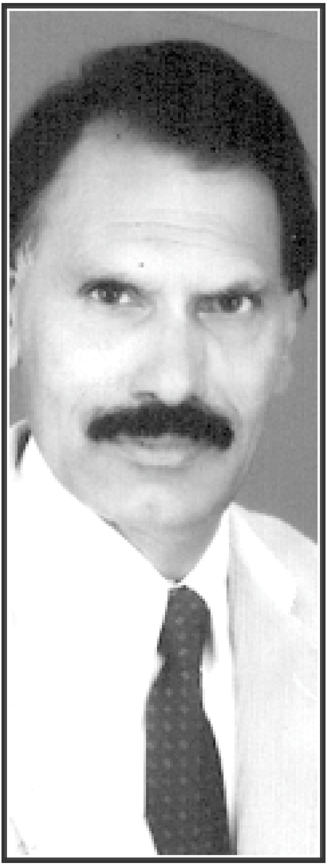

احمد جلیل

وطن کی خاک ہی سے معتبر ہے
تو اس پوشاک ہی سے معتبر ہے

تری پہچان ہے یہ پاک مٹی
تو اس ادراک ہی سے معتبر ہے

وطن میرا وفاؤں، چاہتوں کی
حسیں املاک ہی سے معتبر ہے

ہمیشہ رہنا اس چاہت بھنور میں
تو اس پیچاک ہی سے معتبر ہے

یہ ارضِ پاک ہی تیرا حوالہ
تو ارضِ پاک ہی سے معتبر ہے

مجھ سے طلوعِ صبح کے منظر چھپا گئی
ٹھنڈی ہوا چلی تو مجھے نیند آ گئی

انتخاب
- خالد احمد -
نعمان منظور

سرخ گلاب بھلے لگتے تھے

اس کے گھر میں کوئی روشن دان نہیں تھا
سورج قطرہ قطرہ بہہ کر اندر آتا
چار رُتوں میں موسم ایک ہی رہتا
کوئی پھول نہیں کھلتا تھا
اندھے خوابوں کی چوکھٹ پر
''سرخ گلاب بھلے لگتے تھے''
اس لڑکی کو
جس کے گھر میں موسم
کبھی نہیں بدلا تھا
خوابوں کی زنجیر گلے میں باندھے
اپنے زنداں کی اونچی دیوار سے کود گئی تھی
سورج دروازے سے اس کو دیکھ رہا تھا
اس کے گھر میں
کوئی روشندان نہیں تھا
سرُخ گلاب بھلے لگتے تھے اس لڑکی کو!

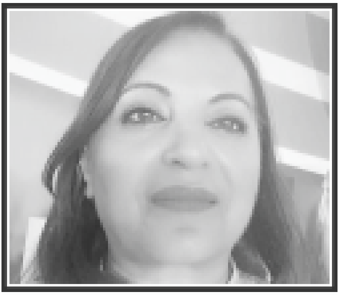

رخشندہ نوید

انجم ہاتھ نہ آئے

رہے شب بھر میرے ہمراہ
انجم ہاتھ نہ آئے
سفر میں ساتھ ہو لیکن
وہ گھر تک ساتھ نہ آئے
جلے ہر قمقمہ ہر شب
محبت میں چراغاں ہو
دہکتے گُل کھلیں ہر سُو
فلک مہکا ہو، تاباں ہو
مناظر خاک پر اُتریں
نگاہیں سرخرو ہوں
اور ستارے شام کو نکھریں
مگر جس کی سحر اپنی ہو
ایسی رات نہ آئے
رہے شب بھر میرے ہمراہ
انجم ہاتھ نہ آئے
سفر میں ساتھ ہو لیکن
وہ گھر تک ساتھ نہ آئے

Son-in - law

سنو

کیا آپ نے اپنا جگر ڈونیٹ کیا ہے؟

یا اپنی آنکھیں عطیہ کی ہیں؟

یا نصیبِ قلب؟

مرنے کے بعد نہیں (خدانخواستہ)

جیتے جی۔ --

ارے نہیں یہ ناممکن نہیں ہے

میں نے دیا ہے

اور جیتے جی دیا ہے

اپنا لختِ جگر

نورِ چشم

دل کا ٹکڑا

دردانہ نوشین خان

راستے بھر کیا یونہی ہم کو پکارے جائیں گے
ساتھ دریا کے کہاں تک یہ کنارے جائیں گے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دھرتی ماں

دھرتی ماں ہم تیرے بیٹے
سروں پہ اپنے کفن لپیٹے
ہر مشکل سر کر سکتے ہیں
دنیا بھر کی سب خوشیوں سے
تیرا دامن بھر سکتے ہیں
سورج چاند ستارے لا کر
ان قدموں میں دھر سکتے ہیں
تیری خاطر جی سکتے ہیں
تیری خاطر مر سکتے ہیں
پتھریلے سنگلاخ دلوں میں
امن کے پھول کھلا سکتے ہیں
جھرنوں کی مترنم لے پر
پیار کے گیت سنا سکتے ہیں
تند و تیز ہواؤں میں ہم
خون سے دیپ جلا سکتے ہیں
ہم تیرے شہدا کے وارث

ہم تیرے جانباز مجاہد
ہم تیرے پرعزم سپاہی
دریاؤں کی گود کے پالے
تیری عظمت کے رکھوالے
ہم اجلی صبحوں کے سورج
ہم راتوں کے نور اجالے
شبنم کے رخساروں جیسے
روشن چاند ستاروں جیسے
چاروں اور بہاروں جیسے
دھرتی کی پہچان بھی ہیں ہم
محنت کش دہقان بھی ہیں ہم
بستے نخلستان بھی ہیں ہم
جینے کا سامان بھی ہیں ہم
اک اٹھتا طوفان بھی ہیں ہم
اس پنجاب کی شان بھی ہیں ہم
سندھ بلوچستان بھی ہیں ہم

کے پی کے کی جان بھی ہیں ہم
گلگت بلتستان بھی ہیں ہم
اس مٹی کی آن بھی ہیں ہم
تیرا پاکستان بھی ہیں ہم
میرا پاکستان بھی ہیں ہم
تیری کھلی فضاؤں پر ہم
تیری دھوپ اور چھاؤں پر ہم
ہرگز آنچ نہ آنے دیں گے
تیرے بر اور بحر کی خاطر
ہر گاؤں ہر شہر کی خاطر
تیرے چاروں پہر کی خاطر
ہر دریا ہر نہر کی خاطر
ہم قربانی دے سکتے ہیں
ظلم کے آگے جبر کے آگے
جھک نہیں سکتے کٹ سکتے ہیں
طاقتور دشمن کے آگے
سینہ تان کے ڈٹ سکتے ہیں

دھرتی ماں ہم تیرے بیٹے
تیری گود میں پلنے والے
اس مٹی پر چلنے والے
تیری خاطر تیری خاطر
اس مٹی میں مل سکتے ہیں
پھر شاخوں پر کھل سکتے ہیں

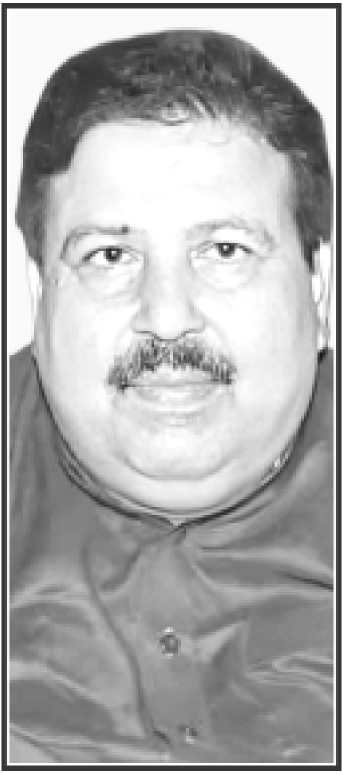

مسعود احمد

تمھارے لیے

میرے حصے کی سانسیں تمھارے لیے
میری ہر اک خوشی کا
تمھی راز ہو
تمھی سے ہیں کائنات کے
سبھی رنگ و بُو
میرے نغمات کی ہو
گنگناہٹ تمھیں
تمھی برکھا ہو
تمھی ہو بہاروں کے موسم
اس لیے تم کو شاید
میں پا نہ سکا
میں مسافر تھا
صحراؤں کا

سید طاہر شیرازی

تمھی میرے مسیحا ہو

میری آنکھوں کے ساگر میں
ترا جیون ہی بستا ہے
مجھے محسوس ہوتا ہے
ہے، ساتھی ہمسفر میرا
میرے بے چین لمحوں میں
مرا دکھ بانٹ لیتا ہے
یوں صدیوں کے کٹھن رستے
بڑے آسان لگتے ہیں
مرے جیون کا یوں طاہر
ابھی باقی تسلسل ہے
مری سانسوں کا یہ بندھن
جڑا ہے تیری چاہت سے
بھلا پاؤں گا میں کیسے
میں کیسے سوچ سکتا ہوں
تمھی میرے مسیحا ہو
تمھی میرے مسیحا ہو

گُلِ زعفراں

حیرت
محض لفظ ہے
گہرائی ناپنے کے لیے
اُونچائی جاننے کے لیے
نجانے کتنے
زمانوں کا سفر
تمھیں کرنا ہوگا

تمھیں رُکنا ہے
عشق نگر کے اُس مشرقی حصے پر
جہاں کبھی
دل کی سرزمین پر کوئی چلتا تھا
شاید
دریا تھا
کوئی سمندر
جو مجھ میں بہتا تھا

بالکل
اُسی جگہ پر
ایک دریا بہتا تھا
اب میرے آنسو رواں دواں ہیں
وہ گُلِ زعفراں
سات سمندر پار

جانے والا کون تھا
جس کے ہجر کا ذائقہ
نمکین
اتنا کڑوا کیوں ہے؟

شاید
محبت کی واپسی کا خیال
خواب کے کفن سے لپٹ کر
ویرانے کے خالی گھونسلے میں
ابدی نیند سو جائے

شاید
کبھی خواب کے تنکوں سے
تعبیر کا گھونسلہ آباد
محبت کی یادگار ممکن ہو

امجد بابر

''آسان راستوں کا مشکل سفر''

آسان راستوں کا مشکل سفر
میری مشکل پسند طبیعت کو بھانے لگا ہے
محبت شرطوں پر نہیں کی جا سکتی
ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی
احساس خریدا نہیں جا سکتا
دل گر مائل بہ کرم نہ ہو تو
کسی کا دکھ نظر نہیں آتا
ہم نے ادھوری زندگی گزاری ہے
رنگوں اور خوشبوؤں سے پرے
ذہنی تفاوت سے بڑی خلیج کوئی نہیں
فاصلہ کم کرنا اختیار میں نہیں ہوتا
عداوت کے درخت پر لگا پھل کڑوا ہوتا ہے
لہجوں میں گھلے زہر نے
بدگمانیوں کا جو
بیج بویا تھا اس پر لگنے والا پھل زہریلا ہے
سرکنڈوں پر گلاب نہیں کھلتے
دیوار اگر دل میں آ جائے تو
رستے علیحدہ کرنے میں
دیر نہیں لگتی
بیمار رشتے دیر تک نبھائے نہیں جا سکتے
صحت مند سوچ کے حامل لوگ
بیمار ذہنوں کی دل آزاری کا
سبب بن جایا کرتے ہیں
وہ کیا جانیں
دنیا کیسی دکھتی ہے

نائلہ راٹھور

----------انتخاب----------

- خالد احمد -

غم فراہم ہیں مگر ان کی فراوانی نہیں
اے گراں جانی، یہاں کوئی بھی آسانی نہیں

------ نعمان منظور ------

نظم

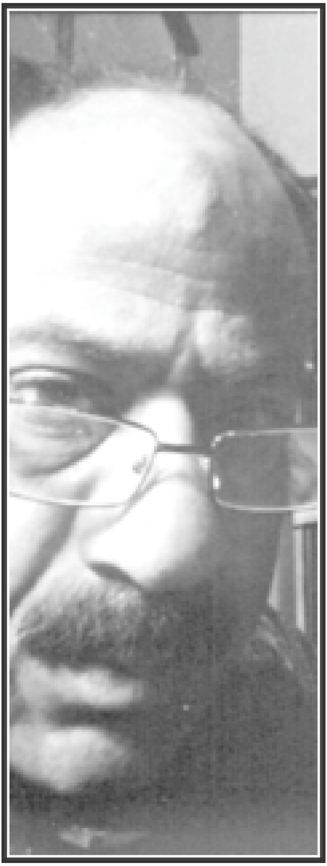

نبیل قیصر

کاش کچھ اہتمام ہو جاتا
مجھ سے وہ ہمکلام ہو جاتا
نیکیوں پر بہار آ جاتی
نفس گر زیرِ دام ہو جاتا
میں تو آنکھیں بچھائے بیٹھا تھا
وہ بھی محوِ خرام ہو جاتا
تھوڑا سا التفات گر کرتا
میں اُسی کا غلام ہو جاتا
گر وہ دعوت قبول کر لیتے
اس کا پھر شہرہ عام ہو جاتا
اس کی نیت نہیں تھی صاف نبیل
ورنہ میرا بھی کام ہو جاتا

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کورِ نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا، تجھ پہ کُھلا، یا نہ کُھلا میں

آج ہم ہیں پہ کل نہیں ہوں گے

[لیونگ لیجنڈز کے نام]

آج ہم ہیں پہ کل نہیں ہوں گے آج ہم ہیں پہ کل نہیں ہوں گے
کل نہ ہو کر بھی ہم یہیں ہوں گے کل نہ ہو کر بھی ہم یہیں ہوں گے
آپ کے دل میں مدعا بن کے دو کناروں میں ، بہتے پانی میں
آپ کے کان میں صدا بن کے کہیں بچپن ، کہیں جوانی میں
آپ کے ہونٹ پہ دعا بن کے کسی کردار میں ، کہانی میں
آپ کی آنکھ میں حیا بن کے زیست کے ادھ کھلے معانی میں
آپ کے ہاتھ میں عصا بن کے کسی گم نام سی نشانی میں
جذب و احساس میں وفا بن کے خامشی کی مدھر روانی میں

آج ہم ہیں پہ کل نہیں ہوں گے آج ہم ہیں پہ کل نہیں ہوں گے
کل نہ ہو کر بھی ہم یہیں ہوں گے کل نہ ہو کر بھی ہم یہیں ہوں گے
آپ کی جستجو کے بیچ کہیں کہیں تاریخ میں، حوالے میں
آپ کی گفتگو کے بیچ کہیں ملگجے میں ، کہیں اجالے میں
حسن کی آرزو کے بیچ کہیں چاند کے دل نشین ہالے میں
عشق کی آبرو کے بیچ کہیں یاد سے پر کسی نوالے میں
ہجر کی ہاو ہو کے بیچ کہیں قہقہوں کے حسیں دوشالے میں
اور اسی رنگ و بو کے بیچ کہیں اجنبی سے کسی سنبھالے میں

شبیر نازش

آج ہم ہیں پہ کل نہیں ہوں گے
کل نہ ہو کر بھی ہم یہیں ہوں گے

بلدے دیوے دی لاٹ وچ کِدھرے
درداں مارے اڑاٹ وچ کِدھرے
دل چوں اٹھدی تراٹ وچ کِدھرے
کلبے کارے پلاٹ وچ کِدھرے
پانی منگدے گھراٹ وچ کِدھرے
کِسے پاندھی دی واٹ وچ کِدھرے

آج ہم ہیں پہ کل نہیں ہوں گے
کل نہ ہو کر بھی ہم یہیں ہوں گے

ہاں سڑیندے ملال ویلے اچ
روہی مثال بیلے اچ
بن حیاتی زوال میلے اچ
چندر بن وے ہلال ڈیلے اچ
گھر لڑھیندے چھنال ریلے اچ
بھکھ مریندے وبال تیلے اچ

سفید کاغذ

تمھاری خاموشی پہ نظم لکھنے سے پہلے......

میری عینک میز پہ اداس پڑی ہے

سارے کاغذ کورے پڑے ہیں

قلم بے جان ہے

کافی کے مگ کا خلا بڑھ رہا ہے

میرے کان میں دھیرے سے کچھ تو بولو

دیپک راگ ہی سناؤ

تا کہ میرے کورے کاغذوں اور میری اُداس نظموں میں

کوئی رنگ تو آئے......

میرے نیم جاں قلم میں جان تو آئے

بشریٰ شیریں

انتخاب

خالد احمد

کتنی مشکل سے کوئی لفظ گہر ہوتا ہے
کتنے سینے صدف آہ و بکا رہتے ہیں

نعمان منظور

غم

رات کے پچھلے پہر
دھواں ہے کمرے میں
سوچتا بجھادوں سگریٹ
ہلکی سلگتی ہوئی چنگاری
بار بار دھواں اڑا رہی ہے
اور تازہ دم ہوئی جاتی ہے
مگر تیرا غم ہے کہ کم ہونے کا
نام نہیں لیتا
دل دھڑکتا ہے
ہاتھ کی تھپکی سے بہلانا
اب اسے راس نہیں آتا
اک ڈر ہے، خوف ہے، وحشت ہے
تمنائے زندگی ادھوری ہے،
ان چھوئے جسم کی مانند
تھرتھر کانپتی، ناچتی، گنگناتی
موج در موج پہلو بدلتی
یہی میری کیفیت غم
یہی میرا حال دل ہے
نہ بیاں کرسکوں، نہ سہہ سکوں
لب پہ سکوت چھایا ہے اور
یہ سکوت چلتی ہوئی
آخری سانس سے بھی آزاد
کردے گا مجھے

شبیر آکاش

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

دل دھڑکا ، دل دہلا ، زہر پیا البتہ
پہلا اور روپہلا ، پیار کیا البتہ

صنعتوں کے نام

کیسا یہ اہتمام ، کر ڈالا
سب کا جینا حرام کر ڈالا

کارخانوں کا دور ، کیا آیا
شور ہی شور عام ، کر ڈالا

سانس لینا بھی ہو گیا مشکل
ہم نے کیسا یہ کام ، کر ڈالا

آبی مخلوق تک کا جینا بھی
صنعتوں نے حرام ، کر ڈالا

آدمی نے یہ اپنے ہاتھوں سے
کیسا یہ انتظام ، کر ڈالا

زہر آلود ہے ، فضا ساری
کس نے قصہ تمام ، کر ڈالا

مچھلیوں تک کا جینا بھی عاصم
صنعتوں نے حرام ، کر ڈالا

عاصم بخاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پھر وہی مہرباں ہوا آئی
اے مری بے چراغ تنہائی

رنگین خوابوں کی راکھ

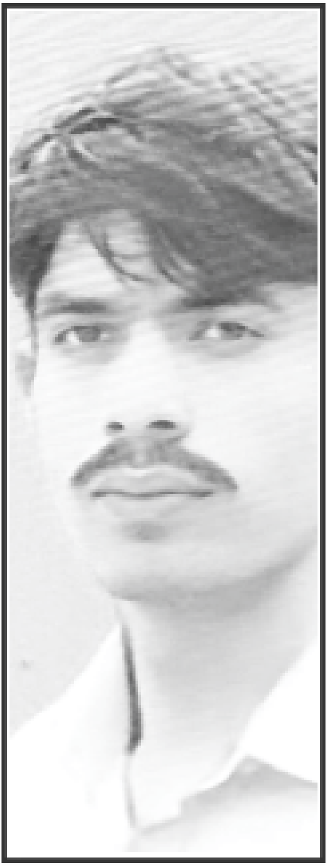

تصدق تو پاگل نہیں ہے

تری آنکھ میں کوئی کاجل نہیں ہے

نہ جانے یہ کیسی تپش ہے

عجب سی خلش ہے

کہ آنکھوں سے کچھ نقش کھینچے گئے ہیں

سبھی چہرے دھندلا گئے ہیں

یہ کاجل جو ڈالا ہوا ہے

یہ پیلا بھی ہے اور نیلا بھی ہے

کہیں پر کوئی سرخ دھبہ بھی ہے

حقیقت میں کاجل نہیں ہے

یہ رنگین خوابوں کی ہے راکھ یارو!

جو آنکھوں میں ڈالی ہوئی ہے

تصدق فرید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دردکی سنسنی نہ تھی، رُوح کے برف زار میں

آگ ابھی لگی نہ تھی، رنگ بھرے چنار میں

واپسی یقینی ہے

واپسی یقینی ہے
گھوم پھر کے دیکھا ہے
تین ہی عناصر ہیں
آگ اپنی لالچ کی
پانی اپنی حسرت کا
اور ہوا ہے مستی کی
اس کے بعد طاقت ہے
چاہے وہ ہو دولت کی
چاہے وہ ہو عہدے کی
چاہے ہو تعلق کی
شہر ہو یا جنگل ہو
پستیوں کے باسی ہوں
یا کہ کہساری ہوں
میلے ٹھیلے بھگتا کر
جیت کی رقم پا کر
ہر طرف اڑے پھرنا
بس یہ اک تماشا ہے
اور اس تماشے سے
واپسی یقینی ہے

اعجاز رضوی

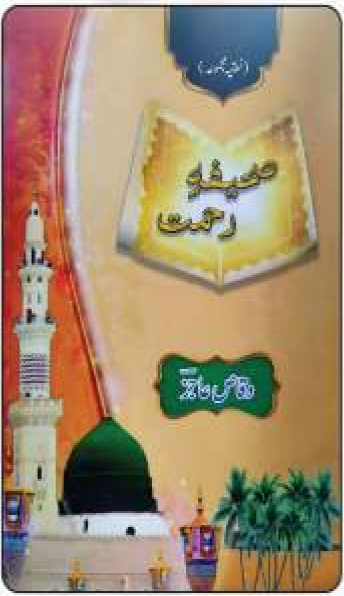
صحیفۂ رحمت

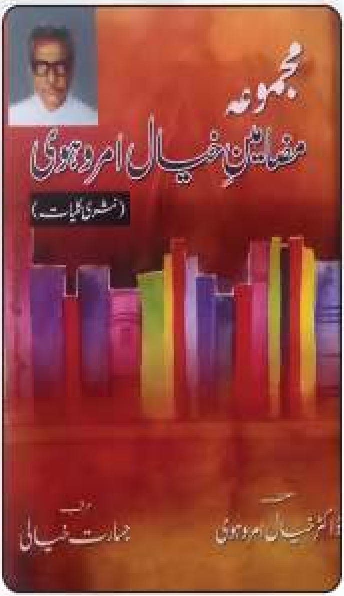
مجموعہ
مضامین خیال امروہوی
(نثری کلیات)
ڈاکٹر خیال امروہوی
جسارت خیالی

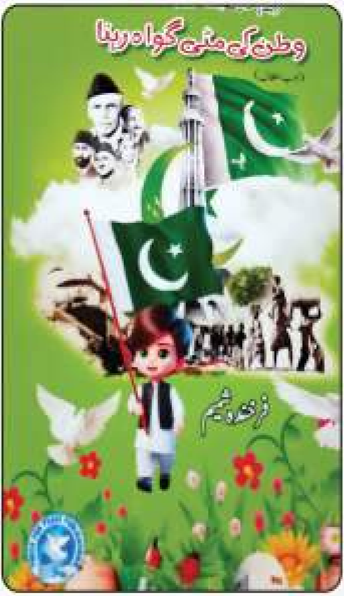
وطن کی مٹی گواہ رہنا
فرخندہ شمیم

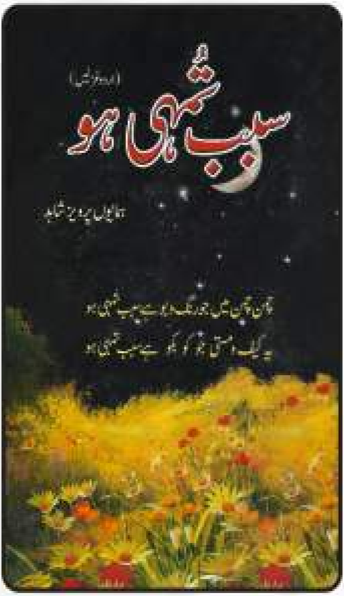
سبب تمہی ہو

معرف فیکشن نگار محترمہ عائشہ احمد جاوید کی بیاض آمد پر

محترم جناب احمد ندیم قاسمی کی 94ویں سالگرہ پر ایک یادگار گروپ فوٹو

جناب اعجاز کنور راجہ، جناب نجیب احمد، جناب عطاالحق قاسمی، محترمہ ڈاکٹر ناہید قاسمی، جناب شہزاد احمد

جناب خالد احمد، جناب ایم آر شاہد، جناب اسلام عظمی، جناب نیر حیات قاسمی، جناب شفیق سلیمی اور دیگر